پاکستان کی جنگ

پختونخوا میں دہشت گردی سے مقابلے کے لئے حکمت عملی پر پالیسی مضامین

ترجمہ: تنویر اقبال۔ محمد اختر

مشعل

پاکستان کی جنگ

دہشت گردی سے مقابلے کے لیے حکمت عملی پر پالیسی مضامین

ترجمہ: محمد اختر۔ تنویر اقبال

مشعل

آر۔بی 5، سیکنڈ فلور، عوامی کمپلیکس

عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور 54600، پاکستان

MashalBooks.org

پاکستان کی جنگ

ترجمہ: محمد اختر، تنویر اقبال

کاپی رائٹ اردو (c) 2011 مشعل بکس

ناشر: مشعل بکس
آر-بی-5، سیکنڈ فلور
عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور-54600، پاکستان
فون و فیکس 042-35866859
E-mail: mashbks@brain.net.pk
http://www.mashalbooks.org

Mashalbooks.org

ترتیب

1	بغاوت کا سیاسی پس منظر	5
2	پاکستان میں سیاسی جماعتیں	7
3	شمالی مغربی سرحدی صوبے میں سیاست	9
4	ضمیمہ (صوبہ پختونخواہ کے چوبیس اضلاع میں نسلی، قبائلی اور سیاسی گروہ	19
5	کرم ایجنسی میں محاذ آرائی اور تصادم	25
6	کرم میں بیرونی طالبان گروہوں کا کردار	27
7	شمالی وزیرستان میں محاذ آرائی اور عسکریت پسندی	36
8	باجوڑ میں عسکریت پسندی اور تصادم	61
9	خیبر میں عسکریت پسندی اور تصادم	76
10	خیبر ایجنسی میں عسکریت پسند گروہیں	80
11	مہمند میں شدت پسندی اور تصادم	88
12	جنوبی وزیرستان میں شدت پسندی اور تصادم	98
13	وزیرستان میں چھوٹے چھوٹے محسود جنگجو گروہیں	112
14	ملانذیر مخالف وزیر گروہیں	114
15	وزیرستان میں بھٹانی گروہیں	115
16	جنوبی وزیرستان میں فوجی آپریشنز اور امن معاہدوں کی مختصر تاریخ (2004-08ء)	118
17	وادی سوات میں شدت پسندی اور تصادم	126
18	عسکریت اور اورکزئی کا تنازعہ	144
19	طالبان کے مالی وسائل	205

MashalBooks.org

بغاوت کا سیاسی پیش منظر

حسن عباس۔ اپریل 2010ء

فروری 2008 کے صوبائی انتخابات میں کامیابی کے بعد ترقی پسند قوتوں کے پاکستانی شمال مغربی صوبے پر کنٹرول کے باوجود، ابھی تک وہاں استحکام ایک خواب ہی ہے اور امن و امان کی صورت حال بتدریج بگڑتی ہی گئی ہے جس سے صوبے میں سیاست اور عسکریت پسندی کی نوعیت اور وسعت کے مابین Correlation کے بارے میں مختلف سوالات جنم لے رہے ہیں۔ زیر نظر مضمون حالیہ برسوں میں صوبائی صورت حال کو متاثر کرنے والے مختلف سیاسی اور مذہبی عناصر کی سرگرمیوں کا احاطہ کرتا ہے۔

صوبہ سرحد میں دہشت گرد حملوں کی تعداد میں ایک دم بہت اضافہ ہو گیا ہے۔ 2009ء میں پولیس، سکیورٹی فورسز، سیاسی افراد، مارکیٹوں اور سماجی تقریبات کو 49 خودکش حملوں کے ذریعے نشانہ بنایا گیا۔ صوبائی دارالحکومت پشاور بہت سے حملوں کا نشانہ رہا۔ یہ حملے عوامی نیشنل پارٹی اور پیپلز پارٹی کی مخلوط حکومت کے لیے انتہائی سنجیدہ چیلنج ہے۔ فاٹا سے آنے والے عسکریت پسندوں اور جنوبی پنجاب (جہاں فرقہ پرست اور کشمیر کے متعلق گروپ بھرتی کیے جاتے ہیں) کے جنگ جوؤں کی سرحد کے مختلف راستوں سے فاٹا میں نقل و حرکت نے صوبہ سرحد کو عسکری طور پر بے حد غیر محفوظ بنا دیا ہے۔

صوبہ سرحد کی سماجی اور سیاسی ڈائنامکس کا بھی، دائمی شورش زدہ قبائلی علاقوں میں پر امن ماحول کے ساتھ انتہائی پیچیدہ سا تعلق ہے فاٹا (جسے پاکستان میں عموماً علاقہ غیر کہا جاتا ہے) میں عسکریت پسندی نے ساتھ ہی واقع صوبہ سرحد میں امن و امان کی صورت حال پر عموماً اور 1980ء کے عشرے کے بعد خصوصاً منفی اثرات ڈالے ہیں۔ اسی طرح صوبہ سرحد میں ہونے والے سیاسی واقعات فاٹا کی سیاسی تحریکات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ دونوں علاقوں میں واضح مختلف سیاسی اور انتظامی ڈھانچوں کے باوجود وہی سیاسی جماعتیں دونوں طرف کام کرتی ہیں۔ 9-2007ء کے درمیان عسکریت پسندی کے جارحانہ ابھار پر پاکستان کے حفاظتی اداروں کا ردعمل کوئی خاص تیز

MashalBooks.org

نہیں تھا، دہشت گردی کے خلاف موثر پالیسی تشکیل دینے میں حکومتی ناکامی میں سیاسی عدم استحکام کا بڑا ہاتھ تھا۔ ادھر فروری 2008ء میں منتخب ہونے والا، سیاسی جماعتوں کا اتحاد بری طرح سوات کے بحران میں الجھ کر رہ گیا، جہاں عسکریت پسندوں نے سوات (کے بڑے مراکز) اور اس کے اردگرد کے علاقوں کو فتح کرنے کے لیے سیاسی حربوں اور تشدد کا بھرپور استعمال کیا۔ 2009ء کے موثر فوجی ایکشن نے بہرحال علاقے میں حکومتی کنٹرول قائم کر دیا لیکن مالاکنڈ ڈویژن میں حالات معمول پر آنے میں ابھی کچھ وقت لگے گا۔ یاد رہے، سوات، مالاکنڈ، چترال، دیر کے اضلاع ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔

صوبہ سرحد کی یہ بحرانی کیفیت راتوں رات پیدا نہیں ہوئی۔ سالوں پر محیط خراب حکمرانی، علاقائی تناؤ اور معاشی بدحالی نے حالات کو خراب سے خراب تر کر دیا۔ مزید براں ہمسایہ ملک افغانستان میں طالبان حکومت کے خاتمے کے بعد عسکریت پسندوں کی بڑھتی ہوئی طاقت نے بھی معاملات کے بگاڑ میں اپنا حصہ ڈالا۔ افغانستان میں غیر ملکی افواج کی طویل موجودگی اور علاقے میں بغاوت کو کچلنے کے لیے عسکری قوت پر زیادہ سے زیادہ انحصار نے بھی صوبہ سرحد کے باسیوں پر منفی اثرات ڈالے۔

سیاسی ڈھانچہ:

پاکستان ایک وفاق ہے اور اس کی دو ایوانی مقننہ ہے، قومی اسمبلی میں اکثریتی پارٹی یا مخلوط اتحاد وزیراعظم کا انتخاب کرتا ہے جبکہ صدر کے حلقہ انتخاب میں چاروں صوبائی اسمبلیاں اور پارلیمنٹ شامل ہیں۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ پاکستان کے چار صوبوں میں سے ایک ہے۔ لیکن بعض علاقے جن میں فاٹا (وفاق کے زیر انتظام علاقے) سرحد کے سرحدی علاقے، گلگت بلتستان (انھیں پہلے شمالی علاقہ جات کہا جاتا تھا) اور پاکستان کے زیر انتظام کشمیر شامل ہیں، خصوصی قوانین کے تحت ان کا انتظام چلایا جاتا ہے۔ ایک شاندار ریاستی ڈھانچے اور جمہوری سیٹ اپ کے باوجود پاکستانی فوج کا اس پر غیر معمولی اثر و رسوخ بھی ہے۔ 32 سال پر محیط مارشل لا کے چار ادوار نے قومی سلامتی اور خارجہ پالیسی کے معاملات میں فوج کا عمل دخل بڑھا دیا ہے۔ مزید براں، پاکستانی آئین (فوجی حکومتوں کے دوران کی گئی ترامیم کے مطابق) نے عمومی قانونی پراسس کو معطل کر کے مختلف اختیارات صدر کو دے رکھے تھے اور یہی نہیں بلکہ وہ تو بغیر کسی وجہ کے حکومتوں کو بھی ڈس مس کر سکتا تھا۔ حال ہی میں ان آئینی دفعات کو اٹھارویں ترمیم کے ایک اصلاحاتی پیکج کے ذریعے ختم کر دیا گیا ہے اور اس طرح وزیراعظم کی سفارش کے بغیر پارلیمنٹ کو تحلیل کرنے، یک طرفہ

ایمرجنسی کے نفاذ، ججوں کی تعیناتی اور خاص طور سے افواج پاکستان کے سربراہوں کی تعیناتی کے اختیارات صدر کے پاس نہیں رہے۔

پاکستان میں سیاسی جماعتیں

پاکستان مسلم لیگ نواز:

پی ایم ایل (ن) دراصل جنرل ضیاء الحق کے فوجی دور (1977-88ء) کی پیداوار ہے۔ حقیقی مسلم لیگ جس نے قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت میں قومی تحریک آزادی میں اہم کردار ادا کیا تھا، 1950ء کے عشرے میں ہی شکست وریخت کا شکار ہو گئی تھی۔ اس کے بعد تقریباً ہر فوجی آمر نے اس جماعت میں روح پھونکنے کی کوشش کی تا کہ سیاسی تیموں اور فوجی حکمرانی کے حامیوں کو ایک جھنڈے تلے اکٹھا کیا جائے اور اس طرح اپنے لیے سیاسی اور قانونی جواز مہیا کر سکے۔ ضیاء کی مسلم لیگ 1985ء میں پیدا ہوئی اور 1988ء میں دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ان دو گروہوں میں سے ایک 1993ء میں نواز شریف کی قیادت میں پی ایم ایل (ن) کے نام سے ابھری۔

1990ء کے عشرے کی ابتداء اور 1997-99ء کے دوران مسلم لیگ نواز نے عوامی نیشنل پارٹی کی حمایت اور شراکت سے مخلوط حکومتیں تشکیل دیں۔ اکتوبر 1999ء میں جنرل مشرف کے مارشل لاء نے نواز شریف حکومت کو برطرف کر دیا۔ 2001ء میں مسلم لیگ نواز ایک بار پھر دو حصوں میں تقسیم ہو گئی جب چودھری شجاعت نے علیحدہ ہو کر مسلم لیگ (ق) بنانے اور مشرف کی حمایت کا فیصلہ کیا۔

متحدہ مجلس عمل:

ایم ایم اے کی تشکیل 2001ء میں ہوئی اور اس میں درج ذیل پانچ مذہبی سیاسی جماعتیں شامل تھیں: دیوبندی نقطہ نظر کی حامل جمعیت علمائے اسلام (JUI) بریلوی عقیدے کی حامل جمعیت علمائے پاکستان، روایتی اسلام پسند جماعت اسلامی (اس کی بنیاد ابوالاعلیٰ مودودی نے رکھی تھی) شیعہ فرقے کی تحریک جعفریہ اور وہابیوں سے متاثر جمعیت اہل حدیث۔

جمعیت علمائے اسلام کی بنیاد 1945ء میں مولانا شبیر احمد عثمانی نے رکھی تھی۔ مفتی محمود نے 1970ء میں اس کا احیاء کیا۔ 1980ء کے ابتدائی سالوں میں ان کے صاحبزادے مولانا فضل الرحمان نے اس کی قیادت سنبھالی۔ 1980ء کے عشرے کے درمیان جمعیت (سیاسی اختلافات

کے باعث) دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ فضل الرحمٰن کی قیادت میں جے یو آئی (الیف) اور مولانا سمیع الحق کی قیادت میں جے یو آئی (ایس)۔

1980ء کے عشرے میں افغان جہاد کے دوران جے یو آئی نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ جمعیت علمائے اسلام کے دونوں گروپس سے متعلقہ سکولوں اور مدارس کے پڑھے ہوئے لوگوں نے طالبات میں شمولیت اختیار کر لی۔ احمد رشید کے مطابق کابل حکومت میں کم از کم آٹھ طالبان وزراء سمیع الحق کے دارالعلوم حقانی کے گریجویٹ تھے۔ 2002ء میں جمعیت کے دونوں گروپس ایم ایم اے میں شامل ہو گئے۔ جمعیت علمائے اسلام کے منشور کے مطابق وہ پاکستان میں ایک اسلامی ریاست کے قیام کی پابند ہے۔

عوامی نیشنل پارٹی:

یہ جماعت قوم پرست اور سیکولر نظریات کی حامل ہے۔ اور اس کا تعلق معروف سرخ پوش رہنما عبدالغفار خان سے ہے جنہیں مہاتما گاندھی سے قریبی ذاتی اور سیاسی روابط کی بنا پر سرحدی گاندھی بھی کہا جاتا ہے۔ 1957-75ء کے دوران غفار خان کے بیٹے ولی خان اس کے سربراہ رہے۔ 1975ء میں بھٹو حکومت نے متنازعہ (SEDITION) الزامات کے تحت اسے غیر قانونی قرار دے دیا۔ تاہم 1986ء میں نام کی معمولی سی تبدیلی کے ساتھ جماعت کام کرتی رہی۔ اس وقت ولی خان کے بیٹے اسفندیار ولی پارٹی کے رہنما ہیں۔ نیپ کو سابقہ مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) میں بھی سیاسی حمایت حاصل تھی۔ 1960-70ء کے عشروں میں اسے سوویت یونین کی حامی سمجھا جاتا تھا۔ نیپ سالہا سال تک بائیں بازو کے نظریات کی حامل رہی۔ اسے اے این پی کی نسبت دوسرے صوبوں میں وسیع تر سیاسی حمایت حاصل تھی۔ 1980-90ء کے دوران اے این پی (صوبائی اور وفاقی سطح پر) مختلف حکومتوں کا حصہ رہی تاہم 2008ء تک وہ صوبہ سرحد میں اپنا وزیر اعلیٰ نہیں لا سکی تھی۔ پہلی دفعہ 2008ء کے الیکشن میں اس نے سندھ اسمبلی میں کراچی کے کئی علقوں سے (جہاں خاصی پختون آبادی ہے) بھی کئی نشستیں حاصل کیں۔

پاکستان پیپلز پارٹی:

یہ پارٹی بھی ایک ترقی پسند جماعت ہے اور اسے ملک کے گوشے گوشے میں سیاسی حمایت حاصل ہے۔ 1967ء میں ذوالفقار علی بھٹو نے دانش وروں اور سوشلسٹ ذہن رکھنے والے سرگرم لوگوں کے ایک گروپ کے ہمراہ یہ جماعت بنائی تھی۔ مختلف اوقات میں اس کی حکومت رہی۔ 1971ء میں بھٹو پاکستان کے صدر بن گئے۔ بعد ازاں نئے آئین کے نفاذ کے

بعد وہ 77-1973ء کے دوران ملک کے وزیراعظم رہے۔ جولائی 1977ء میں جنرل ضیا نے ان کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور ایک متنازعہ عدالتی فیصلے کے تحت انھیں پھانسی دے دی۔ پارٹی بدستور مقبول جماعت رہی اور بھٹو کی بیٹی، بے نظیر بھٹو 90-1988ء اور 96-1993ء کے دوران ملک کی وزیراعظم رہیں۔ اسی دوران پی پی پی صوبہ سرحد کی مخلوط حکومتوں میں بھی اہم پارٹنر رہی۔ مارچ 2008ء میں پیپلز پارٹی نے (اے این پی کی مدد سے) نہ صرف مرکز میں حکومت بنائی بلکہ سرحد میں بھی اے این پی کی مخلوط حکومت میں شریک ہو گئی۔

شمال مغربی سرحدی صوبے میں سیاست

شمال مغربی سرحدی صوبے کی تاریخ:

اس صوبے کا جغرافیائی محل وقوع اس کی سیاست اور ثقافت پر گہرے اثرات ڈالتا رہا ہے مگر اسے عموماً نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ ایک جانب درہ خیبر ہے جو پاکستان کو افغانستان سے ملاتا ہے اور دوسری جانب شمالی علاقہ جات ہیں جو قراقرم کی خوبصورت شاہراہ کے ذریعے پاکستان کو چین سے جوڑتے ہیں۔ اگرچہ اسے پختونوں کی سرزمین کہا جاتا ہے مگر ثقافتی اور نسلی طور پر یہ صوبہ انتہائی متنوع ورثے اور روایات کا حامل ہے اور ایک زمانے میں عظیم ہندو اور بدھ سلطنتوں کا مرکز رہا ہے۔ آج کے لوگ ان تاریخی حقائق سے خاص واقف نہیں۔ شاید اس کی وجہ جزوی طور پر اسی کے عشرے میں ہونے والے افغان جہاد بھی ہو جس نے علاقے کے سماجی اور سیاسی حقائق کو انقلابی طور پر بدل کر رکھ دیا۔

شمال مغربی سرحدی صوبہ خاصا متنوع علاقہ ہے۔ چترالی اور ہندکو بولنے والے (ہزارہ ڈویژن) صوبے کی آبادی کا 30% ہیں۔ سیاست پر البتہ پختونوں کا راج ہے۔ اردو میں اسے سرحد کہا جاتا ہے۔ اپنی نسلی اور قبائلی شناخت پر نازاں پختونوں کا ایک بڑا حصہ اس نام سے مطمئن نہیں۔ انکی قوم پرست اور نسلی جذبات کا عکس، اے این پی کی صوبے کا نام بدلنے کی کوششوں میں دکھائی دیتا ہے۔ وہ سرحد کا نام پختون خوا رکھنا چاہتے تھے۔ خیبر کا لاحقہ لگانے پر اس نام پہ عمومی اتفاق کر لیا گیا تاہم پشتو نہ بولنے والے علاقے میں (جسے مسلم لیگ کا انتخابی گڑھ سمجھا جاتا ہے) اس نام کے خلاف شدید مزاحمت تھی۔ اسی بحث و تمحیص کی وجہ سے اٹھارویں آئینی ترمیم کو حتمی شکل دینے میں بھی مزید وقت لگا۔ پیپلز پارٹی ابتدا ہی سے اس مسئلے پر اے این پی کی حمایت کر رہی تھی۔ کیونکہ وہ مذہبی عصبیت کے بجائے علاقے میں سیکولر شناخت کو تقویت دینا چاہتی تھی۔ نام کی تبدیلی نے ہزارہ ڈویژن کے غیر پختون علاقے میں خاصا اشتعال پیدا کر دیا ہے اور اس کے

اضلاع ہری پور، مانسہرہ، بٹ گرام، کوہستان اور ایبٹ آباد میں متشدد مظاہرے اب بھی جاری ہیں۔

صوبہ سرحد میں قبائلی تعلقات سیاسی گروہ بندیوں و جماعتی تشکیل پر فاٹا کی نسبت کم اثر انداز ہوتے ہیں۔ فاٹا میں قبائل اپنے اپنے علاقے میں مرتکز ہونے کی وجہ سے جغرافیائی کنٹرول کے حامل ہیں جبکہ صوبہ سرحد میں اس کے برعکس قبائل مختلف اضلاع اور شہری اور دیہاتی علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس لیے صوبے کے سیاسی منظر نامے کی تشکیل میں طبقاتی شناخت بھی زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ اسی طرح مذہبی اور فرقہ وارانہ عصبیت بھی ایک اہم عنصر ہے۔ فاٹا کی نسبت صوبہ سرحد قومی دھارے میں شامل ہے اور یہاں ترقی پسند سیاسی قوتوں کا زور ہے۔ دراصل یہاں سوویت یونین کی حامی بائیں بازو کی جماعتوں کو تاریخی طور پر براہ راست حمایت حاصل رہی ہے۔ بہتر گورننس کے ذریعے صوبہ سرحد مضبوط معیشت کو جنم دے کر مکمل معاشی خود کفالت حاصل کر سکتا تھا۔ اس علاقے میں خاصے قدرتی وسائل موجود ہیں۔ سیاحت کے نقطہ نظر سے دلکش مقامات ہیں اور زرخیز زرعی زمین بھی کم نہیں لیکن تعلیمی شرح خاصی کم ہے۔ صحت کی بنیادی سہولتیں انتہائی ناکافی ہیں اور قانون کے نفاذ کی صلاحیت بہت کمزور ہے۔ غیر قانونی تجارت، اسمگلنگ اور ناکافی انفراسٹرکچر معیشت کو ترقی نہیں کرنے دیتے۔ گزشتہ سال صوبائی محکمہ خزانہ نے معاشی صورت حال کی تصویر کشی کچھ اس طرح کی تھی۔

> "صوبہ سرحد کی ٹیکس بیس (Base) بہت محدود ہے اور اسے اپنی آمدنی کے 92% حصے کے لیے وفاقی حکومت پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ تمام لازمی سماجی اور معاشی اشاریے دوسرے صوبوں کے مقابلے میں انتہائی کم ہیں۔ صوبے کو دہشت گردی کے خلاف جنگ کا بھی سامنا ہے جس کی بدولت بے پناہ انسانی جانیں گئیں، کاروبار پر بھی مسلسل نقصان اور وسائل کا ضیاع ہو رہی ہے۔"

2001ء سے صوبے کے عدم استحکام اور حکمی تبدیلیوں میں تین عوامل کا اہم کردار رہا ہے۔ پہلا 2002-7ء کے دوران ایم ایم اے کی حکومت کی سیاست اور اس کی کارکردگی۔ دوسرا صوبہ سرحد کے مدرسوں میں اصلاحات کا نہ کیا جانا اور تیسرا پڑوسی علاقے فاٹا میں بغاوت (اس بغاوت کی بنیادی وجوہات میں عشروں تک معاملات سے ریاستی عدم توجہی اور سرحد پار (افغانستان میں) مسلسل جنگی صورت حال ہیں۔

ایم ایم اے کی حکومت 2002ء میں انتخابات جیت کر تشکیل پائی تھی لیکن 2008ء کے عام انتخابات میں اس کا صفایا ہو گیا کیونکہ اس حکومت نے اپنے ہی حامیوں کو بھی بری طرح مایوس کیا تھا۔ کرپشن، اقربا پروری اور نااہلیت اس دور کا خاصا رہیں حالانکہ ایم ایم اے کی حکومت بھی

بدعنوانیوں کے خاتمے کے وعدے پر اقتدار میں آئی تھی۔ وہ انصاف کی فراہمی اور نوکر شاہی کو عوام کے سامنے جواب دہ بنانے کے وعدے پورے کرنے میں بری طرح ناکام رہی۔ ایم ایم اے کی پالیسیوں کی بدولت شہری آزادیاں محدود ہوئی۔ ترقی پسند قانونی اصلاحات ترک کر دی گئیں اور مذہبی رواداری بری طرح متاثر ہوئی۔ خواتین کے حقوق کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ یہی حال مدرسوں کی اصلاحات کا ہوا۔

سائنسی تعلیم کی شمولیت اور غیر ملکی طلبہ کی رجسٹریشن ان اصلاحات کا اہم حصہ تھے۔ اس کے برعکس ایم ایم اے نے عام تعلیمی نظام کو بھی اسلامائز کرنا شروع کر دیا اور پبلک ٹرانسپورٹ اور گانے بجانے پر پابندی عائد کر دی۔ سرحد اسمبلی نے قانون پاس کیا کہ خواتین کا علاج صرف خواتین ڈاکٹرز ہی کر سکتی ہیں۔ یہ اندازہ ہی محال ہے کہ علاج معالجے کے لیے خواتین ڈاکٹرز کی مطلوبہ تعداد نہ ہونے کی بنا پر سرحد میں عورتوں کو خصوصاً دیہی علاقوں میں کن مشکلات اور خطرات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔

جولائی 2005ء میں اہم ترین پیش رفت یہ ہوئی کہ اسمبلی نے (اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے) حسبہ بل پاس کر دیا جو ایم ایم اے کے رہنماؤں کے پیچ و خم والے اور کٹر تصورات کا عکاس تھا۔ اپوزیشن، سول سوسائٹی کی زبردست مخالفت اور وفاقی حکومت کے اعتراض کے باوجود ایم ایم اے کی حکومت متنازعہ شریعت بل کے معاملے کو آگے بڑھاتی گئی۔ انتہائی قابل اعتراض قانونی دفعہ وہ تھی جس کے ذریعے (سرحد میں پہلے ادارے بنائے گئے تھے جن میں) ایم ایم اے کے مذہبی اتحاد مسلک مولویوں کو قاضی کے برابر عہدے کی ملازمتیں دی جا سکتی تھیں۔ محتسب کا ایک عہدہ تخلیق کیا گیا جس کے ذریعے پبلک کرپشن کی روک تھام کی جاتی اور لوگوں کے انفرادی اور اخلاقی کردار پر نظر رکھی جاتی۔ پشاور میں ایسے بڑے بڑے بل بورڈز کو جن پر خواتین ماڈلز کی تصاویر تھیں، سیاہ کر کے صوبے میں خوف و ہراس کی فضا پیدا کر دی گئی۔

سپریم کورٹ نے قانون کی بہت سی شقوں کو غیر آئینی قرار دے دیا تو ایم ایم اے حکومت نے ان قانونی شقوں کو نیا نام دے کر اور قواعد و ضوابط میں تبدیلی لا کر، صوبے کے چیک اینڈ بیلنس کے نظام کو نظر انداز کیا بلکہ سپریم کورٹ کے احکامات کی بھی صریحاً خلاف ورزی کی۔

جنرل پرویز مشرف نے ایم ایم اے کی بہت سی دست درازیوں سے صرف نظر کیا کیونکہ انہیں صدر اور آرمی چیف کے عہدوں پر فائز رہنے کے لیے قومی اسمبلی میں ان کے ووٹوں کی حمایت درکار تھی۔ مشرف کے ساتھ پس منظر میں موجود اس اتحاد کی بدولت ہی ایم ایم اے کو "ملا ملٹری الائنس" کا مشہور نام ملا۔ پاکستان انسانی حقوق کمیشن کے سابقہ سربراہ اور سرحد حکومت کے

موجودہ سفیر برائے امن افراسیاب خٹک کے مطابق "2002ء کے الیکشن میں ایم ایم اے کی زبردست فتح محض ایک اتفاق نہیں تھا بلکہ یہ فوج کی سیاسی منصوبہ بندی کا باقاعدہ حصہ تھا۔ مذہبی انتہا پسندوں کے خطرے کی عدم موجودگی، مغربی طاقتوں کی نظر میں فوج کی افادیت ختم کر سکتی تھی۔" اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے برائن کلاؤلی (Brian Cloughley) رقم طراز ہے،

"بدقسمتی سے مشرف نے اس موقع پر ماضی کے تجربے سے فائدہ اٹھایا جس سے مذہبیوں کو بے پناہ قوت دے کر ان کو متحرک کر دیا تھا۔ 2002ء میں انہوں نے بکھرے ہوئے مذہبی گروہوں کی انتخابی مہم کی بھرپور حمایت کی اور اس طرح دو بڑی قومی سیاسی پارٹیوں کو ایک کنارے پر لگا دیا۔ اسی طرح انٹرنیشنل کرائسس گروپ کی ایک فکر انگیز رپورٹ بھی یہ بتاتی ہے۔ "اقتدار پر مکمل گرفت کرنے کے لیے، مشرف کی حمایت کے صلے میں، ایم ایم اے کو اسلامائزیشن کا ایجنڈا آگے بڑھانے کی کھلی چھٹی مل گئی۔"

اے این پی اور پیپلز پارٹی کی 2008ء میں انتخابی فتح ردعمل ایم ایم اے کی متنازعہ پالیسیوں کے خلاف شدید عوامی ردعمل کا نتیجہ تھی۔ لیکن ایم ایم اے کی پانچ سالہ دور حکمرانی نے انہیں اپنی پالیسیوں کو ادارتی شکل دینے میں مدد کی مثلاً تنگ نظر نظریات کے حامل بہت سے افسروں کو اہم جگہوں پر لگا دیا گیا اور اس طرح حکومتی شعبوں میں ان کے وفادار پیدا ہو گئے۔ مدرسوں پر بھی ان کا اثر اہم تھا۔ یہ مذہبی سکول ستر کے عشرے میں جنرل ضیا کی فوجی حکومت کی سرپرستی میں قائم کیے گئے تھے تاکہ وہ افغانستان میں جنگ کے لیے افغان مجاہدین کی بھرتی، ذہنی تیاری اور جنگی تربیت کا کام سرانجام دے سکیں۔۔۔ایک بین الاقوامی کرائسس گروپ کی رپورٹ کے مطابق، جمعیت علمائے اسلام کی زیر نگرانی چلائے جانے والے یہ مدرسے، پاکستان کی قبائلی پٹی میں مذہبی اور سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے جہادی کلچر کی حوصلہ افزائی میں نمایاں اہم کردار کے حامل تھے۔ 1990ء کے عشرے میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ گزشتہ عشرے میں ان مدرسوں میں انتہا پسندی کے خاتمے کے لیے کچھ اہم کارروائیاں بھی کی گئیں مگر ایم ایم اے کی حکومت نے (2002-7ء) انہیں بھی ایک حد تک ہی محدود رکھا۔ پاکستان کے قانون نافذ کرنے والے اداروں کی ایک قابل اعتماد رپورٹ کے مطابق، مالاکنڈ ڈویژن میں خودکش بمباروں کے تربیتی کیمپوں کو 2009ء میں سوات کے علاقے میں فوجی آپریشن کے دوران ختم کیا جا سکا۔ ظاہر ہے یہ ایم ایم اے کی حکومت کے دوران ہی قائم ہوئے ہوں گے، کیونکہ علاقے میں انہی دنوں میں تشدد پسندی زیادہ متحرک ہو رہی تھی۔ بعض مدرسے آج بھی مذہبی نفرت اور انتہا پسندی کا ماحول پیدا کرنے میں مشغول ہیں۔

سرحد میں موجود رجحانات

شدت پسندی کی نشوونما: مشرف کے دور صدارت میں خصوصاً (2004-7ء کے دوران) دہشت گردی کے خلاف کارروائی میں ایم ایم اے (کی چشم پوشی نے) طالبان کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ علاقے میں اپنے بیس ورکس قائم کریں۔ سیاسی اور سماجی حلقے جہادی پسندی کے خلاف سخت اقدامات کرنے پر زور دیتے رہے مگر ایم ایم اے حکومت نے ان پر کان نہیں دھرے۔ طالبان نے اپنے بڑھتے ہوئے فاٹا میں فوجی اور حکومتی اہلکاروں پر حملے شروع کر دیئے۔ لیکن ابتدا سرحد میں انہوں نے حکومت سے کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کی اور وہاں وہ بعض نظریاتی موضوعات، مثلاً لڑکیوں کے سکولوں، قدیم بدھ مجسموں، خواتین کے حقوق کی سرگرم اراکین، ویڈیو اور میوزک کی دوکانوں اور حجاموں کی دوکانوں (جہاں اسلام پسندوں کی خواہش کے خلاف داڑھیاں مونڈی جاتی ہیں) پر اپنی توجہ مرکوز کیے رہے۔ 2005ء کی ابتدا میں شدت پسندوں نے صوبہ سرحد میں خواتین کو دھمکی دینا شروع کر دی کہ وہ بغیر برقع کے گھر سے باہر نکلیں۔ یہ تحریک صوبہ سرحد کے جنوبی علاقوں بنوں، ٹانک، ڈیرہ اسماعیل خان، لکی مروت اور بنوں سے شروع ہوئی اور جنوبی اور شمالی وزیرستان تک پھیل گئی جو فاٹا میں طالبان کی سرگرمیوں کا اہم ترین مرکز تھے۔ کچھ وقت کے بعد یہی سرگرمی شمال میں بھی کوہاٹ، چارسدہ، مردان، دیر، سوات اور سرحد کے دارالحکومت پشاور اور قبائلی علاقوں کرم، اورکزئی، خیبر اور مہمند ایجنسی تک پھیل گئی۔

ظاہر ہے سرحد میں ہونے والی عسکریت پسند سرگرمیوں کے ڈانڈے براہ راست فاٹا میں پیدا شدہ صورت حال سے جا ملتے تھے مثلاً وزیرستان اور خیبر ایجنسیوں میں 2004-6ء کے دوران ہونے والے "امن معاہدوں" کے بعد سرحد میں انتہا پسندوں کی سرگرمیوں میں زیادہ شدت پیدا ہو گئی۔ فاٹا سے شدت پسندوں کی سرحد میں دراندازی کو روکنے کے لیے ایم ایم اے کی حکومت نے کوئی حفاظتی قدم نہیں اٹھائے۔ شدت پسندوں اور پاکستان کی مذہبی سیاسی جماعتوں میں کافی نظریاتی قدر مشترک کے ساتھ ساتھ ان کی معاشرتی حمایت کا حلقہ بھی لگ بھگ ایک ہی ہے۔ ایم ایم اے کی اتحادی جماعتیں، خصوصاً جمعیت علمائے اسلام کے دونوں (سمیع اور فضل الرحمن گروپ) حصوں کے مدرسوں میں سے فاٹا میں شدت پسندوں کے جنگجو گروپوں کے لیے افرادی قوت مہیا ہوتی ہے۔ 2009ء میں صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک صحافی طلعت فاروق نے یہ دلیل دی۔

"نائن الیون کے بعد طالبان اور القاعدہ کے عناصر جنہیں اپنے پاکستانی ہمسروں کی عمل

> حمایت حاصل تھی، سرحد پار کر کے فاٹا میں آ گئے۔ نتیجتاً جنرل مشرف کی اس دوغلی پالیسی کی وجہ سے پاکستانی طالبان کو مضبوط ہونے کا موقع ملا۔ اس پالیسی کو مذہبی جماعتوں سے اور مذہبی قدامت پسندوں سے بھی تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مقامی جرائم پیشہ گروہوں، ڈرگ مافیا، بھتہ فروخت کرنے والوں اور غیر ملکی سرپرستوں کی امداد سے، یہ لوگ طاقت پکڑتے چلے گئے۔"

فاٹا اور صوبہ سرحد کے درمیان چھ قبائلی علاقوں میں موجود نوکر شاہی کے نمائندے بھی بڑھتی ہوئی شدت پسندی کے بارے میں وفاقی حکومت کو الرٹ کرنے میں ناکام رہے۔ ایک طرف نوکر شاہی کی نااہلیت تھی اور دوسری جانب ان کی شدت پسندوں سے ہمدردیاں۔ دونوں ہی باتیں بدقسمت رویہ کی عکاس تھیں۔

سرحد میں آج پشاور اور اردگرد کے علاقوں کو انتہائی سنگین مسائل کا سامنا ہے جہاں طالبان اور ان کے حامی شدت پسند جب چاہتے ہیں، سرکاری عمارتوں، قانون نافذ کرنے والے حکام اور اے این پی اور پیپلز پارٹی کے رہنماؤں کو نشانہ بنا لیتے ہیں۔ پشاور اور اس کے گرد و نواح میں 2010ء کے ابتدائی مہینوں میں سکولوں پر ان کے حملے ایک اور پریشان کن رجحان کی نشان دہی کرتے ہیں۔ اکتوبر 2009ء میں جنوبی وزیرستان میں فوجی آپریشن کے نتیجے میں 221 افراد مارے گئے اور تقریباً 500 افراد زخمی ہوئے۔ کسی حد تک یہ صورت حال خیبر ایجنسی کے دو گروہوں لشکر اسلام اور انصار الاسلام کے مابین ٹکراؤ کے مرہون منت بھی تھی لیکن تحریک طالبان پاکستان بھی وہاں اتنی ہی سرگرم ہے اور اس نے سرحد میں ہونے والے بہت سے دہشت گرد حملوں کی ذمہ داری قبول بھی کی ہے۔ انہوں نے واضح طور پر یہ کہا کہ پشاور کے پرل کانٹیننٹل ہوٹل پر حملہ دراصل فاٹا کی اورکزئی ایجنسی کے ایک دوسرے پر حملے کا جواب تھا۔ طالبان کے دعوؤں سے قطع نظر، ان کی تمام سرگرمیاں، ایک خاص علاقے میں ان کے لاجسٹک سپورٹ ورک (مضبوط) پر منحصر ہوتی ہیں۔ بہت سے شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ پشاور میں ہونے والے اکثر دہشت گرد حملوں کا مرکز قریبی خیبر ایجنسی کا ایریا رہا ہے۔ تحریک طالبان پاکستان کے ان حملوں کے پیچھے ایک اہم وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ پشاور کے مضافات میں مقامی جرگوں کے ذریعے مقامی لشکر ترتیب دیے گئے ہیں جنھیں طالبان کے حملوں کو روکنے کے سلسلے میں پولیس اور صوبائی انتظامیہ کی مکمل حمایت حاصل ہے۔

سوات اور فوج

سوات میں صوفی محمد کی تحریک نفاذ شریعت محمدی (TNSM) کی شدت پسندی سے براہ راست ٹکراؤ سے پہلے، حکومت نے ایک بہت عرصے تک خاصے صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا۔ 2009ء کے وسط میں، جب حفاظتی اداروں نے ضلع سوات میں شدت پسندی کا خاصی حد تک صفایا کیا تھا اس کے ابتدائی مرحلے کی علاقوں میں 20 لاکھ سے زیادہ بے خانماں افراد کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا تو سول حکومت حیرت زدہ رہ گئی حالانکہ فوجی حکام اسے اس مسئلے کے بارے میں خبردار کر چکے تھے۔ عارضی اور نامکمل حفاظتی اقدامات کی بدولت بہت سے انتہاپسند گروہوں کو ان بے گھر افراد کے درمیان اثر و رسوخ بڑھانے کا موقع مل گیا۔ مثلاً جماعت اسلامی کی تنظیم 'الدعوت' اور جماعت الدعوۃ نے اپنے نئے روپ "فلاح انسانیت" کے ذریعے سوات کے علاقے میں فلاحی کیمپ قائم کر لیے تاکہ نیک نامی کما سکیں اور مستقبل کے لیے ممکنہ کارکنوں کو متاثر کر سکیں۔ اگرچہ ان گروہوں کی یہ ساری سرگرمیاں انسانی فلاح و بہبود کے حوالے سے تھیں لیکن اس صورت حال میں حکومتی ناکامی نے شدت پسندوں کی علاقے میں اثر و نفوذ کے امکانات کو مزید بڑھا دیا۔

جب حالات حد سے زیادہ بگڑ گئے اور امریکی دباؤ میں بھی شدت آ گئی تو حکومت نے تحریک نفاذ محمدی کے خلاف کریک ڈاؤن شروع کر دیا۔ کئی ہزار شدت پسندوں کے مارے جانے کی اطلاعات بھی آئیں لیکن تحریک کا رہنما مولانا فضل اللہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ عوامی اور سیاسی حمایت کی بدولت، فوج کو شدت پسندوں کے خلاف بھرپور ایکشن لینے میں بہت مدد ملی۔ تاہم سوات کی صورت حال کے بارے میں بہت سے سوال ابھی تک عقدہ لاینحل ہیں۔ مثلاً 2007-8ء کے دوران فضل اللہ کا ایف ایم ریڈیو، جسے اس نے پروپیگنڈے اور بھرتی کا ذریعہ بنایا ہوا تھا، بند کیوں نہیں کیا جا سکا؟ وہ ریڈیو پر ان لڑکیوں کے سکولوں کی استانیوں اور طالبات کو دھمکیاں دیا کرتا تھا اور 2008ء میں پولیس کے ایک محاصرے کے دوران اسے وہاں سے بچ نکلنے کی اجازت کیوں دی گئی؟ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ حفاظتی اداروں کی نااہلی کی وجہ سے ہوا جبکہ بعض سمجھتے ہیں کہ فضل اللہ نے پہلی شدت پسند مہم کے آغاز میں ہی حفاظتی اداروں سے کوئی ڈیل کر لی تھی۔ پاکستانی فوج نے اب ان معاملات کی طرف توجہ دی ہے۔ اس نے پولیس کے پانچ ہزار افراد کو دہشت گردی کے خاتمے اور اس کے علاوہ طریقوں سے نمٹنے کے لیے بھرپور ٹریننگ دی ہے۔

سوات کے جھگڑے میں مالاکنڈ ڈویژن کے قریب واقع ضلع صوابی کے پانچ پیروں کا بھی بڑا موثر کردار رہا۔ پانچ پیر دستوری وہابیت کو مقامی رنگ دے کر اس نظریے کی پیروی کرتے ہیں۔ پاکستان میں اس نظریے کے پیش رو مولانا طاہر تھے۔ مولانا طاہر آئی ایس آئی کے ایک اہم رکن میجر عامر کے والد ہیں۔ میجر عامر کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے بے نظیر بھٹو کی

پہلی حکومت کا تختہ الٹنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ میجر عامر کے بھائی مولانا طیب کے پنج پیر میں قائم مدرسے کا پاکستان میں انتہا پسند لیڈروں سے خاصا گہرا تعلق ہے۔ ان لیڈروں میں تحریک نفاذ محمدی کے صوفی محمد، باجوڑ کے طالبان کمانڈر مولوی فقیر محمد اور خیبر ایجنسی کے بدنام زمانہ دہشت گرد منگل باغ شامل ہیں۔ تحریک نفاذ محمدی کا طالبان چیف فضل اللہ بھی پنج پیر گروپ سے بہت متاثر تھا۔ 1980ء کے عشرے میں یہ مدرسہ صرف افغان جنگ کے لیے بھرتی کا اہم مرکز رہا بلکہ اس دوران اہم ترین تزویراتی منصوبہ بندی کے لیے تھنک ٹینک کا کردار بھی ادا کرتا رہا۔

صوبہ سرحد میں سیاسی پارٹیوں کی طاقت اور ان کا کردار:

2002ء کے انتخابات میں ایم ایم اے کی فتح کے بعد سرحد کی سیاسی ڈائنامکس میں تیزی سے تبدیلیاں آئیں۔ 2008ء میں اے این پی کی کوہاٹ، ہنگو، نوشہرہ اور پشاور میں کامیابی اور اسی طرح پیپلز پارٹی کی نوشہرہ، ڈی آئی خان، اپر دیر، بونیر اور سوات میں فتح یابی بہت اہم تھی کیونکہ یہ علاقے ہمیشہ سے مذہبی جماعتوں کا گڑھ سمجھے جاتے تھے لیکن ووٹروں نے جمعیت علمائے اسلام اور جماعت اسلامی کو مکمل طور پر مسترد کر دیا کیونکہ وہ طالبانائزیشن کی کارروائیوں کو متحدہ مذہبی جماعتوں کی پشت پناہی سے تعبیر کر رہے تھے۔ ماہر تعلیم جوشوا وائٹ کے مطابق جو سرحد کا تجزیاتی مطالعہ کر رہا تھا، ایم ایم اے کی شکست کی اہم توجیہ یہ بھی دی جا سکتی ہے کہ اس کی کولیشن حکومت کو تعلیم، صحت اور اینٹی کرپشن پالیسیوں میں واضح ناکامی کا سامنا تھا اور ساتھ ہی ساتھ وہ عمومی پاکستانی سیاست کے رجحانات کے برعکس نظریات پر چل رہے تھے۔ (ایم ایم اے کے دور میں) نوکر شاہی کی کرپشن اور نااہلی کے بارے میں تو مقامی میڈیا میں بے تحاشا شور مچا رہا۔

مارچ 2008ء میں اے این پی اور پیپلز پارٹی کی کولیشن حکومت وجود میں آئی تو عوام کو ان سے بہت توقعات تھیں لیکن ان کا حسن ظن زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکا کیونکہ اے این پی نے فوراً ہی سوات میں امن و امان قائم کرنے کے لیے تحریک نفاذ محمدی سے مذاکرات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اے این پی رہنماؤں کو علاوہ ازیں تحریک طالبان پاکستان اور سوات میں تحریک نفاذ محمدی کے حمایتیوں کی جانب سے مسلسل قاتلانہ حملوں کا سامنا تھا۔ اے این پی کے کارکنوں اور لیڈروں کو منظم طریقے سے نشانہ بنایا جا رہا تھا، انھیں عوامی منظر نامے سے ہی غائب ہونے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ یہ دھمکیاں اور حملے آج بھی جاری ہیں۔ تحریک نفاذ شریعت محمدی سے اپنے مذاکرات کے آغاز کی وجوہات اے این پی نے یوں پیش کیں کہ اگر فوج ہی طالبان کی بڑھتی ہوئی آفت کا مقابلہ کرنے میں دلچسپی نہیں رکھتی تو ہم ہی جانیں کیوں قربان کرتے پھریں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اے این

پی کے بعد، اسفندیار ولی نے مئی 2008ء میں واشنگٹن کا خفیہ دورہ کیا تا کہ امریکی حکومت کو متوقع معاہدے کے بارے میں اعتماد میں لے سکیں۔ اور بالآخر 2008ء میں اے این پی نے تحریک کے قائد صوفی محمد سے، جو اس وقت جیل میں تھے اس امید پر معاہدہ کر لیا کہ وہ اپنے داماد فضل اللہ کی زیر قیادت لڑنے والے جنگجوؤں کو اعتدال پسندی پر راضی کر لیں گے۔

وزیر اعلیٰ سرحد امیر حیدر خان ہوتی نے اس کی یوں وضاحت کی۔ "سیاسی ڈائیلاگ ہماری پالیسی ہے اور اسی کے ذریعے ہی راستہ نکلے گا۔ انہوں نے صوفی محمد کی رہائی کا بھی یہ کہتے ہوئے دفاع کیا۔" انہیں انسانی بنیادوں پر رہا کیا گیا۔" تاہم صوفی محمد نے جیل سے رہائی کے فوراً بعد ہی "حقیر" معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے متنازعہ بیانات دینا شروع کر دیئے۔ مثلاً انہوں نے واضح انداز میں کہا کہ جمہوریت غیر اسلامی ہے۔ انہوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ خواتین صرف حج کی غرض سے ہی اپنے گھروں سے باہر نکلیں۔ انہیں بھی علاج معالجے کے لیے بھی گھر سے باہر نہیں نکلنا چاہیے۔

اس قسم کے متشدد سیاسی بیانات نے پاکستانی سیاست کو ہلا کر رکھ دیا اور اس پر مستزاد امریکی دباؤ تھا چنانچہ مرکزی حکومت اور فوج کے سامنے تحریک نفاذ شریعت محمدی کے معاملے کو سنجیدگی سے نمٹنے کے علاوہ کوئی اور چارہ کار نہ رہا۔ سو "آپریشن راہ راست" کے ذریعے تحریک کو نہ صرف سوات سے بے دخل کر دیا گیا بلکہ انہیں اس قابل بھی نہیں رہنے دیا گیا کہ وہ دوبارہ علاقے پر اپنی گرفت رکھ سکیں۔ انسانی حقوق کے لیے سرگرم گروپوں کا کہنا ہے کہ اس دوران فوج نے انسانی حقوق کی شدید خلاف ورزیاں کیں تاہم فوج نے ایسی کسی بھی کارروائی سے صریحاً انکار کیا ہے۔

تاہم اس صورت حال نے اے این پی کی ریپوٹیشن کو شدید نقصان پہنچایا اور اس کی سیاسی ساکھ میں خاصی دراڑیں پڑ گئیں۔ اس کا ایک امکانی نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آنے والے انتخابات میں مذہبی جماعتیں دوبارہ اقتدار میں آ جائیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک نئی ہارڈ لائن قوم پرست جماعت وجود میں آ جائے۔

سیاسی اثرات کچھ بھی ہوں، سرحد میں طالبان مخالف جذبات بہرحال عروج پر ہیں۔ نومبر دسمبر 2009ء کے ایک سروے کے مطابق سرحد کے باشندوں میں سے صرف 10% لوگوں کی رائے میں طالبان کا کوئی مثبت اثر ہے جبکہ جون 2009ء میں یہی شرح 11% تھی۔ سرحد میں 2009ء کے آخر سے 2010ء کے ابتدائی مہینوں میں خودکش حملوں اور فوجی آپریشن کی وجہ سے عوامی تکالیف اور پریشانیوں میں خاصا اضافہ ہوا ہے۔ معاشی مواقع اور ترقیاتی فوائد سے محرومی کی بدولت سرحد (کے دور بالخصوص اس) سے منسلک علاقوں کے مایوس نوجوان متشدد رجحانات کا

شکار ہو کر قومی منظر میں نظر آتی سیاسی جماعتوں میں شامل ہونے کے بجائے، عسکری گروہوں کے ساتھ جا رہے ہیں۔

عمومی عوامی پریشانیاں

طالبان نوجوانوں کی بھرتی کے لیے سرحد میں موجود عمومی مسائل اور مشکلات کا بھرپور طریقے سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ بہت سے پختون اس صورت حال میں عجیب بے کسی کا شکار ہیں۔ انہیں لگتا ہے کہ جیسے طالبان، پاکستان اور امریکہ سبھی پختونوں پر حملہ آور ہیں۔ بعض پختون نالاں ہیں کہ آہستہ آہستہ سارے پاکستانی انہیں طالبان کا حامی اور عادی تشدد پسند سمجھنے لگے ہیں۔ یہ سماجی مسائل معاشی مشکلات کے (اور انہیں حل کرنے میں وفاقی حکومت کی نااہلی) کے ساتھ مل کر مزید گمبھیر ہوتے رہے ہیں۔ پشاور میں سرحد کے چیمبر آف کامرس کے مطابق جنوری 2009ء میں صوبے کے پچیس سو صنعتی اداروں میں سے صرف پانچ سو چھوٹے ادارے چل رہے تھے۔ شہری اس بات پر بھی نالاں ہیں کہ پولیس اور امن عامہ کے ذمہ دار سول ادارے انہیں مناسب تحفظ فراہم کرنے میں بری طرح ناکام ہو گئے ہیں حالانکہ زیادہ تر یہی حفاظتی اداروں کے افراد دہشت گردوں کا نشانہ بنتے نظر آتے ہیں۔

مستقبل کے امکانات

سرحد کا مستقبل طے کرنے میں سیاسی جماعتوں کی گھٹتی بڑھتی حمایت ہی نہیں، کئی اور عوامل بھی اثر انداز ہوں گے۔ 2009ء میں فاٹا میں کی گئی سیاسی اصلاحات کی کامیابی یا ناکامی کا بھی اہم حصہ ہو گا۔ ان اصلاحات کا مقصد سیاسی عمل میں شراکت میں اضافہ اور اجتماعی فوجداری سزاؤں کو محدود کرنا ہے۔ اسی طرح جنوبی پنجاب میں عسکری آپریشن بھی کم اہم نہیں جہاں بہت سے دہشت گرد، جنوبی وزیرستان کے فوجی آپریشن کے دوران، (2009ء کے آخر میں) جا چھپے تھے۔ اگر ان گروہوں کا خاتمہ نہیں کیا جاتا تو وہ دوبارہ علاقے میں اپنی دہشت گردانہ کارروائیاں کر سکتے ہیں۔ مزید برآں، پنجاب میں حکومتی پیش قدمی انہیں دوبارہ فاٹا یا سرحدی علاقوں کی طرف دھکیل سکتا ہے چنانچہ صوبہ سرحد میں پولیس اصلاحات بھی نہایت اہم ہیں تاکہ مستقبل میں پولیس مقامی شدت پسندی کا اسی طرح مقابلہ کر سکے جیسے آج کل فوجی کارروائی کے ذریعے ہو رہا ہے۔ دہشت گردی سے پاک حکومتی معاملات اور حفاظتی بحالی بھی اہم عوامل ہیں جو سرحد کی عوامی نفسیات پر مثبت اثرات پیدا کریں گے۔ معاشی ترقی بہرحال اہم ترین کردار کی حامل ہوگی اور آخر میں شدت پسند عناصر میں سے ایسے لوگوں کی واضح تمیز پیدا کرنا ہوگی جنہیں دوبارہ معاشرے میں جذب کیا جا سکتا ہے۔ سوات کی صورت حال میں بھی یہ دیکھا گیا کہ شدت پسندوں میں گھر جانے کے بعد

بہت سے لوگوں کو جب کوئی دوسرا راستہ نظر نہیں آیا تو انہوں نے ان کا ساتھ دینا شروع کر دیا تھا۔ شکستہ حال لوگوں کی مدد کے لیے، مقامی لوگوں کو اختیارات کا دیا جانا تاکہ وہ ان میں اچھے مستقبل کا تصور پیدا کر سکیں عوام میں امید کی نئی روشنی پھیلا سکتا ہے۔ پختونوں میں مایوسی اور محرومی کو بہتر حکومتی اقدامات اور عمل تحفظ کے احساس کے ذریعے ختم کیا جانا چاہیے۔ عوامی سطح پر موجود مایوسی اور محرومی کے خاتمے کے بعد ہی حکومت کو ان مخالف شدت پسند گروہوں سے بات چیت کا سوچنا چاہیے جن کے ساتھ مصالحت ممکن ہے۔

پختون تاریخ محدود تنازعات اور متشدد قبائلی رقابتوں سے عبارت ہے تاہم انہیں اپنے اندرونی قبائلی اختلافات کو بات چیت کے ذریعے حل کرنا بخوبی آتا ہے کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ کبھی بھی اپنا نسلی وجود برقرار نہ رکھ سکتے۔ لیکن ایسے مذاکرات کے مؤثر ہونے کے لیے ریاستی عملداری کا استحکام بہت ضروری ہے۔ عوامی ایکشن سول سوسائٹی اور سیاسی عناصر کے لیے صرف ایک موقع فراہم کر سکتا ہے کہ وہ صورت حال کو سنبھالا دیں اور تعمیر نو کی ذمہ داریاں ادا کرنا شروع کر دیں۔ سرحد میں اہم سیاسی قوتوں کو چاہیے کہ وہ 2009ء کے سوات آپریشن اور اس کے نتیجے میں پیدا شدہ صورت حال کا پوری طرح غیر جذباتی تجزیہ کریں تاکہ آئندہ بھی صوبے کے کسی بھی حصے میں ایسے خطرناک حالات اور چیلنجز کو رونما ہونے سے روکا جا سکے۔

ضمیمہ

صوبہ پختونخواہ کے چوبیس اضلاع میں نسلی، قبائلی اور سیاسی گروہ

(1) ضلع ایبٹ آباد: یہاں بڑی برادریاں سردار، عباسی، جدون، تنولی، سید، اعوان اور راجپوت ہیں۔ عباسی اور جدون کثرت میں ہیں اور بہت بااثر خاندان ہیں جو برادری کے طور پر اکٹھے رہتے ہیں۔ چند ہندو اور سکھ خاندان بھی یہاں رہتے ہیں لیکن اکثریت سنی ہے جو دیوبندی مسلک سے تعلق رکھتی ہے۔ ایبٹ آباد شہر کے ارد گرد شیعہ آبادیاں بھی ہیں۔ یہاں کے ممتاز لوگوں میں امان اللہ خاں جدون، ائیر مارشل اصغر خاں، سردار یعقوب، گوہر ایوب اور سردار مہتاب خاں شامل ہیں۔ اس ضلع میں مسلم لیگ نون کا زیادہ اثر ہے۔ 2008ء کے انتخابات میں قومی اسمبلی کی تینوں نشستیں نون لیگ نے جیتی تھیں۔ صوبے کے نام خیبر پختونخواہ رکھنے کے بعد یہاں اپریل 2010ء میں صوبہ ہزارہ کے قیام کے لیے تحریک چلائی گئی۔

(2) ضلع بنوں۔ اس ضلع میں جو بڑے پشتون قبیلے آباد ہیں ان میں بنوچی، وزیر، مروت، بھٹانی اور داوڑ شامل ہیں۔ بنوچی قبیلے کے لوگ زیادہ تر بنوں شہر میں رہتے ہیں۔ وزیر شہر کے نواحی علاقوں میں آباد ہیں۔ داوڑ قبیلے کے لوگ جو فاٹا کی شمالی وزیرستان ایجنسی سے تعلق رکھتے ہیں وہ بھی اس علاقے میں آباد ہو گئے ہیں اور یہاں کاروبار کرتے ہیں۔ فاٹا کے اثرات کی وجہ سے صوبے کے دوسرے علاقوں کے مقابلے میں بنوں میں جرگہ سسٹم بہت مضبوط ہے۔ ضلع میں عیسائی، ہندو اور احمدی بھی تھوڑی تعداد میں آباد ہیں۔ اس ضلع میں جمعیت علماء اسلام (فضل الرحمن)، عوامی نیشنل پارٹی اور کسی حد تک پیپلز پارٹی کا اثر ہے۔ باز محمد خان (اے این پی) اور کرم خان درانی (جے یو آئی ایف) ضلع کے بااثر سیاسی رہنما ہیں۔ 2008ء کے انتخابات میں مولانا فضل الرحمن اسی ضلع سے کامیاب ہوئے تھے۔

(3) ضلع بٹ گرام۔ اس ضلع کی بڑی برادری گجر، سواتی، خون خیل اور سیدا خیل ہے۔ سیاسی میدان میں سواتی بہت زیادہ بااثر ہیں لیکن اخون خیل جو طلائی کے علاقے میں آباد ہیں وہ بھی اثر رکھتے ہیں۔ ضلع میں سیاسی گروہ بندی کے بجائے قبائلی گروہ بندی الیکشن میں اثر انداز ہوتی ہے۔ بٹ گرام کا مدرسہ دارالعلوم اشاعت الاسلام، جس کے مہتمم ایم ایم اے کے قاری محمد یوسف ہیں اپنی شدت پسندی کے لئے مشہور ہے۔ سیاست دانوں میں ملنگ خان اور یوسف خان زیادہ اثر و رسوخ رکھتے ہیں۔ مسلم لیگ (ن) کا یہاں زیادہ اثر ہے۔ 2008ء کے انتخابات میں اسی کا امیدوار کامیاب ہوا تھا۔

(4) ضلع بونیر۔ ضلع بونیر میں زیادہ تر یوسف زئی قبیلے کے لوگ آباد ہیں۔ دوسرے قبائل میں سید، گجر اور مہمند شامل ہیں۔ گجر سب سے زیادہ پسماندہ لوگ ہیں۔ سیاسی اور اقتصادی میدان میں یوسف زئی بہت بااثر ہیں۔ بونیر کئی صوفی بزرگوں کا علاقہ بھی ہے۔ ان میں پیر بابا اور شال بندی بابا کے مرید بہت زیادہ ہیں۔ سکھوں اور ہندوؤں کی بھی کچھ آبادی ہے۔ سیاسی جماعتوں میں اے این پی اور پیپلز پارٹی زیادہ مقبول ہیں۔ بااثر سیاسی شخصیات میں شیر اکبر خان (شیرپاؤ گروپ) عبدالمتین خان (پی پی پی) اور گل شیر خان (مسلم لیگ (ن)) شامل ہیں۔ 2008ء کے الیکشن میں قومی اسمبلی کی نشست اے این پی نے حاصل کی تھی۔

(5) ضلع چارسدہ۔ اس ضلع کے ممتاز قبائل محمد زئی، مہمند اور گگیانی ہیں۔ سب سے بڑا اور بااثر قبیلہ محمد زئی اس کے بعد مہمند ہیں۔ یہاں جرگہ سسٹم بہت بااثر ہے۔ یہاں چند علاقوں میں سے ہے جہاں حاجی ترنگزئی صوفی کا مزار ہے۔ یہ اے این پی کا علاقہ ہے جہاں سے خان عبدالغفار خان کے خاندان کے لوگ الیکشن میں کامیاب ہوتے ہیں البتہ شیرپاؤ گروپ بھی یہاں اپنا اثر رکھتا ہے۔

(6) ضلع چترال۔ اس ضلع کی بڑی آبادی "خو" نسل کے افراد پر مشتمل ہے جو "کھوار" زبان بولتی

ہے۔ یہ چترالی زبان ہے جو گلگت، شمالی علاقوں اور سوات کے چند مقامات پر بھی بولی جاتی ہے۔ بڑی بڑی وادیوں میں آرندو، دروش اور بمبوریت وادی شامل ہیں۔ چترال کالاش لوگوں کا علاقہ بھی ہے جو شہر کے جنوب مغرب کی تین وادیوں میں بستے ہیں۔ یہ ضلع پیپلز پارٹی کا کہلاتا ہے۔ مولانا عبدالاکبر خان چترالی (ایم ایم اے) اور شہزادہ غلام محمد ایوب، مسلم لیگ (ن) جو پہلے پیپلز پارٹی میں تھے۔ 2008ء کے الیکشن میں قومی اسمبلی کی نشست پر کامیاب ہوئے تھے۔

(7) ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خان: اس ضلع کے خاص گروپ بلوچ، مہاجر اور پشتون (سوات قبیلہ) ہیں۔ اکثریت کی زبان سرائیکی ہے البتہ پشتو اور اردو زبان بھی یہاں بولی جاتی ہے۔ صوبہ خیبر پختونخواہ کا یہ واحد سرائیکی بولنے والا علاقہ ہے جو جنوبی پنجاب اور سندھ تک پھیلا ہوا ہے۔ یہاں چھوٹی سی سکھ برادری بھی ہے۔ اس ضلع کا نام ایک بلوچ سردار اسمٰعیل خان کے نام پر رکھا گیا تھا۔ مولانا فضل الرحمن اور ان کے بھائی اسی ضلع سے ہی الیکشن میں کامیاب ہوتے ہیں۔ ان کا مدمقابل کنڈی قبیلہ ہے۔ پیپلز پارٹی کے فیصل کنڈی نے یہاں مولانا فضل الرحمن کو الیکشن میں شکست دی تھی۔

(8) ضلع ہری پور: ہزارہ کی طرح یہاں بھی کئی برادریاں اثر و رسوخ رکھتی ہیں۔ ان میں جدون، ترین، دلازاک، تنولی (جو غازی کے علاقے میں زیادہ ہیں) سردار، اعوان اور راجہ شامل ہیں۔ یہاں ایوب خان کے خاندان کا بہت اثر ہے۔ البتہ 2008ء میں مسلم لیگ (ن) کا امیدوار یہاں سے کامیاب ہوا تھا۔

(9) ضلع ہنگو: اس ضلع میں فاٹا کی کرم ایجنسی کا بہت اثر ہے۔ یہاں بنگش اور اورکزئی، خٹک، شنواری اور آفریدی قبیلے آباد ہیں۔ یہاں شیعہ سنی جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ جمعیت العلمائے اسلام اور اے این پی یہاں کی بڑی سیاسی جماعتیں ہیں مگر امیدوار کا مسلک بھی الیکشن میں اثر انداز ہوتا ہے۔

(10) ضلع کرک: اس ضلع میں زیادہ تر خٹک آباد ہیں۔ خٹک اس ہی علاقے سے منسوب ہے۔ اس ضلع نے ممتاز فوجی اور سرکاری افسر پیدا کیے ہیں۔ جے یو آئی، اے این پی اور پیپلز پارٹی کا سیاسی اثر ہے۔ اعراسیات خٹک اسی علاقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ 2008ء کے الیکشن میں جے یو آئی نے یہاں سے قومی اسمبلی کی نشست حاصل کی تھی۔

(11) ضلع کوہاٹ: یہ ضلع دو اہم قبیلوں بنگش اور خٹک میں منقسم ہے۔ بنگش وسطی، شمالی اور شمال مغربی علاقوں میں آباد ہیں۔ خٹک شیری، کوزہ اور سگری میں پھیلے ہوئے ہیں۔ کوزہ خٹک زیادہ تر شمال مشرق اور پشاور کے ملحقہ علاقوں میں آباد ہیں۔ کوہاٹ فوجی شہر ہے۔ جہاں فضائیہ کا اڈہ ہے۔ یہاں کی ممتاز شخصیتوں میں سید افتخار حسین گیلانی، امتیاز گیلانی اور جاوید ابراہیم پراچہ شامل ہیں۔ پراچہ کا تعلق ایم ایم اے سے تھا اور وہ طالبان کے لیڈر ملا عمر اور القاعدہ کے اسامہ بن لادن کے حامی رہے

جاتے ہیں۔ البتہ 2008ء کے الیکشن میں عوامی نیشنل پارٹی کا امیدوار کامیاب ہوا تھا۔

(2) ضلع کوہستان: اس ضلع میں یہ قبیلے بااثر ہیں۔ منکر، سوتی، کوکا، بٹے خیل اور درم خیل، خوئدگی، کتہ شریح اور دشوار گزار علاقوں کی وجہ سے اس ضلع میں رائے دہندوں کی تعداد ہمیشہ کم ہوتی ہے۔ جمیعت العلماء اسلام کا اثر یہاں زیادہ ہے لیکن 2008ء کے الیکشن میں پیپلز پارٹی کا امیدوار کامیاب ہوا تھا۔

(3) ضلع لکی مروت: یہ پشتون قبیلہ مروت کی سرزمین ہے۔ مروت لوحانی قبیلے (جسے نیکی لوحانی یا سپید لوحانی بھی کہا جاتا ہے) کے چار ذیلی قبیلوں میں سے ایک ہے۔ مروت عربی کے لفظ مروت سے ماخذ ہے جس کا مطلب رحمدلی اور سخاوت ہے۔ مروت قبیلے کے افراد دراز قد اور گوری رنگت کے ہوتے ہیں۔ یہاں سیاسی وابستگی کے مقابلے میں برادری کو ترجیح دی جاتی ہے اس لئے مروت ہی الیکشن میں کامیاب ہوتے ہیں۔ جمیعت علماء اسلام اور ق لیگ کا بھی یہاں کچھ اثر ہے۔ سلیم سیف اللہ اور ان کے بھائی انور سیف اللہ اس علاقے کی سب سے زیادہ بااثر سیاسی شخصیت ہیں۔ جمیعت کا امیدوار بھی فروری 2010ء میں مروت قبیلے کی حمایت سے کامیاب ہوا تھا۔

(4) ضلع لوئر دیر: اس ضلع میں کئی پشتون قبیلے اور برادریاں آباد ہیں۔ شوری، شمشوزئی، یوسف زئی، شاہ خیل، مست خیل، عمر خیل، روش خیل، میاں زی خیل، سلطان خیل اور اکا خیل قبیلے مشہور ہیں۔ یہاں سید اور گجر بھی آباد ہیں۔ سیاسی طور پر یہ جماعت اسلامی کا علاقہ ہے۔ 2002ء میں جماعت اسلامی کے امیر قاضی حسین احمد نے یہاں سے الیکشن لڑا تھا حالانکہ وہ نوشہرہ کے رہنے والے ہیں۔ عوامی نیشنل پارٹی دوسری بااثر جماعت ہے۔ جماعت اسلامی کے سراج الحق اور اے این پی کے رہنما یہاں کے فعال سیاسی رہنما ہیں لیکن حیرت انگیز طور پر 2008ء کے الیکشن میں یہاں سے پیپلز پارٹی نے کامیابی حاصل کی تھی۔

(5) ضلع مالاکنڈ: اس ضلع کے بڑے قبیلے اکوزئی یوسف زئی (خان خیل، بائی زئی اور رانی زئی) اور اتمان خیل ہیں۔ غیر پشتونوں میں سید اور گجر ہیں۔ رانی زئی اور بائی زئی کئی صدی پہلے افغانستان سے یہاں آئے تھے اور ابھی تک ان کے تعلقات وہاں ہیں۔ مولانا عنایت الرحمن کے طالبان کے ساتھ رابطے ہیں اور پیپلز پارٹی کے لال محمد خان علاقے کے بااثر افراد میں شامل ہیں۔ 2008ء کے الیکشن میں اس ضلع سے پیپلز پارٹی ہی کامیاب ہوئی تھی۔

(6) ضلع مانسہرہ: اس ضلع میں مختلف قبیلے اور برادریاں آباد ہیں۔ ان میں پشتون، جدون، راجپوت اور پنجابی شامل ہیں۔ سواتی ان میں سب سے زیادہ ہیں۔ بخاری سید، مشہدی سید اور ترمذی سید بھی یہاں اثر و رسوخ رکھتے ہیں۔ بالاکوٹ کے محمد شاہ اور قاسم شاہ (دونوں کے) وجیہ الزمان

اور عظیم سواتی اور تناول علاقے کے نوابزادہ صلاح الدین، رنگل خان اور حبیب الرحمن تنولی بڑے سیاسی رہنما ہیں۔ مسلم لیگ ق اور جمیعت العلماء اسلام بڑی سیاسی جماعتیں ہیں۔

(17) ضلع مردان یہاں یوسف زئی، خٹک اور محمند بڑے پشتون قبیلے ہیں ۔ اسے عوامی نیشنل پارٹی اور پیپلز پارٹی کا گڑھ مانا جاتا ہے۔ خیبر پختونخواہ کے موجودہ وزیراعلیٰ امیر حیدر خان ہوتی کا تعلق اسی علاقے سے ہے۔ ہوتی خاندان یہاں کا سب سے بااثر خاندان ہے لیکن اس کے افراد پیپلز پارٹی اور اے این پی میں بٹے ہوئے ہیں۔

(18) ضلع نوشہرہ۔ خٹک قبیلے کا ذیلی قبیلہ کوڑہ خٹک علاقے کا بااثر قبیلہ ہے۔ یہ مزید چھ قبیلوں کوڑہ خیل، خار خٹک، سوہی خٹک، آدی خیل، بی خیل اور کا کا خیل میں بٹا ہوا ہے۔ یہاں کمریانی قبیلہ بھی آباد ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ قبیلہ پشتونوں کی مدد کے لئے افغانستان سے آیا تھا پھر وہ یہیں آباد ہو گیا۔ دوسرے قبیلوں میں درانی اور غیر پشتونوں میں اعوان اور طاہر شامل ہیں۔ مشہور مدرسہ دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک میں ہے۔ طالبان کے رہنماؤں نے اسی مدرسے میں تعلیم حاصل کی ہے۔ عوامی نیشنل پارٹی اور پیپلز پارٹی یہاں کی بڑی سیاسی جماعتیں ہیں۔

(19) ضلع پشاور۔ اس ضلع میں پشتون اور غیر پشتون سب آباد ہیں۔ ممتاز پشتون قبیلوں میں آفریدی، خٹک، اورکزئی، وزیر، محسود، محمند، داؤدزئی اور چمکنی شامل ہیں۔ پشاور مختلف نسلوں اور قبیلوں کا شہر ہے۔ شہر کے رہنے والے زیادہ تر ہندکو بولتے ہیں۔ یہاں سیاست پر ہر دور چھائے ہوئے ہیں جن کا تعلق خان عبدالغفار خان کی جماعت سے ہے۔ یہاں پیپلز پارٹی کا اثر بھی ہے۔ 1988ء میں بے نظیر بھٹو یہاں سے کامیاب ہوئی تھیں۔ 2008ء کے الیکشن میں چار نشستوں پر پیپلز پارٹی اور اے این پی کے امیدوار کامیاب ہوئے۔

(29) ضلع شانگلہ۔ ضلع کی تقریباً تمام آبادی یوسف زئی قبیلے پر مشتمل ہے۔ یوسف زئی کی ذیلی شاخیں ازی خیل اور بابوزئی ہیں۔ مروزی خیل زیادہ تر چکیسر، مارتنگ اور شاہ پور میں آباد ہیں۔ بابوزئی پوران کے علاقے میں آباد ہیں۔ سید اور قریشی یہاں رہتے ہیں۔ مسلم لیگ (ق) کے امیر مقام نے 2008ء میں یہاں سے الیکشن جیتا تھا۔

(21) ضلع صوابی۔ ضلع کی اکثریت یوسف زئی ہے۔ دوسرے قبیلوں میں جدون، ردڑ اور خٹک ہیں۔ افغان مہاجرین کے لئے سب سے بڑا کیمپ یہاں بنایا گیا تھا۔ 2008ء کے الیکشن میں عوامی نیشنل پارٹی کا امیدوار یہاں سے کامیاب ہوا تھا۔

(22) ضلع سوات۔ اس ضلع کے باشندوں کی اکثریت یوسف زئی پشتونوں سے تعلق رکھتی ہے البتہ کالام کی وادی میں کوہستانی اور گوجر بھی آباد ہیں۔ شدت پسندوں کی ریشہ دوانیوں کے باوجود

2008ء میں عوامی نیشنل پارٹی نے بھی یہاں کامیابی حاصل کی تھی۔ جمعیت العلماء اسلام اور جماعت اسلامی کا بھی یہاں اثر ہے۔

(23) ضلع ٹانک یہاں پشتو بولنے والوں اور سرائیکی بولنے والوں کی تعداد برابر برابر ہے۔ کنڈی قبیلہ زیادہ بااثر ہے۔ اسی قبیلے نے انیسویں اور بیسویں صدی کے کئی عشروں میں یہاں حکومت کی۔ دوسرے قبیلوں میں بھیٹنی، گنڈی اور مروت وادی گومل میں بااثر ہیں۔ وزیر اور محسود آپس میں جھگڑتے رہتے ہیں کہ یہ علاقہ ان کا ہے۔ ٹانک میں جمعیت العلماء اسلام کا اثر ہے۔

(24) ضلع اپر دیر اس ضلع میں پشتون اور غیر پشتون یوسف زئی، کوہستانی، افغانی اور سواتی سب کی ملی جلی تعداد ہے۔ 2008ء میں پیپلز پارٹی کے امیدوار نے قومی اسمبلی کی نشست حاصل کی تھی۔

حسن عباس کولمبیا یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں اور نیو یارک میں ایشیا سوسائٹی کے برنارڈ شوارز فیلو ہیں۔

کرم ایجنسی میں محاذ آرائی اور تصادم

منصور خان محسود، اپریل 2010

فرقہ واریت کی تاریخ

فاٹا کے دوسرے علاقوں کے برعکس، کرم میں محاذ آرائی کی بنیادی وجوہ قبائلی یا سیاسی معاملات کے بجائے فرقہ وارانہ تعصبات سے عبارت ہیں۔ سوویت یونین کے خلاف افغان جہاد کے بعد ہزاروں افغانوں کو سرحد پار، کرم کے علاقے میں پناہ لینی پڑی جہاں پاکستانی حکومت نے ان کے لیے مہاجر کیمپ قائم کر دیے۔ سینکڑوں قسم کے ہتھیار، جن میں معمولی ہتھیار سے لے کر مشہور سٹنگر میزائل تک شامل تھے، بھی ان پناہ گزینوں کے ساتھ اس علاقے میں آ گئے۔ مقامی خاندانوں نے انہیں خریدنا شروع کر دیا کیونکہ وہ ان کے ذریعے اپنا بہتر تحفظ بھی کر سکتے تھے اور دشمنوں پر حملے کے لیے بھی استعمال کر سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ کرم میں شیعہ سنی محاذ آرائی محض فرقہ وارانہ تصادم سے کہیں زیادہ ایک مسلسل جنگ نظر آتی۔ افغان پناہ گزین زیادہ تر سنیوں کا ساتھ دیتے تھے۔ اس طرح یہ محاذ آرائی 1980-90ء کے عشروں میں مسلسل جاری رہی۔ (دونوں جانب کے) قبائلی عمائدین کے بیچ میں پڑنے کی وجہ سے بعض اوقات یہ تصادم رک بھی جاتا تھا۔

کرم میں فرقہ وارانہ تصادم کی ایک بڑی وجہ افغان جہاد میں پاکستان کا کردار رہا ہے۔ جن دنوں پاکستانی خفیہ ایجنسیوں نے گلبدین حکمت یار کی حزب اسلامی جیسے طالبان کی گروہوں کو فنڈز اور ہتھیار دینے شروع کیے تھے، طوری نامی شیعہ قبیلے کو اسی وقت آئندہ خطرات کا احساس ہو گیا تھا۔ (وہ سوویت یونین کے خلاف جنگ میں اس لیے شامل نہیں ہوئے کیونکہ

سوویت یونین سے پاکستان پر حملہ نہیں کیا تھا) تاہم افغان جہاد میں شریک ہونے کے باوجود انہوں نے مطالبہ کیا تھا کہ حکومت انھیں بھی حصہ دیا کرے۔

کرم کے شیعہ افغان پناہ گزینوں کو اپنے علاقے میں پناہ دینے کے بھی خلاف تھے ان کا خیال تھا کہ پاکستانی حکومت ان سنی گروہوں کو استعمال کر کے، کرم میں ان کے جنت مثال پرامن معاشرے کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ 980ء کے عشرے میں پاکستان بھر میں فرقہ واریت کو خوب ہوا دی گئی اور 1987ء میں پہلا شیعہ سنی فساد کرم کے علاقے صدہ (Sada) میں ہوا۔ محرم کے جلوس کے موقع پر اس تصادم میں سینکڑوں سنی اور شیعہ مارے گئے۔ افغانستان میں طالبان کی سنی قیادت کے اقتدار میں آنے کے بعد کرم میں فرقہ وارانہ جنونیت اپنے عروج پر جا پہنچی۔ 997ء میں پاراچنار اور بالائی کرم میں سکول کے طلبہ نے شہر کی بہت سی عمارتوں پر شیعہ مخالف نعرے لکھ دیے جس کے نتیجے میں ہونے والے خون ریز فساد میں مزید سینکڑوں جانیں ضائع ہو گئیں۔ محاذ آرائی میں شدت آئی اور یوں تصادم نے پوری ایجنسی کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ دونوں اطراف کے شیعہ مخالف ایجنڈے کے پھیلاؤ نے پاکستان اور افغانستان دونوں ہی جانب فرقہ وارانہ عصبیت میں مزید شدت پیدا کر دی۔

گیارہ ستمبر 2001ء کے نیویارک اور واشنگٹن پر دہشت گرد حملوں کے بعد بہت سے غیر ملکی عسکریت پسند اور القاعدہ کے جنگجو سرحد پار کر کے پاکستان آ گئے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ فاٹا میں اپنے محفوظ مراکز بنا کر وہاں سے پاکستان مخالف کارروائیاں کر سکیں گے کرم وہ واحد جگہ ہے جہاں سے ان عسکریت پسندوں کو نکالا گیا (دسمبر 2001ء میں تورا بورا کی لڑائی کے بعد راتوں رات بہت سے عرب پناہ لینے یہاں آ گئے) اور کرم میں شیعہ باشندوں نے القاعدہ سے متعلق دو درجن لوگوں کو حکومت پاکستان کے حوالے کیا۔

2000ء کی ابتداء میں، شیعہ مخالف ایک گروپ سپاہ صحابہ پاکستان نے، جو کرم میں فرقہ وارانہ فسادات کو ہوا دیتے رہتے تھے، اسی علاقے میں مثلاً ہنگو، کوہاٹ، اورکزئی وغیرہ میں اپنے گروپ کی مضبوط بنیادوں پر منظم کر لیا۔ سپاہ صحابہ کے سابق لیڈر اعظم طارق کرم میں بھی اتنے ہی مقبول تھے جتنے کہ پنجاب میں۔

کرم میں حالیہ فرقہ وارانہ فسادات

برسوں سے یہ ہوتا آ رہا ہے کہ ہر پانچ دس برس بعد کرم میں کوئی نہ کوئی بڑا فرقہ وارانہ فساد برپا ہو جاتا ہے۔ اپریل 2007ء میں پاراچنار میں سنیوں نے ربیع الاول کے جلوس کے دوران رسول

کرم کے یوم پیدائش کے موقع پر) شیعہ مخالف نعرے لگائے۔ جس سے شیعہ کمیونٹی کو غصہ آیا اور انہوں نے مقامی پولیٹیکل انتظامیہ سے اس کی شکایت کی۔ پولیٹیکل ایجنٹ نے اس ہنگامے میں ملوث بعض سنی رہنماؤں کو گرفتار کر لیا۔ سنیوں نے کہا کہ ان کے جلوس پر پتھراؤ کیا گیا تھا صورت حال بگڑتی گئی۔ اگلے روز شیعوں نے دعویٰ کیا کہ پاراچنار میں ان کے مذہبی جلوس پر سنیوں کی ایک مسجد سے راکٹ اور دستی گرینیڈ فائر کیے گئے ہیں۔ جلد ہی فسادات پورے شہر میں پھیل گئے۔ (پیواڑ، کرمان، پاراچمکنی، تیری منگل، جلمنت کیلی، باگازئی اور علی زئی جیسے) قریبی گاؤں بھی ان کی آگ سے نہ بچ سکے۔ پاک فوج اور فرنٹیئر کور نے مداخلت کرنے کی کوشش کی تو دونوں جانب سے ان پر بھی حملہ کیا گیا۔ اور اس طرح درجنوں سپاہی موت کا شکار ہو گئے۔ اس سلسلہ فسادات میں سو سے زیادہ لوگ جاں بحق ہوئے

جب خونی فسادات پورے کرم میں پھیل گئے تو ہنگو سے شیعہ اور سنی عمائدین کا جرگہ بلایا گیا اور اس طرح (دونوں فرقوں کے درمیان) پاراچنار میں جنگ بندی ممکن ہوئی۔ جنگ ضرور بند ہو گئی مگر علاقے کے باشندوں کو 45 روز تک کرفیو کا سامنا کرنا پڑا۔ حالات میں ٹھہراؤ آنے کے بعد بھی علاقے میں چھوٹے چھوٹے جھگڑے چلتے رہے۔ کبھی راہداری سڑکیں بند کر دی جاتیں اور کبھی مختلف شیعہ و سنی افراد کو ان کے اپنے گاؤں سے پکڑ لیا جاتا رہا۔

اسی قسم کے بدامنی اور شدت پسندی کے واقعات پاراچنار میں بھی 2008 میں ہوتے رہے اور تاحال بھی جاری ہیں۔ بعض راستے آج بھی بند ہیں اور اب کرم میں منگل جیسے سنی قبائل اپنے علاقے میں محصور ہیں کیونکہ (کرم اور ہنگو کو ملانے والی) ٹل پاراچنار روڈ طالبان جنگجوؤں نے بلاک کر رکھی ہے اور شیعہ علاقوں کے متبادل راستے وہ بوجہ ڈر اور خوف کے مارے استعمال نہیں کر سکتے۔ 2007ء اور 2010ء کے دوران ہونے والے فسادات میں چھ سو لوگوں کو موت کا سامنا کرنا پڑا۔

کرم میں بیرونی طالبان گروپس کا کردار

تحریک طالبان پاکستان

کرم میں محاذ آرائی کی دوسری وجہ 2006ء کے شروع میں شمالی اور جنوبی وزیرستان کے محسود اور وزیر قبائل کے طالبان کی آمد و رفت تھی۔ 2005-6ء کے دوران حکومت اور وزیرستانی قبائل کے درمیان ہونے والے متعدد ناکام معاہدوں کے بعد عسکریت پسندوں نے دعویٰ کیا کہ افغانستان میں داخلے کے لیے انہیں وزیرستان کی سرحد استعمال کرنے دی جائے کیونکہ انہیں سرحد

پار مسلوں اور جنگ کے لیے مجبوراً کرم کے راستوں کو استعمال کرنا پڑ رہا ہے۔ شیعہ طوری قبائل نے اس راستوں کو قطعاً کوئی اہمیت نہیں دی، اور طالبان کے ہاتھوں اپنے علاقے کے استعمال کے خلاف بھرپور احتجاج کیا۔

کرم میں جیو کے ایک مقامی نمائندے کے مطابق تحریک طالبان پاکستان کے ڈپٹی کمانڈر ولی الرحمان نے ان شیعہ قبائل کو اگست 2008ء میں پیش کش کی کہ اگر شیعہ افغانستان کی جانب جانے والے راستوں کو طالبان کے لیے کھلا رہنے دیں تو طالبان انھیں فاٹا میں ہر جگہ سفر کرنے دیں گے اور یہی نہیں بلکہ دوران سفر انھیں مکمل تحفظ بھی فراہم کریں گے۔ طوریوں نے یہ پیش کش مسترد کر دی۔ ان کا خیال تھا کہ طالبان بلاوجہ پاک فوج کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں۔ انھیں یہ بھی شک تھا کہ طالبان ان کے علاقے پر قبضہ کر لیں گے۔ اپنی پیش کش کے مسترد ہونے پر ولی الرحمان کو سخت غصہ آیا اور طالبان کی سرگرمیاں بہرحال آج بھی اسی طرح جاری ہیں۔

کرم میں فرقہ وارانہ محاذ آرائی بڑھنے کے ساتھ ساتھ شمالی اور جنوبی وزیرستان کے طالبان نے شیعوں سے لڑنے کے لیے کرم، شمالی وزیرستان سرحد کو بطور راستہ بنایا۔ وزیرستانی طالبان تو پہلے ہی کرم کے شیعوں پر تپے بیٹھے تھے کیونکہ انھوں نے افغانستان پر ان کے حملوں کے لیے کرم کو لانچنگ پیڈ بنانے سے انکار کر دیا تھا۔ فرقہ وارانہ محاذ آرائی نے انھیں کرم پر حملہ کرنے کا ایک اور مناسب بہانہ مہیا کر دیا۔

وزیرستانی طالبان کا پہلا لشکر (اکتوبر 2007ء میں) تحریک طالبان کے بانی بیت اللہ محسود نے کرم بھیجا۔ جس کی کمان تحریک طالبان کا ڈپٹی لیڈر اور منہ زور شیعہ مخالف قاری حسین کر رہا تھا۔ لگ بھگ چار سو محسود، وزیر جنگجو باشت خیل، سنگینہ، صدہ، بگن، رگی اور علی زئی کے دیہات میں شیعوں پر حملہ آور ہوئے۔ انھوں نے گاؤں کے گاؤں جلا کر راکھ کر دیے اور درجنوں شیعہ افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ دو ماہ بعد قاری حسین جنوبی وزیرستان واپس لوٹا تو تحریک طالبان کے حکیم اللہ محسود نے سینکڑوں مزید لڑاکے کرم بھیج دیے۔ یہ لوگ اس لیے آئے تھے کہ بعض علاقوں میں سنیوں کی تعداد شیعوں کے مقابلے میں بڑھ گئی۔

حکیم اللہ محسود نے اپریل 2008ء میں فقیر عالم محسود کو کرم میں محسود طالبان کا امیر مقرر کر دیا تاکہ اس کی اپنی ذمہ داریوں کا بوجھ کم ہو سکے۔ حزبی قبیلے کا فقیر عالم جو اس وقت بمشکل پچیس سال کا تھا، اپنی سفاکی اور بربریت کے باعث خاصا مشہور تھا۔ اس کی امارت میں رہنے والے طالبان کے مطابق، اس نے کرم کے ستر شیعہ باشندوں کو اپنے ہاتھوں سے ذبح کیا۔ بعض ایسے کی

اور وہ بھی اس کے ہاتھوں مارے گئے جن پر شیعوں سے معاونت کا الزام تھا۔ ایک سال کے بعد فقیر عالم کو محسود طالبان کی سربراہی سے ہٹا دیا گیا کیونکہ اس کے بعض سابقہ کمانڈروں کا خیال تھا کہ وہ ذہنی توازن کھو بیٹھا ہے چنانچہ اسے بعد میں پشاور کے ایک اسپتال میں زیر علاج رکھا گیا۔ اپریل 2009ء میں حکیم اللہ محسود نے کرم میں دوبارہ محسود طالبان کی کمان سنبھالی اور قریشی اورکزئی ایجنسی سے سینکڑوں جنگجو طالبان کو اپنے ہمراہ کرم میں لے آیا تاکہ وہ جاری فرقہ وارانہ فسادات میں شریک ہو سکیں۔

طالبان سے متعلق ایک فساد کے دوران تیس کے قریب جنگجو کرم کے مرکزی شہر صدہ کی جیل سے فرار ہو گئے اور صرف ایک دن بعد انھوں نے امدادی سامان لانے والے ایک قافلے پر حملہ کر دیا جو فرنٹیئر کور کی جانب سے صدہ بازار کے لیے بھیجا گیا تھا۔ فرار ہونے والے قیدیوں نے سینکڑوں وزیرستانی طالبان اور لوکل سنیوں کے ساتھ مل کر ان سارے ٹرکوں کا سامان لوٹ لیا اور ٹرکوں کو آگ لگا کر جلا ڈالا۔ یہ امدادی سامان شیعوں کے اہم مرکز پاراچنار بھیجا جا رہا تھا۔ چند شیعہ ڈرائیور اغوا کر لیے گئے۔

ان میں سے اٹھارہ سالہ ایک لڑکا ہی اپنی جان بچا سکا کیونکہ اس نے انھیں اپنے سنی ہونے کا یقین دلایا تھا۔ باقی سب ڈرائیوروں کے سر قلم کر دیے گئے۔ فرنٹیئر کور کے دستے جو اس امدادی سامان کو بحفاظت منزل تک پہنچانے کے ذمہ دار تھے، طالبان اور مقامی سنیوں کو اس لوٹ مار سے روک نہیں سکے۔ ممکن ہے وہ انھیں روکنا ہی نہ چاہتے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان میں انھیں روکنے کی صلاحیت ہی نہ ہو۔ حیرت ہے کہ پہلے امدادی سامان لے جانے والے گن شپ ہیلی کاپٹر نے جب طالبان جنگجوؤں پر فائرنگ کی تو اس سے کوئی بھی زخمی نہیں ہوا۔

صدہ، بگن اور درہ آدم خیل کی تمام سڑکیں طالبان نے بلاک کر رکھی ہیں جہاں وہ باقاعدہ شیعہ سواریوں کو چیک کرتے ہیں اور بعض اوقات انھیں مار بھی ڈالتے ہیں۔ کوئی مدد یا رسد کرم کے بہت سے علاقوں تک پہنچ ہی نہیں سکتی۔

اورکزئی طالبان

گزشتہ تین سالوں میں اورکزئی طالبان نے بھی کرم کے فرقہ وارانہ فسادات میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اگست 2009ء میں تحریک طالبان کے سربراہ بیت اللہ محسود کی موت کے بعد حکیم اللہ محسود کو طالبان کا مرکزی امیر بنا دیا گیا اور اس نے ملا نور جمال کو کرم میں بھیج دیا۔ ملا نور جمال طوفان کے نام سے مشہور ہے اور انتہائی سفاک شیعہ مخالف لیڈروں میں سے ہے پہلے وہ

اورکزئی کے علاقے ماموزئی کے مقامی مدرسے میں پڑھایا کرتا تھا۔ پہلے اورکزئی میں اور بعد میں کرم میں ڈپٹی لیڈر کی حیثیت سے، کرم کے مرکزی شہر پاراچنار کو، جہاں حالیہ سالوں میں شیعہ فرقے نے خود کو مرتکز کیا ہے، مکمل طور پر بلاک کر دیا ہے۔

آفریدی طالبان

2008ء میں خیبر کے علاقے کے منگل باغ (لشکر اسلام) اور حاجی محبوب (انصار الاسلام) نے شیعوں کو نشانہ بنانے کے لیے سینکڑوں آفریدی جنگجو کرم بھیجے۔ کرم کے ان فسادات میں منگل باغ کے لڑاکوں کی قیادت عبدالواحد کر رہا تھا جو آج کل خیبر میں نائب کے طور پر کام کر رہا ہے۔ اس تصادم میں درجنوں شیعہ اور سنی جنگجو مارے گئے۔ بالآخر ستمبر 2009ء میں آفریدی واپس خیبر کی جانب پسپا ہو گئے۔ تاہم اب بھی کرم کے گردونواح میں اکا دکا جنگجو موجود ہیں۔ کوہاٹ کے سرحدی علاقے سے بھی آفریدی طارق آفریدی کی قیادت میں کرم آ کر بس گئے تاکہ شیعہ مخالف فسادات جاری رکھے جا سکیں۔ یاد رہے طارق آفریدی درہ آدم خیل میں تحریک طالبان کا سربراہ ہے۔

طالبان کے مابین اختلافات

شمالی، جنوبی وزیرستان اور اورکزئی سے آنے والے طالبان جنگجو مرکزی اور زیریں کرم میں جنگی طاقتور پوزیشن میں ہیں کیونکہ یہ علاقے سنی اکثریت کے ہیں۔ 2010ء کی ابتدا میں طالبان کے مقرر کردہ رہنما ملا طوفان اور کرم ریجن میں واقع صدا کے کمانڈر رفیق منگل کے بڑا دستوں کے درمیان کئی خطرناک تصادم ہوئے۔ وجہ یہ تھی کہ ملا طوفان نے فروری 2010ء میں رفیق کو تاوان کے لیے اغوا کی واردات میں کرنے سے روکا کیونکہ اس سے مقامی آبادی میں طالبان کی شہرت کو نقصان پہنچ رہا تھا مگر رفیق منگل نے اس کی بات ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ اس تصادم میں دونوں طرف کے طالبان نے ہلکا اور بھاری اسلحہ استعمال کیا۔ اس میں پچیس طالبان ہلاک ہوئے تاہم رفیق منگل کو ملا طوفان کے لڑاکوں نے پکڑ لیا اور غالباً وہ اب بھی انہی کی تحویل میں ہے۔

وزیرستانی، آفریدی اور اورکزئی طالبان کی کرم میں موجودگی سے مقامی سنی بہت پریشان ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ یہ جنگجو ان کے علاقے سے نکل جائیں اور کرم کے شیعہ سنی لوگوں کو اپنے اختلافات خود ہی حل کرنے دیں۔ مثلاً مارچ 2010ء کے وسط میں ملا طوفان کے دستوں نے شیعوں سے ہمدردی کے شبے میں صدہ کے دو باشندوں کو اغوا کرنے کی کوشش کی

تو مقامی لشکر نے ان پر براہ راست حملہ کر کے انھیں ناکام بنا دیا۔ ملا طوفان کے تیراکوں میں سے کم و بیش درجن بھر لوگ مارے گئے اور زخمی طالبان کو قید کر لیا گیا۔

مارچ 2010ء کے دوران ہی ملا طوفان کے دستوں نے دوبارہ مسوری کے لشکر پر حملہ کیا اور کئی گھنٹوں کی جنگ کے بعد لشکر اور اس کے قبائلی عمائدین نے طالبان سے شکست مان لی۔ اس تصادم میں دونوں اطراف کے 30 لوگ مارے گئے۔ قبائلی لشکر نے طالبان کی وفاداری کا عہد کیا اور بعض ضمانتوں کے بعد ملا طوفان نے 22 قیدی لشکریوں کو رہا کر دیا۔

کرم کی جنگ جو پاکستانی طالبان اور کوئٹہ کے شوریٰ طالبان کے مابین آپریشنل تعلق کو واضح ہے تاہم جنوبی وزیرستانی تحریک طالبان پاکستان کے رہنماؤں کا کہنا ہے کہ وہ ملا عمر کو تحریک کا امیر سمجھتے ہیں اور ان سے عقیدت رکھتے ہیں

کرم میں فرقہ پرست جنگجو گروہیں

شیعہ گروہیں۔ کرم میں شیعہ کمیونٹی کے دو بڑے گروہیں ہیں لیکن وہ پاکستان، امریکہ یا نیٹو افواج کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرتے ان کی تمام تر توجہ شیعہ مفادات کے تحفظ پر مرکوز رہتی ہے کرم کے شیعہ ان بڑے گروہوں کے نام کو خفیہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں تاہم ان کی مختصر تفصیل کچھ یوں ہے۔

کرم حزب اللہ:

حزب اللہ کے پیروکار نظریاتی طور پر ایران سے متاثر ہیں اور پاراچنار میں خاصے سرگرم ہیں۔ زکوٰۃ و خیرات اور خمس کے تمام تر حصے ایران بھیجتے ہیں تاہم یہ ایک چھوٹا سا گروپ ہے۔

مہدی ملیشیا:

مہدی ملیشیا کے اراکین ایجنسی کے تقریباً تمام علاقوں میں ہیں۔ یہ گروپ عراق کے مقتدیٰ الصدر سے متاثر ہے اور اپنے نظریات میں خاصا قدامت پرست اور سخت ہے۔ یہ گروپ کرم حزب اللہ کی نسبت کہیں زیادہ طاقتور ہے۔

سنی گروہیں۔

کرم کے سنی کسی خاص جنگی گروپ کی شکل میں منظم نہیں ہیں تاہم جب ضرورت ہو، شیعوں سے لڑنے کے لیے وہ قبائلی لشکر ترتیب دے دیتے ہیں... کسی صورت میں انھیں پاکستانی طالبان خیبر کے لشکر اسلام اور انصار الاسلام کی مکمل مدد حاصل ہوتی ہے۔ بہت سے سنی جنگجو طالبان 2009ء کی خزاں کے دوران پاکستانی فوج کے حملے سے بچنے کے لیے وزیرستان سے

مرکزی اور زیریں کرم کی طرف بھاگ گئے تھے۔ سپاہ صحابہ پاکستان جو ملک بھر میں شیعہ مخالف کارروائیوں کے لیے مشہور ہے، کرم میں بھی سرگرم ہے تاہم ملک کے دوسرے علاقوں کی نسبت یہاں وہ زیادہ معروف نہیں۔

کرم کے سب ڈویژن اور قبائل

کرم بالا۔ یہ کرم ایجنسی کا سب سے زیادہ آبادی والا علاقہ ہے۔ یہاں طوری اور بنگش قبائل کی کثرت ہے۔ اس سب ڈویژن میں کرمان، زیاران، شلوزان، پیوار (Peawar) اور طوری منگل کے علاقے شامل ہیں۔ یہاں طوری قبیلہ وہ واحد پختون قبیلہ ہے جو پورے کا پورا شیعہ مسلک کا حامل ہے۔ بنگش قبیلے کے آدھے لوگ شیعہ اور آدھے سنی ہیں۔ منگل اور مقبل جیسے کچھ چھوٹے چھوٹے سنی قبائل بھی کرم بالا میں آباد ہیں۔ ایجنسی کا انتظامی مرکز پاراچنار بھی یہیں واقع ہے۔ اور پاکستان کے قیام کے بعد فاٹا میں قائم ہونے والا پہلا کالج بھی یہیں واقع ہے۔ پاراچنار میں تعلیم کی سطح کسی بھی پاکستانی علاقے سے کم نہیں۔ یہاں سو سے زائد ہائی اسکول، دو تین کالج اور ایک کامرس کالج بھی موجود ہیں۔ پورے فاٹا کے برعکس پاراچنار میں سینکڑوں مسیحی خاندان بھی رہائش پذیر ہیں، سرکاری دفتروں میں صفائی ستھرائی کا کام یہی لوگ کرتے ہیں۔

مرکزی کرم

یہاں پاراچمکنی، اوڑی زئی، علی شیرزئی، مسوزئی، مقبل، خوئی خیل اور رستم خیل کے سنی قبیلوں کی آبادی ہے۔ پہلے یہ "سرحدی علاقہ" کہلاتا تھا۔ لیکن 2004ء میں سرحد کے گورنر افتخار حسین شاہ نے اس کا نام بدل کر مرکزی کرم رکھ دیا۔ اس کا انتظامی ہیڈکوارٹر "صدہ" دراصل کرم زیریں میں واقع ہے کیونکہ مرکزی کرم میں تاریخی طور پر حکومتی رٹ ہمیشہ ہی کمزور رہی ہے۔ مرکزی کرم کے باشندے اپنے جھگڑے نمٹانے کے لیے سرکاری عدالتی نظام کے بجائے مقامی جرگوں سے رجوع کرنا پسند کرتے ہیں۔ ایجنسی کا سب سے پس ماندہ علاقہ بھی یہی ہے۔ لوگ جاہل ہیں۔ تعلیمی ادارے نہ ہونے کے برابر ہیں اور کسی قسم کا سماجی اور معاشی ڈھانچہ موجود ہی نہیں۔ ماضی میں یہاں کے لوگ ہسپتال اور سڑکیں بنانے کی حکومتی کوششوں کے خلاف باقاعدہ مزاحمت کرتے تھے۔ وہ اسے اپنی آزادی پر حملہ تصور کرتے تھے لیکن اب مقامی لوگ ترقیاتی کاموں کا مطالبہ کرنے لگے ہیں اور حکومت علاقے کو جدید بنانے کے لیے بہت سی سڑکوں اور اسپتالوں کی تعمیر کے منصوبوں کی منظوری دے چکی ہے۔

حشیش اور ہتھیاروں کے حوالے سے بھی مرکزی کرم کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ گرچہ

2003ء میں حشیش کی کاشت بالکل ختم کر دی گئی تھی تاہم گزشتہ کئی سالوں سے مرکزی کرم کے علاقوں میں دوبارہ یہ کاشت شروع کر دی گئی ہے۔ جہاں تک ہتھیاروں اور گولہ بارود کا تعلق ہے۔ کوہاٹ کے درہ آدم خیل کے بعد یہاں ڈرگ مارکیٹ کا نمبر آتا ہے۔ ہتھیاروں کی خرید و فروخت کے علاوہ یہاں چھوٹے ہتھیار بنائے بھی جاتے ہیں۔

کرم زیریں:

دریائے کرم کی وجہ سے یہ سارا علاقہ انتہائی سرسبز اور زرخیز ہے۔ صدہ اس کا مرکزی شہر ہے۔ فرقہ وارانہ تصادم کی زد میں آنے سے پہلے، مقامی لوگ اخروٹ، بادام، گندم، مکئی، چاول اور مختلف پھل اور سبزیاں کاشت کرتے تھے۔ یہ سب چیزیں پشاور اور لاہور کی منڈیوں میں بھیجی جاتی تھیں۔

یہاں زیادہ تر بنگش قبیلے کے لوگ آباد ہیں۔ ان میں سنی بھی ہیں اور شیعہ بھی لیکن ساتھ ہی منگل، جاجی اور مقبل قبائل بھی یہاں رہتے ہیں۔ 2007ء کے موسم گرما کے بعد سے یہاں کی زیادہ تر شیعہ آبادی کو کرم بالا منتقل ہونے پر مجبور کر دیا گیا۔ اسی طرح پاڑہ چنار کے سنی باشندوں کو بھی فسادات کی شدت بڑھنے کے بعد کرم زیریں ہجرت کرنا پڑی۔

کرم میں امن کے لیے کام کرنے والے قبائلی عمائدین

گو شیعہ سنی تصادم کے خاتمے کی کوششیں تاحال کامیاب نہیں ہو پائیں مگر درج ذیل عمائدین اس سلسلے میں مسلسل مصروف کار ہیں۔

شیعہ لیڈرز

( ) علامہ محمد نواز خطیب جامع مسجد (پاراچنار کی مرکزی شیعہ مسجد)۔ (۲) علامہ سید عابد حسین پرنسپل پاڑہ چنار مدرسہ۔ (۳) کیپٹن (ر) حاجی محمد یوسف، سیکرٹری جنرل، انجمن حسینیہ (پاڑہ چنار کی شیعہ سیاسی تنظیم)

سنی لیڈرز

( ) حاجی بخت جمال، صدر انجمن فاروقیہ۔ (کرم کی سنی سیاسی تنظیم)۔ (۲) میر رسال ایڈووکیٹ، سابقہ سیکرٹری انجمن فاروقیہ۔ (۳) عید نظر منگل (قبائلی بزرگ)

آبادی کے مسائل اور مشکلات:

کرم میں 2007ء کے حالیہ فسادات پھوٹ پڑنے کے بعد سے حکومت پاکستان نے

انھیں روکنے یا ختم کرنے کے لیے کوئی خاص کوشش نہیں کی۔ زیادہ تر علاقے میں فوج محض خاموش تماشائی بنی رہی اور طالبان ہی قبائلی لشکروں سے ٹکراتے رہے اور شیعہ سنی دونوں اطراف کے لوگوں کو بری طرح ذبح کرتے رہے۔ شیعہ کمیونٹی حکومت کو مورد الزام ٹھہراتی ہے کہ وہ ان کے تحفظ میں ناکام رہی ہے اور اس نے طالبان جنگجوؤں اور سنیوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ معاشی گروہ بندی بھی شیعوں کے لیے ایک بڑا مسئلہ ہے۔ پاکستان بھر میں (تین ہزار روپے میں 35 ڈالر میں) بکنے والے آٹے کی بوری یہاں دس ہزار روپے یعنی 120 ڈالر میں فروخت ہو رہی ہے۔ اور بہت سے مقامی حکومتی ملازمین کو کئی سال سے تنخواہ نہیں ملی۔

شیعہ کمیونٹی کا الزام ہے کہ حکومت جان بوجھ کر کرم کے حالات کو ٹھیک نہیں کر رہی۔ اس سلسلے میں وہ سابقہ پولیٹیکل ایجنٹ صیم جان کی تقاریر کو ثبوت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ جس نے دسمبر 2006ء میں کہا تھا کہ مارچ 2007ء میں کرم میں صورت حال اور زیادہ خراب ہو جائے گی اور فسادات پوری ایجنسی کو اپنی گرفت میں لے لیں گے۔ مارچ 2007ء کو (دریائے کرم کی تباہ کن طغیانی کے فوراً بعد ایک دورے میں) اس وقت کے گورنر علی محمد جان اورکزئی نے کہا تھا کہ ایجنسی کو ابھی اور بھی بہت سے مسائل کا سامنا کرنا ہے اور مقامی لوگوں کو اس کے لیے تیار رہنا چاہیے ظاہر ہے دونوں سرکاری رہنما مقامی لوگوں کو وہی کچھ بتا رہے تھے، جس کی اطلاعات انھیں سرکاری ذرائع سے مل رہی تھیں۔

سنیوں کے محاصرے کی وجہ سے کرم سے نکلنے کے خواہاں شیعوں کے پاس تین آپشنز ہیں (۱) سرحد پار کر کے افغانستان جائیں اور وہاں سے خیبر کے راستے پشاور آئیں۔ سرحد کا دارالحکومت ہونے کی وجہ سے یہاں تک رسائی زیادہ مشکل نہیں۔ (۲) فوجی قافلوں کے ساتھ سفر کیا جائے مگر یہ بہت خطرناک ہے کیونکہ فوجی قافلے مسلسل سنی طالبان کے نشانے پر رہتے ہیں یا پھر (۳) ہوائی جہاز کے ذریعے وہاں سے نکلیں لیکن فی ٹکٹ پر چارہ آتا ہے یا وہاں سے نکلنے کے لیے کئی گنا کرایہ لیتے ہیں۔

فرنٹیئر کور کے کمانڈر جو صیف احمد کی کارروائیوں سے البتہ شیعہ کمیونٹی کافی مطمئن دکھائی دیتی ہے۔ جس نے ستمبر 2009ء سے اب تک کرم میں ستر سے زیادہ طالبان کو گرفتار کیا ہے، سو سے زیادہ طالبان کو مار ڈالا گیا۔ ایف سی کمانڈر نے طالبان کے کئی مضبوط مراکز کو ختم کر دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وزیرستان اور اورکزئی طالبان کے زیر استعمال راستوں پر (کرم میں آنے جانے والے) سکیورٹی فورسز کا مکمل کنٹرول ہو گیا ہے۔

سنیوں کا کہنا ہے کہ شیعہ سنی تصادم کے دوران حکومت انھیں کوئی مدد نہیں دیتی۔ مثلاً

2010ء مارچ کے تصادم کے مصداق سنی لیڈر اس بات پر خاصے ناراض تھے کہ فرنٹیئر کور اور فوج قریب ہی موجود ہونے کے باوجود ان کی مدد کو نہیں آئے۔ وہ حالیہ سالوں کے دوران مسلسل راہ بند ہونے کی وجہ سے بھی بہت پریشان ہیں۔ پاراچنار سے نکالے جانے والے سنی گروہوں صدہ اور مرکزی کرم کے علاقوں میں پناہ گزین بن کر رہنے پر مجبور ہیں اور منگل کا سنی قبیلہ کرم بالا میں نقل و حرکت کے لیے پریشانیوں کا شکار ہوتا ہے کیونکہ اسے پاکستان میں کہیں بھی جانے کے لیے شیعہ علاقوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

طالبان لڑاکوں سے شیعہ اور سنی دونوں ہی تنگ ہیں۔ شروع شروع میں سنی آبادی نے ان کا خاصا خیر مقدم کیا تھا۔ لیکن طالبان کے ہاتھوں سر قلم کیے جانے، ٹارگٹ قتل و غارت اور اغوا برائے تاوان کی وارداتوں کی وجہ سے دونوں فرقے ہی پاکستانی طالبان کی موجودگی اور پاکستانی فوج کی غیر موثر کارکردگی کے ہاتھوں بری طرح تنگ آئے ہوئے ہیں۔

منصور خان محسود اسلام آباد میں قائم تھنک ٹینک فاٹا ریسرچ سنٹر میں ریسرچ کوآرڈینیٹر ہیں ان کا تعلق جنوبی وزیرستان کے محسود قبیلے سے ہے۔ اور کئی این جی اوز کے ساتھ کام کرتے رہے ہیں۔

شمالی وزیرستان میں محاذ آرائی اور عسکریت پسندی

آنند گوپال، منصور خان محسود[1] اور برائن فش مین

فاٹا میں آج جہادی عسکریت پسندی کا اہم ترین مرکز شمالی وزیرستان ہے۔ وہ عرصے سے بلاخوف وخطر پوری ایجنسی میں کارروائیاں کرتے پھرتے ہیں۔ دوسرے علاقوں میں پاکستان مخالف گروہوں کا پوری قوت سے قلع قمع کرنے والی پاکستانی فوج نے بھی شمالی وزیرستان کے عسکریت پسندوں کی سرگرمیوں کو زیادہ تر نظرانداز کیا ہے۔

پاکستان کے زیرِ انتظام قبائلی علاقوں میں شمالی وزیرستان دوسرا سب سے بڑا علاقہ ہے اور ساتھ ہی ساتھ کئی عشروں سے افغانستان میں دراندازی اور شدت پسند کارروائیوں کے لیے انتہائی اہم مرکز بھی ہے۔ حقانی گروپ ایجنسی کا اہم ترین عسکریت پسند گروپ ہے۔ مشہور افغان مجاہد (کمانڈر) جلال الدین حقانی نے آبائی صوبہ خوست چھوڑ کر (1970ء کے عشرے میں) شمالی وزیرستان، میران شاہ میں آ بسا تھا۔ اس کا بیٹا سراج الدین اسی علاقے میں پلا بڑھا۔ 1980ء کے عشرے میں مشرقی افغانستان میں جلال الدین نے اہم ترین مجاہدین کمانڈر کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ سراج الدین آج کل اپنے والد کے قائم کردہ نیٹ ورک کو سنبھالے ہوئے ہے۔ اور اسے افغانستان میں امریکی اور نیٹو فورسز کے خلاف شدت پسند کارروائیوں میں استعمال کرتا ہے۔ اپنے والد کی طرح سراج الدین بھی شمالی وزیرستان کو جنگجوؤں کی بھرتی، پناہ گاہ اور Strategic Depth کے لیے استعمال کرتا ہے۔ شمالی وزیرستان جغرافیائی طور پر الگ تھلگ ہونے، مشکل رستوں اور قبائلی عسکریت پسندوں کے نسبتاً مضبوط اتحاد کی بدولت اس قسم کے مقاصد کے لیے بہترین جگہ ہے۔

حقانی نیٹ ورک کے علاوہ، شمالی وزیرستان میں سب سے بڑا عسکریت پسند اتحاد عثمان زئی وزیروں کے مداخیل قبیلے کے حافظ گل بہادر کی سربراہی میں قائم ہے۔ حقانی گروپ کی طرح ان کی کوئی خاص جنگی تاریخ نہیں تاہم ایک لحاظ سے ان کی بے پناہ اہمیت ہے۔ میران شاہ اور افغان سرحد کے درمیان پھیلا ہوا اسٹریٹیجک پہاڑی علاقہ مداخیل قبیلے کا ہے۔ عسکریت پسندوں پر انھیں بھی اہم سٹریٹجک برتری حاصل ہے کیونکہ افغانستان جانے کے لیے انھیں اسی علاقے سے گزرنا پڑتا ہے۔ بہادر کا نائب مولانا صادق نور داوڑ (Daur) قبیلے سے ہے اور وزیر اور داوڑ قبیلوں کا مشترکہ

امیر بھی ہے۔ صادق نور حقانیوں کے خاصا قریب ہے اور بہادر بھی۔ علاقے میں پاکستانی دستوں پر حملہ کرنے سے گریز کرتا ہے اور مشکل معاملات میں حقانی نیٹ ورک کی ہدایت کی پیروی کرتا ہے۔

امریکی یا پاکستانی فوجی آپریشنوں کے دوران بچ نکلنے والے عسکریت پسندوں کے لیے شمالی وزیرستان انتہائی محفوظ پناہ گاہ رہا ہے۔ 2001ء ایک میں افغانستان میں طالبان حکومت کے خاتمے کے فوراً بعد طالبان حکومت سے متعلقہ ہزاروں طالبان نے شمالی وزیرستان کا رخ کیا۔ ان میں سے بہت سوں نے ایجنسی کے انتہائی پر پیچ اور گھنے جنگلات والے علاقے شوال وادی میں پناہ لی۔ بعد میں یہ علاقہ القاعدہ سمیت ہر طرح کے غیر ملکی عسکریت پسندوں کی پناہ گاہ بن گیا۔ پاکستانی حکومت جنوبی وزیرستان سمیت ملک کی دوسری پناہ گاہوں کو بار بار نشانہ بنا چکی ہے۔ 2004ء میں عسکریت پسندوں کی ایک بڑی تعداد نے جنوبی وزیرستان کی شکئی وادی سے نکالے جانے کے بعد شمالی وزیرستان کا ہی رخ کیا تھا۔ حال ہی میں جنوبی وزیرستان کے محسود قبائل سے متعلق بہت سے عسکریت پسندوں کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ انہوں نے بھی شمالی وزیرستان ہی میں پناہ لی ہوگی۔

شمالی وزیرستان کے حقائق

شمالی وزیرستان 4707 کلومیٹر (817 مربع میل) پر مشتمل پہاڑی علاقہ ہے اور اس کی مغربی اطراف براہ راست افغانستان سے متصل ہیں۔ اس کا سب سے بڑا شہر اور دارالحکومت میران شاہ ہے۔ 1947ء میں قیام پاکستان کے وقت سے پاکستان میں شامل کیا گیا تھا۔ میران شاہ، میر علی، دتہ خیل اور رزمک اس کے بڑے شہر ہیں۔ ان کے زیادہ تر باشندے پختون ہیں اور ان کا تعلق وزیر اور داوڑ قبیلوں سے ہے۔ دتہ خیل اور رزمک سمیت تیسرے جیسے پہاڑی علاقوں، شمالی اضلاع کے میدان سے ٹوچی کی وادی اور کرم کے دریائی حصے میں رہتے وزیریوں کی اکثریت ہے جبکہ داوڑ قبائل میدانی علاقوں پر قابض ہیں جہاں انہیں بالائی داوڑ (میران شاہ کے قریب رہتے ہیں) کے برعکس زیریں داوڑ Daur کے نام سے جانا جاتا ہے

شمالی وزیرستان تین سب ڈویژنز اور نو تحصیلوں پر مشتمل ہے۔ میران شاہ، غلام خان اور دتہ خیل تحصیلیں میران شاہ سب ڈویژن میں شامل ہیں۔ میر علی سب ڈویژن میں میر علی، سپین وام اور شیوا نامی تحصیلیں ہیں۔ اسی طرح رزمک سب ڈویژن رزمک، دوسالی اور گڑیوم تحصیلوں پر مشتمل ہے۔ شمالی وزیرستان کے عسکریت پسند، جنوبی وزیرستان میں اپنے نظریاتی ساتھیوں کی نسبت زیادہ گروہی اختلافات کا شکار نہیں۔ مخصوص قبائلی گروہ بندی سے انہوں نے حتی الامکان بچنے کی کوشش کی ہے۔ پھر بھی شمالی وزیرستان (کے عسکریت پسندوں) کی بعض گروہ بندیاں خاصی اہم

ہیں۔ مثلاً ایک جنگجو گروہ کا سردار رسول خان جس کی بہادر خان کے ہم کرہ رہ چکا بھائی
برہم ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ خان ازبک جنگجوؤں کی حمایت کرتا ہے جبکہ اکثر لوگوں سے
بہت سے پاکستانی عسکریت پسند سخت نالاں ہیں۔ دوسری جانب خان کی کارروائیوں میں غیر مقامی
عناصر کا عمل دخل زیادہ لگتا ہے اور وہ اپنے مقاصد کے لیے زیادہ آزادی سے کام کرنا چاہتا ہے۔
اسی طرح ابو کاشا العراقی کے سربراہی میں غیر ملکی اور مقامی جنگجوؤں کا گروپ بہادر کے چیف
کمانڈر صادق نور سے ٹکراتا رہتا ہے کیونکہ صادق نور ابو کاشا گروپ کی غیر ملکی قیادت کے خلاف
مسلسل مزاحم ہے فاٹا کے دوسرے حصوں کی طرح یہاں بھی اہم ترین محوری اختلاف عرب اور
وسطی ایشیائی جنگجوؤں کے کردار اور افغانستان میں امریکی اور نیٹو افواج کے ساتھ ساتھ پاکستانی
مفادوں پر حملے سے متعلق ہے۔

اگرچہ یہ جھگڑے قبائلی نوعیت کے نہیں تاہم عسکریت پسندوں کے مابین ان جھگڑوں میں
مقامی جغرافیائی عنصر شامل ہے۔ میراں شاہ کا مغربی علاقہ بہادر کا مرکز ہے جبکہ اس کے مخالف
عسکریت پسند میر علی میں اور اس کے گرد و نواح میں کارروائیاں کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ علاقہ
افغانستان کی سرحد سے دور واقع ہے۔ شمالی وزیرستان میں عسکریت پسندوں کے مابین صلح جوئی
کے سلسلے میں حقانی گروپ کا بہت اہم رول ہے۔ جلال الدین اور سراج الدین دونوں رہنماؤں کا
اس علاقے میں بے پناہ احترام کیا جاتا ہے۔ اور نوجوان حقانی نے پچھلے پانچ سال کے دوران کئی
بار مقامی عسکریت پسندوں کے درمیان پیدا شدہ جھگڑے ختم کرائے ہیں۔ افغانستان میں کی
جانے والی حقانی گروپ کی جانب سے موثر کارروائیاں انھیں دوسرے عسکریت پسندوں سے
ممتاز کرتی ہیں۔ کیونکہ ان کے پاس سرحد پار سرگرمیوں کے لیے اچھا نیٹ ورک موجود ہے۔
مزید براں پاکستانی فوج اور خفیہ ایجنسیوں کے ساتھ حقانی کے طویل تعلقات کی وجہ سے وہ
پاکستانی حکومت اور عسکریت پسندوں کے درمیان بات چیت کا بھی موثر ذریعہ ہیں۔ اپنے ان
اختلافات کے باوجود عسکریت پسندوں کو یہ بھی علم ہے کہ ان کے اندرونی جھگڑے افغانستان میں
ان کی جدوجہد کو کمزور کر سکتے ہیں اور ساتھ ہی وہ پاکستانی فوج کے دباؤ کا بھی شکار ہو سکتے ہیں۔

شمالی وزیرستان میں فوجی آپریشن

2006ء کے امن معاہدوں سے پہلے اگرچہ پاکستانی فوج اور عسکریت پسندوں میں
چھوٹی موٹی مڈبھیڑ ہوتی تھی تاہم پاکستانی فوج نے شمالی وزیرستان میں عسکریت پسندوں کے
خلاف کوئی بڑا آپریشن نہیں کیا۔ دراصل یہاں فوج اور عسکریت پسندوں کے باہمی تعلقات

تھوڑے بہت تعاون پہنچتی ہیں۔ 2009ء میں کیے گئے ایک معاہدے کے مطابق طالبان کو فوجی چیک پوسٹوں پر تلاشی سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔ وہاں صرف طالبان اور غیروں کی تلاشی لی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ وزیرستان میں جہاں چاہیں، بآسانی آ جا اور اسلحہ منتقل کر سکتے ہیں۔ اس معاہدے میں کچھ اور شقیں بھی ہیں جن کا فائدہ طالبان کو ہوتا ہے۔ مثلاً شمالی وزیرستان میں چیک پوسٹوں پر موجود کام کرنے والے اہل کار اپنے ساتھ اسلحہ نہیں رکھیں گے۔ فاٹا میں ڈرون حملوں کا اہم مرکز شمالی وزیرستان رہا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ امریکی حکام یہاں برسرکار عسکریت پسندوں کو کتنی اہمیت دیتے ہیں۔ 2004ء سے 2007ء میں 53 حملوں میں سے 22 ڈرون حملے اسی علاقے پر کیے گئے۔ لیکن 17 اکتوبر کے بعد جنوبی وزیرستان میں پاکستانی فوج کی کارروائی کی وجہ سے ڈرون حملے روکے گئے تو شمالی وزیرستان میں ان حملوں میں زیادہ تیزی آ گئی۔ 31 مارچ 2004ء تک 27 سے 26 حملے صرف شمالی وزیرستان میں ہوئے۔ ان میں سے 13 حملے بھی شامل ہیں جو میران شاہ اور افغان سرحد کے درمیان بہادر کے پہاڑی مراکز پر کیے گئے۔

بغاوت کی گروہی شکل و صورت

میران شاہ میں قائم حقانی نیٹ ورک ان اہم ترین عسکریت پسند گروہوں میں سے ایک ہے جو افغانستان میں امریکی اور نیٹو افواج کے خلاف برسرِ پیکار ہیں۔ ان کی زیادہ تر کارروائیاں افغان صوبے پکتیا میں ہوتی ہیں پکتیا، دو حوست کی سرحدیں شمالی اور جنوبی وزیرستان کے ساتھ ملتی ہیں۔ حقانی نیٹ ورک ہوگار، وردک صوبوں کے ساتھ ساتھ کابل میں بھی اہمیت کا حامل ہے۔ سوویت مخالف جنگ کے بزرگ مجاہد رہنما جلال الدین نیٹ ورک کے کلی سربراہ ہیں تاہم روزمرہ کی فوجی ذمہ داریاں ان کے بیٹے سراج الدین ادا کرتے ہیں۔ 1980ء کے عشرے میں جلال الدین حقانی نے سوویت یونین کے خلاف جنگ میں انتہائی اہم، موثر اور ماہر مجاہدین رہنما کی حیثیت سے شہرت پائی تھی۔ ان دنوں انہوں نے پاکستانی آئی ایس آئی امریکی سی آئی اے اور علاقے میں برسرِ پیکار عسکریت پسندوں بشمول اسامہ بن لادن کے ساتھ قریبی تعلقات پیدا کر لیے تھے۔ افغانستان میں لڑنے کے باوجود شمالی وزیرستان جلال الدین کا مضبوط گڑھ رہا ہے۔ سوویت یونین کی حامی افغان حکومت کے خلاف بغاوت کرنے کا فیصلہ بھی 1978ء میں انہوں نے میران شاہ کی مسجد جو موسوم تھی منبع الجہاد میں افغان مہاجرین کی ایک میٹنگ میں کیا تھا۔ سوویت مخالف جہاد کے دوران، جلال الدین حزب اسلامی (یونس خالص گروپ) کے ساتھ کام کرتے رہے۔ اس طرح انہیں نہ صرف سیاسی پشت پناہی بلکہ مادی وسائل تک رسائی بھی ہوئی۔

گرچہ جلال الدین تعلیم یافتہ تھے مگر بنیادی طور پر وہ فوجی کمانڈر تھے۔ 991ء میں اپنی زندگی کی اہم ترین کامیابی اس وقت حاصل کی جب انہوں نے سوویت یونین کے نکل جانے کے بعد کابل میں قائم حکومت کے قبضے سے خوست آزاد کرایا۔

1990ء کے عشرے کے وسط میں جب طالبان متحرک ہوئے تو غالباً آئی ایس آئی کے دباؤ کی وجہ سے انہوں نے طالبان کی قیادت قبول کرلی اور ان کی حکومت میں سرحدی اور قبائلی امور کے وزیر بن گئے لیکن عملاً انہوں نے اور ان کے ساتھیوں نے کبھی طالبان کی بالادستی نہیں مانی۔ خصوصاً لویا پکتیا کے علاقوں میں وہ طالبان اتحادی ہونے کے باوجود بہت حد تک آزاد رہے۔

200ء میں افغانستان پر امریکی حملے کے بعد جلال الدین اور ان کے ساتھی میران شاہ واپس لوٹ آئے۔ 1970ء کے عشرے کے وسط میں پیدا شدہ خطرات سامنے دیکھ کر بھی انہوں نے میران شاہ میں ہی پناہ لی تھی۔ میران شاہ میں جلال الدین کی اہمیت خاصی اہم جگہ ہے۔ خاص طور سے ان کے زیر انتظام مدرسے قابل ذکر ہیں جہاں (علاقے کے) مذہبی طلبہ کی ایک پوری نسل کو خوراک اور رہائش کی سہولتیں ملتی رہی ہیں۔ گرچہ سوویت مخالف جہاد میں اپنے کردار کی وجہ سے جلال الدین شمالی وزیرستان کے عسکریت پسندوں میں انتہائی احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں تاہم ایجنسی کے قبائلی سرداروں کے ساتھ ان کے تعلقات خاصے پیچیدہ ہیں۔ حقانیوں کا تعلق (افغانستان کے صوبے خوست کے) زادران قبیلے سے ہے۔ شمالی وزیرستان میں ان کی قبائلی جڑیں ظاہر ہے موجود نہیں۔ چنانچہ قبائلی سرداران کے خلاف معاندانہ جذبات کو ہوا دیتے رہتے ہیں۔ 980ء کے دہے میں بھی ان کا رویہ کچھ ایسا ہی رہا تھا۔ حقانیوں کی اسی کمزوری کی بدولت حافظ گل بہادر زیادہ طاقتور نظر آتا ہے کیونکہ شمالی وزیرستان میں اس کا اپنا قبیلہ موجود ہے۔

کابل میں طالبان حکومت کے خاتمے کے بعد جلال الدین میران شاہ آمد کے چند ماہ بعد ہی عملی کارروائیوں سے خاصے دست کش ہوگئے تھے۔ ان کے بیٹے سراج الدین نے تحریک کا انتظام سنبھال لیا تھا۔ آج شمالی وزیرستان میں اسے انتہائی محترم سمجھا جاتا ہے۔ متحارب گوریلا گروہوں کے مابین مصالحت کے لیے طالبان عموماً سراج الدین کا ہی سہارا لیتے ہیں۔ سراج الدین 979ء میں پیدا ہوا تھا مگر وہ آج حقانی نیٹ ورک کا سب سے سینئر کمانڈر ہے۔ جلال الدین کے بھائی حاجی خلیل اور ابراہیم جیسے بزرگ کمانڈر بھی اس کی قیادت میں کام کر رہے ہیں۔ اتنی کم عمری میں بھی سراج الدین کا قائدانہ رول یہ ظاہر کرتا ہے کہ اسے اپنے والد کی بھرپور حمایت اور پشت پناہی حاصل ہے۔

سراج الدین کا پاکستان سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ وہ میراں شاہ کے مہاجر کیمپ میں پلا بڑھا اور وہ پشاور کے قریب اکوڑہ خٹک کے دارالعلوم حقانیہ میں پڑھتا بھی رہا۔ اس کے ساتھیوں کے مطابق وہ اپنے والد جیسا عالم فاضل تو یقیناً نہیں تاہم ان کی نسبت زیادہ متقی اور پارسا سمجھا جاتا ہے۔

شمالی وزیرستان میں حقانی نیٹ ورک کا ڈھانچہ

حقانی نیٹ ورک کا تنظیمی مرکز میراں شاہ میں ہے جہاں ان کے تین طرح کے مراکز ہیں۔ ایک میراں شاہ بازار کا کیمپ جہاں ان کا مدرسہ اور کمیونٹی سنٹر قائم ہے۔ دوسرا سرائے دریہ خیل کے نواح میں ہے ایک دور مرکز ڈانڈے دریہ خیل کے قرب وجوار میں ہے جہاں جلال الدین کا خاندان رہائش پذیر ہے۔ مالی معاملات سے متعلق فیصلے ہتھیاروں کے حصول اور ان کی تقسیم کا انتظام اور جنگی حکمت عملی جیسے مسائل زیادہ تر میراں شاہ میں حل کیے جاتے ہیں۔

دوسرے افغان باغی گروپوں کی طرح حقانی گروپ کو بھی مختلف ذرائع سے مالی امداد ملتی ہے۔ سراج الدین کے بعض بھائیوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ فنڈز اکٹھا کرنے کے لیے خلیج فارس کے علاقے میں جاتے رہتے ہیں جہاں سے صرف افغان جہاد کے راستے سے حقانی نیٹ ورک کے روابط ہیں بلکہ امیروں سے نئے رابطے بھی بناتے ہیں۔ افغانستان میں موجود کمانڈروں کو میراں شاہ میں موجود گروپ کے لیڈروں کی طرف سے بھی کچھ سرمایہ ملتا ہے لیکن ان سے مقامی طور پر بھی فنڈز اکٹھا کرنے کی توقع کی جاتی ہے۔ اس کے مختلف طریقے ہیں۔ مثلاً مسجدوں کے ذریعے عطیات کی فراہمی، اپنے زیر کنٹرول علاقوں میں تجارت پر ٹیکس لگانا، ٹرانسپورٹ کمپنیوں سے جبری چندہ اور سرحد پار سمگلنگ وغیرہ۔ حقانی گروپ مبینہ طور پر تاوان کی مختلف سکیموں میں بھی ملوث رہا ہے جس میں نیویارک ٹائمز کے رپورٹر ڈیوڈ رہوڈ کا اغوا بھی شامل تھا۔ سراج الدین کے ایک بھائی بدرالدین نے رہوڈ کی رہائی کے لیے کئی ملین ڈالرز اور اپنے دو افغان ساتھیوں کی واپسی کا مطالبہ کیا تھا۔

یہ نیٹ ورک عمومی طور پر چار گروپوں پر مشتمل ہے۔ ایک وہ لوگ ہیں جنہوں نے سوویت مداخلت کے دوران میں جلال الدین کی سربراہی میں کام کیا تھا۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جنہوں نے 2001ء میں تحریک میں شمولیت اختیار کی۔ تیسرے وہ لوگ ہیں جو سالہا سال سے حقانیوں یا ان کے مدرسے سے منسلک رہے ہیں اور چوتھے غیر ملکی (غیر پختون) لوگ جن میں عرب، چیچن اور ازبک باشندے شامل ہیں۔ افغانستان میں حقانی نیٹ ورک کے جنگجو بہت سے قبائل سے

تعلق رکھتے ہیں تاہم شمالی وزیرستان میں نیٹ ورک کے لیڈروں کا زیادہ تر تعلق زادوال قبیلے اور بالخصوص حقانی کے قبیلے میزی اور اس کے اتحادیوں سے ہے۔ تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ حقانیوں کی تحریک قبائلی نوعیت کی ہے. غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ حقانی خاندان یا ان کے قبیلے سے قریبی تعلق کی وجہ سے قیادت کا اعتماد حاصل کرنا آسان ہے۔ جلال الدین کی قیادت میں کام کرنے والے لوگوں کو سب سے زیادہ طاقت ور سمجھا جاتا ہے۔ پکتیا سے آنے والے ازدرا اور غیر پختون کمانڈرز عام طور پر لیڈرشپ کے اندرونی دائرے کا حصہ نہیں بن پاتے۔

شمالی وزیرستان میں حقانی نیٹ ورک کی قیادت کو عام طور پر میران شاہ شوریٰ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ جس میں حقانی گھرانے کے افراد اور سرگرمیوں کی نگرانی کرتا ہے اور ملا عمر کی قائم کردہ کوئٹہ شوریٰ طالبان سے رابطہ کا بنیادی ذریعہ ہے. وہ نیٹ ورک کے ان چند لوگوں میں سے ہے جس کے تحریک طالبان پاکستان کے جنگجوؤں اور القاعدہ سے بھی رابطے ہیں۔ لیکن کمانڈروں سے ملنے کے لیے وہ باقاعدگی سے افغانستان جاتا رہتا ہے۔ اور بعض اوقات مقامی عسکریت پسندوں سے رابطے کے لیے پشاور اور جنوبی وزیرستان بھی جاتا ہے۔

سراج الدین کا ڈپٹی کمانڈر بختی جان شمالی وزیرستان کی سیاست کا ایک اہم کردار ہے اور اس نے ایجنسی میں تحریک طالبان پاکستان اور دوسرے طالبان گروہوں کے ساتھ تعلقات میں انتہائی اہم رول ادا کیا ہے۔ سراج الدین کے قریبی مشیر کے طور پر جانا جانے والا بختی جان ایک انتہائی نظریاتی اسلامی گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے آٹھ بھائیوں نے جلال الدین اور یونس خالص کی زیر قیادت سوویت یونین کے خلاف لڑائی میں حصہ لیا تھا۔ آج بھی اس کے بہت سے بھائی اور چچا حقانی کمانڈر کے طور پر پکتیا میں سرگرم عمل ہیں   جان بادر زادران سراج الدین کا سیاسی نائب ہے۔ میران شاہ شوریٰ کے دوسرے اراکین کی طرح وہ فوجی کمانڈر نہیں ہے۔ اور جلال الدین کی زیر قیادت جنگ کا بھی اسے کوئی تجربہ نہیں تاہم اس کا تعلق پکتیا کے ضلع گردیز سرانے میں واقع حقانیوں کے خاندانی گاؤں سرانی سے ہے اور وہ سراج الدین کے انتہائی قابل اعتماد ساتھیوں میں سے ہے۔ حقانی نیٹ ورک کے مالی امور، ہتھیاروں کی خرید و فروخت کا سارا انتظام اسی کے سپرد ہے۔ انہی ذمہ داریوں کی بدولت وہ تحریک میں انتہائی معتبر حیثیت رکھتا ہے   میران شاہ شوریٰ میں حقانی خاندان کے بہت سے لوگ بھی شامل ہیں۔ ان میں بزرگوں پرانے کمانڈرز حاجی خلیل اور ابراہیم، (جلال الدین کے دو بھائی) بدر الدین اور ناصر الدین حقانی، (جلال الدین کے دو بیٹے) شامل ہیں۔ ناصر الدین سراج الدین کا سوتیلا بھائی ہے کیونکہ وہ جلال الدین کی عرب بیوی سے ہے۔ وہ عربی فر فر بول سکتا ہے اسی لیے القاعدہ کے

ساتھ تعلقات میں اس کا اہم کردار رہا ہے۔ القاعدہ کا ایک سینئر کمانڈر ابو سعید المصری جو 2008ء کے اواخر حملے میں مارا گیا تھا، ناصر الدین کے خاصا قریب تھا۔ امریکہ پر گیارہ ستمبر 2001ء کے حملوں سے پہلے ابو سعید خالدان ٹریننگ کیمپ کے سربراہ ابن الشیخ اللیبی کے ساتھ کام کیا کرتا تھا۔ یہ کیمپ صوبہ خوست میں حقانیوں کے علاقے میں واقع تھا۔

میران شاہ شوریٰ کے باقی اراکین میں بہت سے ایسے افغان اور پاکستانی کمانڈر شامل ہیں جو کبھی شمالی وزیرستان میں ہوتے ہیں اور کبھی افغان محاذ جنگ میں ہوتے ہیں۔ قاری اسماعیل اور مولوی نور قاسم اہم افغان کمانڈروں میں سے ہیں۔ دونوں کا تعلق خوست کے ضلع صابری سے ہے۔ اسی طرح محمد امین، امیر جان اور بھیر محمد جان خوست کی مجلس شوریٰ میں شرکت کرتے ہیں۔ زیادہ تر پاکستانی کمانڈرز مسعود اور وزیر قبائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں دارم سدگی بہت نمایاں ہے کہا جاتا ہے کہ کابل میں ہونے والے قتل و غارت کے کئی واقعات میں اسی کا ہاتھ تھا۔ سدگی 2008ء کے شروع میں کسی نامعلوم گن مین کے ہاتھوں مارا گیا۔

افغانستان اور پاکستان کے درمیان مسلسل سفر کے ذریعے سینئر کمانڈرز سراج الدین اور فیلڈ کمانڈروں کے درمیان رابطے کا کام دیتے ہیں تاہم 2009ء کے بعد سے سراج الدین نے زیادہ تر خود ہی محاذ جنگ پر جانا شروع کر دیا ہے۔ افغانستان میں بہت سے فیلڈ کمانڈر ہیں مگر ان میں رد و بدل ہوتا رہتا ہے کیونکہ وہ مارے جاتے ہیں یا پکڑے جاتے ہیں۔ ملا سنگین ان میں سے ایک اہم کمانڈر ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ پی ایف سی بووی برگ ڈھال نامی امریکی سپاہی اس کے قبضے میں ہے۔ دوسرا اہم کمانڈر ملا اسلم شاہ ہے جسے خوست میں تحریک کا شیڈو گورنر سمجھا جاتا ہے۔

فیلڈ کمانڈر عام طور پر اپنے گروپ کے لیے افرادی قوت منتخب کرتے ہیں۔ عموماً یہ بھرتیاں وہ اپنے خاندان، گاؤں یا ضلع سے کرتے ہیں۔ بہت سے طالبان اراکین کے برعکس، جو لڑائی میں مصروف نہ ہوں تو کھیتی باڑی کرتے ہیں یا کوئی کام نہیں کرتے، حقانی جنگجوؤں کا خاصا بڑا حصہ مدرسوں میں پڑھنے آ جاتا ہے۔ ان میں سے بہت سے شمالی وزیرستان میں خصوصاً جلال الدین سے منسلک مدرسوں میں داخلہ لیتے ہیں۔ اس طرح کئی حقانی جنگجو کوئٹہ شوریٰ کی نسبت زیادہ انقلابی اور نظریاتی تربیت کے حامل ہو جاتے ہیں۔

حقانی نیٹ ورک اور کوئٹہ شوریٰ کے باہمی تعلق

حقانی نیٹ ورک اور ملا عمر کی کوئٹہ شوریٰ تحریک طالبان کے درمیان تعلقات کی نوعیت

خاصی پیچیدہ ہے۔ حقانی تحریک تاریخی اور نظریاتی طور پر طالبان سے خاصی مختلف ہے۔ طالبان 1990ء کے دوران جب پکتیا اور خوست کے علاقے میں پہلی دفعہ آئے تو جلال الدین نے خاصی مزاحمت کی تھی۔ لیکن بعد میں ان کے قریبی ساتھیوں (اور غالباً پاکستانی آئی ایس آئی) نے انہیں طالبان حکومت کی حمایت پر آمادہ کر لیا اور اس طرح وہ طالبان کی اطاعت قبول کرنے والے اہم ترین مجاہدین رہنما بن گئے۔ اس طرح ایک منفرد صورت پیدا ہوئی جس میں حقانی گروپ طالبان حکومت کے اندر بھی ایک آزاد کمانڈر کے طور پر سرگرم رہے۔ طالبان کے پورے دور حکومت میں انہوں نے اپنا گروپ قائم رکھا جو طالبان مخالف شمالی اتحاد کے خلاف محاذوں پر ان کی ہدایت کے مطابق برسرکار رہا۔ وہ اپنی مختلف وزارتی پوزیشنوں میں بھی اپنے گروپ سے کام لیتے رہے۔

بعض تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ ممکن ہے کہ جلال الدین اور ملا عمر کی تحریک طالبان کے درمیان یہ ڈیل خود اسامہ بن لادن نے کرائی ہو۔ القاعدہ کے لیڈر نے ایک سینئر فلسطینی صحافی عبدالباری عطوان کو بتایا تھا کہ 1996ء میں کابل میں طالبان کے آخری حملے کے لیے انہوں نے خود جلال الدین کو طالبان کی حمایت پر آمادہ کیا تھا۔ یہ بہت بڑی حمایت تھی۔ عطوان کا کہنا ہے کیونکہ طالبان کو کوئی فوجی تربیت حاصل نہیں تھی جبکہ اس وقت یہ تربیت ان کے لیے انتہائی اہم تھی تاکہ وہ کابل کا تحفظ کرنے والوں کا خاتمہ کر سکیں۔ بن لادن کے ان دعوؤں کی تصدیق تو بہت مشکل ہے لیکن بعض ذرائع کا کہنا ہے کہ 1995ء میں، بن لادن کی افغانستان واپسی سے ایک سال پہلے ہی طالبان اور جلال الدین کے درمیان مفاہمت ہو چکی تھی۔ اس قسم کی گفت وشنید یقینی طور پر مددگار رہی ہوگی کیونکہ طالبان اور حقانیوں کا ہر معاملے میں اتفاق نہیں تھا۔

جلال الدین موسیقی پر پابندی، داڑھی کی صفائی اور تعلیم تک عورتوں کی رسائی کو محدود کرنے سے جیسے طالبان کے اقدامات کے مخالف تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی بن لادن سے طویل تعلق کے باوجود، امریکی حکمت عملی، انہیں طالبان کے مقابلے میں "سیاسی طور پر زیادہ اعتدال پسند" سمجھتا تھا۔

افغانستان پر امریکی حملے کے بعد جلال الدین حقانی نے شمالی وزیرستان میں خود کو دوبارہ منظم کیا کیونکہ یہاں ان کے تاریخی روابط تھے۔ 2001ء کے بعد ان کے بنیادی کمانڈر اور جنگجو وہی لوگ تھے جنہوں نے سوویت اور طالبان کے زمانے میں ان کی قیادت میں کام کیا تھا۔ اسی وجہ سے وہ نائن الیون کے بعد افغان بغاوت میں بھی اپنی تنظیمی آزادی برقرار رکھنے میں کامیاب رہے۔

آج بھی میران شاہ شوریٰ تحریک طالبان میں ہوتے ہوئے بھی آزادانہ کارروائیاں کرتی

ہے۔ اس کا اپنا کمانڈ اینڈ کنٹرول سسٹم ہے جس کا اوپر ذکر آ چکا ہے لیکن اس کی قیادت ملا عمر کی تنظیم سے منسلک ہے۔ کوئٹہ شوریٰ میں جلال الدین کا اپنا ایک مقام ہے جب کہ سراج الدین کو طالبان کی جانب سے لویا پکتیا کا ملٹری کمانڈر مقرر کیا گیا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق لویا پکتیا میں موجود ۹۰% جنگ جوؤں کا تعلق حقانی نیٹ ورک سے ہے۔ اس علاقے میں طالبان جنگ جو ضم ہوتے گئے ہیں۔ اکا دکا موجود لوگ سراج الدین کی قیادت میں ہی سرگرم ہیں کیونکہ حقانی خودمختاری کا حامل ہونے کے باوجود وہی طالبان کوئٹہ شوریٰ کی نمائندگی کرتا ہے۔

حقانی نیٹ ورک کے تمام بیانات اسلامی امارت افغانستان کے نام سے جاری ہوتے ہیں (طالبان کی سابقہ حکومت نے یہ نام اختیار کیا تھا) حقانی طالبان سے علیحدہ کوئی شناخت یا حوالہ دینے سے گریز کرتے ہیں تاکہ باغی گروہوں میں نااتفاقی سے بچا جا سکے۔ مثلاً سراج الدین نے ایک مصنف کو انٹرویو کے دوران بتایا کہ "حقانی گروپ نام کی کوئی چیز نہیں ہم سب ملا عمر کی کمانڈ اور اسلامی امارت افغانستان کے تحت ہیں۔"

میران شاہ شوریٰ اور پکتیا، لوگر اور کابل میں اپنی تمام سرگرمیاں کوئٹہ شوریٰ طالبان کے ساتھ مکمل ارتباط میں جاری رکھتی ہے۔ سراج الدین کوئٹہ شوریٰ کے لیڈروں سے عموماً جنوبی وزیرستان یا پشاور میں ملتا ہے۔ کوئٹہ اس کا جانا کم ہی ہوتا ہے۔ لوگر اور کابل میں حقانی نیٹ ورک اور کوئٹہ شوریٰ کی سرگرمیاں ساتھ ساتھ جاری رہتی ہیں۔ کوئٹہ شوریٰ نے حقانی نیٹ ورک کو کابل پر حملوں کا مکمل اختیار دیا ہوا ہے۔ انہوں نے وہاں مولوی تاج میر کو اپنے آپریشنز کا سربراہ بھی مقرر کیا ہوا ہے۔

اس انتظام کی بدولت حقانی نیٹ ورک کو (کابل جیسے) علاقوں میں بھی رسائی حاصل ہو گئی ہے جہاں تاریخی طور پر ان کا کوئی خاص اثر نہیں تھا۔ سراج الدین نے اپنے اثر و نفوذ کو بڑھانے کے لیے قبائلی تعلقات اور اپنے والد کے پرانے مجاہدین نیٹ ورک کو بھی استعمال کیا ہے۔ مثلاً شمالی افغانستان کے صوبے قندوز کا ایک مشہور باغی لیڈر ملا عنایت اللہ بھی حقانی نیٹ ورک سے منسلک ہے۔ ضلع چہاردرہ میں رہائش پذیر عنایت اللہ حقانیوں کے زادران قبیلے سے ہے اور تقریباً ایک درجن نائب کمانڈر اس کے تحت کام کرتے ہیں۔ حقانی نیٹ ورک اور طالبان شوریٰ دونوں کی بیک وقت موجودگی بعض اوقات مسائل بھی پیدا کرتی ہے۔ مثلاً اکتوبر 2009ء میں کابل میں اقوام متحدہ کے گیسٹ ہاؤس پر حملہ کوئٹہ شوریٰ کی اجازت کے بغیر کر دیا گیا تھا۔ اس واقعے سے دونوں گروہوں کے درمیان خاصی تلخی پیدا ہو گئی تھی کیونکہ طالبان شوریٰ اقوام متحدہ کے لوگوں پر حملہ کرنے سے اجتناب کرتی ہے تاکہ مستقبل کی حکومت کے طور پر ان کا

مثبت تصور اجاگر ہو۔

بعض معاملات میں کوئٹہ شوریٰ اور حقانی نیٹ ورک ایک دوسرے کے مقابلے میں بھی آئے ہیں۔ 2008ء سے پہلے طالبان شوریٰ کا صوبہ لوگر پر مکمل کنٹرول تھا لیکن طالبان مقامی لوگوں سے سختی برتتے تھے۔ بعض اوقات گاؤں کے بزرگوں اور شہریوں کو بچے جنگ جوؤں کی خوراک اور پناہ گاہ کے لیے خاص پریشان کرواتے۔ غیر ملکی جنگ جوؤں، زیادہ تر پاکستانیوں کا وہاں آنا جانا لگا رہتا تھا، جس نے مقامی لوگوں کو اور زیادہ ہراساں کیا۔ بالآخر مقامی لوگوں نے طالبان کو زبردستی علاقے سے نکال باہر کیا اور انھیں جتا دیا کہ وہاں طالبان کو خوش آمدید نہیں کیا جائے گا۔ نتیجتاً صوبے میں طاقت کا خلا پیدا ہو گیا جو نہ اتحادی فورسز پر مشتمل اور نہ ہی افغان حکومت

حقانی نیٹ ورک اس خلا کو پر کرنے آگے بڑھا۔ اس نے لوگر صوبے کے ان ربانی کمانڈروں کا نیٹ ورک دوبارہ تشکیل دیا جو 1980ء کے عشرے میں صوبے کے جنوب مشرقی حصے (جس کی سرحد پکتیا سے ملتی ہے) میں جلال الدین کے تحت کام کر چکے تھے۔ کوئٹہ شوریٰ کے مقامی طالبان سے جنھوں نے مقامی لوگوں کو تنگ نہیں کیا تھا، تعلقات استوار کیے۔ 2009ء تک لوگر کے علاقے میں حقانی نیٹ ورک اہم ترین باغی گروپ بن چکا تھا۔

حقانی نیٹ ورک اور پاکستانی طالبان گروپس کے درمیان تعلق

شمالی وزیرستان میں بھی حقانی نیٹ ورک کا مقامی جنگ جوؤں سے تعلق بھی خاصا پیچیدہ ہے۔ کئی وجوہات کی بنا پر جلال الدین کو شمالی اور جنوبی وزیرستان (کے جنگ جو منظر نامے) میں بے مثال عزت و احترام حاصل ہے تاہم خاندانی شہرت اور افغان جہاد میں ان کا کردار بنیادی وجہ ہیں۔ مثلاً بیت اللہ محسود، جس نے پاکستان تحریک طالبان کی بنیاد رکھی، ہوسکے کی دہائی میں جلال الدین کی ماتحتی میں افغان جنگ میں حصہ لے چکا تھا۔ کوئٹہ شوریٰ اور بعض اوقات پاکستانی آئی ایس آئی شمالی وزیرستان کے مقامی طالبان گروپوں کے درمیان اور پاکستانی جنگ جوؤں اور ریاست کے درمیان وقتاً فوقتاً پیدا شدہ تنازعات کے حل کے لیے سراج الدین سے مداخلت کی درخواست کرتے رہے ہیں۔

نائن الیون کے بعد حقانی نیٹ ورک اور مقامی کمانڈروں کے مابین تعلقات اس وقت پیدا ہوئے جب حقانی نے امریکی حملوں کی وجہ سے شمالی وزیرستان کے قبائلی سرداروں کی افغان

اور عرب جنگ جوؤں کو افغانستان سے باہر نکالنے کے لیے معاونت ادا کی۔ سراج الدین نے شمالی وزیرستان میں حافظ گل بہادر کے اہم ترین نائب مولانا صادق نور سے مضبوط رابطہ بنا لیے۔ وہ حقانی نیٹ ورک کو افغانستان میں جنگ جو اور خودکش بمبار مہیا کرنے لگا۔ اسی طرح سراج الدین نے جنوبی وزیرستان میں ملا نذیر سے تعلقات بنائے جو خودکش بمباروں کی تربیت اور ان کی سپلائی کرتا رہا۔ بعض معاملات میں حقانی نیٹ ورک نے جنوبی وزیرستان میں مقیم جنگ جو کمانڈروں سے جنگ جو حاصل کیے ہیں۔ قاری حسین ان میں سے ایک مثال ہے جس نے پاکستان فوج کے دباؤ کی وجہ سے اپنے تربیتی کیمپ شمالی وزیرستان میں منتقل کر لیے۔ حقانی نیٹ ورک اس سلسلے میں ان پر بھروسہ کرتا ہے کیونکہ خودکش بمباروں کی تربیت کے لیے ان کے اپنے کوئی کیمپ نہیں۔

حقانی نیٹ ورک کے کمانڈر بختی جان نے اس طرح کے مذاکرات میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ 2006ء میں، اس نے شمالی وزیرستان کی قبائلی برادریوں میں نیٹ ورک کے نمائندے کے طور پر کام کیا اور اہم عسکریت پسند پاکستانی کمانڈروں کو ایک دوسری جنگ بندی کے لیے قائل کیا تاکہ مذاکرات کا آغاز کیا جا سکے۔ اس سلسلے میں مرحوم طالبان لیڈر اختر محمد عثمانی اور بختی جان کے دستخطوں سے جاری شدہ ایک دستاویز بھی تقسیم کی گئی۔ اس کی عبارت یہ تھی، "امارت اسلامی کی پالیسی یہ ہے کہ ہم پاکستان سے نہیں لڑنا چاہتے۔ تمام انصار (مقامی) اور مہاجرین کو جو امارت اسلامی کے مقاصد سے ہمدردی رکھتے ہیں، مطلع کیا جاتا ہے کہ وہ پاکستان سے لڑنا بند کر دیں کیونکہ پاکستان سے لڑائی میں امریکیوں کا فائدہ ہوتا ہے۔"

سراج الدین اور بختی جان جنوبی وزیرستان کی سیاست میں بھی مسلسل مداخلت کرتے ہیں۔ انھوں نے 2006ء میں طالبان کونسلز قائم کیں تاکہ مقامی لوگوں، پاکستانی طالبان کمانڈروں اور غیر ملکی جنگ جوؤں (خصوصاً ازبکوں) کے درمیان جنم لینے والے مسائل کے حل میں مدد دی جا سکے۔ 2007ء کی بہار میں، وزیروں نے طالبان کے ملا داداللہ کے ساتھ مل کر جنوبی وزیرستان میں حکومت کرنے کے لیے تصادم ہوا تو حقانیوں نے دوبارہ مداخلت کر کے دوسری طالبان کونسلوں کے تمام فیصلوں پر ثالثی کے لیے ایک سپریم کونسل تشکیل دے دی۔ بختی جان نے اس کونسل میں خاصا کام کیا۔ بختی جان فروری 2008ء کے بیت اللہ محسود اور پاکستانی حکومت کے مابین امن مذاکرات میں بھی شریک رہا۔

حقانیوں نے فروری 2009ء میں حافظ گل بہادر، ملا نذیر اور بیت اللہ محسود کے مابین معاہدے میں بھی اہم کردار ادا کیا جس کے نتیجے میں تینوں کمانڈروں کا متحدہ محاذ شوریٰ اتحاد المجاہدین وجود میں آیا۔ اس کے لیے بختی جان اور سراج الدین نے سخت کام کیا اور بار بار ان

کمانڈروں سے ملاقاتیں کرتے رہے۔ حقانی اور کوئٹہ شوریٰ کے لیڈرز، دونوں ہی اس اتحاد کے حامی اس لیے دور لگا رہے تھے کہ تمام کمانڈرز اکٹھے ہو کر کام کریں اور افغانستان میں حملوں پر بھی توجہ مرکوز کریں۔ اگست 2009ء میں بیت اللہ محسود کی موت کے بعد لگتا ہے کہ یہ اتحاد ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا۔

حقانی نیٹ ورک اور غیر ملکی جنگ جوؤں کے درمیان تعلق

جلال الدین حقانی نے 1981ء میں سوویت مخالف جنگ کے شروع میں ہی عرب عسکریت پسندوں سے رابطے مستحکم کر لیے تھے۔ ایک امریکی صحافی جیری واں ڈک، افغانستان میں حقانی کے ساتھ سفر کے دوران رشید روشان (Rochman) نامی ایک مصری جہاد پرست سے ملا۔ جلال الدین کے ساتھی اگرچہ رشید کو (اس کی انتہائی پسندی کی وجہ سے) ناپسندیدہ نظروں سے دیکھتے تھے تاہم جلال الدین اسے پسند کرتا تھا۔ رشید روشان نے مصری صدر انور السادات کے حالیہ قتل کے بارے میں حامی ہوتے ہوئے سوالات پوچھے۔ اسی قتل کی وجہ سے القاعدہ کے نائب سربراہ ایمن الظواہری مصر کی ایک جیل میں عمر قید کی سزا بھگت چکے ہیں۔ لگتا ہے کہ جلال الدین بخوبی سمجھتے تھے کہ روشان جیسے عربوں سے تعلقات ان کی تحریک کے لیے فنڈز کی فراہمی کے ٹھوس ذرائع بن سکتے ہیں۔ خلیج میں شادی کر کے انہوں نے اپنی قرابت داری بھی قائم کر لی ہے اور حقانی نیٹ ورک کو زیادہ تر مالی مدد اسی طرح کے تعلقات سے فراہم ہوتی ہے۔ مزید براں تحریک کے القاعدہ اور ازبک اسلامی جہاد یونین سے بھی تعلقات ہیں اور غیر ملکی عسکریت پسندوں کے تحفظ کے لیے وہ دوسرے جنگ جو گروہوں کے ساتھ ان کا بھرپور استعمال کرتی رہی ہے۔

بن لادن کے تعلقات حقانیوں کے ساتھ 1980ء کے عشرے کے وسط میں اس وقت قائم ہوئے جب اس نے جلال الدین کے ساتھ محاذ جنگ پر ہفتوں اکٹھے گزارے۔ اس تعلق سے دونوں فریقوں کو ہی بے تحاشا فائدہ پہنچا۔ 80ء کے عشرے میں جلال الدین سے جیسے مجاہدین لیڈر کے لیے بن لادن کی مالدار فیملی اور سعودی عرب کے شاہی خاندان سے تعلقات یقیناً نمایاں اہمیت کے حامل رہے ہوں گے اور حقانیوں کی فوجی کامیابیوں نے بن لادن کو یہ موقع فراہم کیا ہوگا کہ وہ ان کارروائیوں میں اپنے کردار کو بڑھا چڑھا کر بیان کر سکے۔

حقیقتاً بن لادن کے حقانی کے ساتھ تعلقات، طالبان حکومت کے ملا عمر کی نسبت کہیں زیادہ گہرے تھے۔ جلال الدین اور بن لادن میں کئی قدریں مشترک تھیں۔ بہ نسبت طالبان کے

ان چند سربراہوں کے ان کے ساتھ سوویت مخالف جہاد کی تاریخ مشترکہ تھی۔ جلال الدین عربی بول سکتا تھا۔ اس کی بیوی عرب تھی۔ ممکن ہے بن لادن جلال الدین کی ظاہری شان وشوکت سے متاثر بھی رہا ہو۔ افغان کمانڈر نے 1980ء کے عشرے میں AK74 نامی کمیاب رائفل کی اپنی لیڈر شپ کی علامت کے طور پر خوب نمائش کی تھی۔ 1987ء میں جاجی کی جنگ کے بعد ابو عبیدہ البنشیری کی نائی ایک اہم نائب نے اسی طرح کی رائفل بن لادن کو دی وہ اسے ہر جگہ اپنے ساتھ رکھتا تھا یہاں تک کہ وہ رائفل اپنے ساتھ سوڈان بھی لے گیا۔ القاعدہ اور اس سے منسلک گروپوں کے حقانی نیٹ ورک میں دو اہم رول ہیں: حملوں کے لیے تجاویز دینا اور خودکش حملہ آوروں کی فراہمی۔ حملوں کی سہولت میں تربیت، ہتھیاروں کی مہارت، ہتھیاروں اور مالی وسائل کی فراہمی شامل ہے۔ میران شاہ میں اور اس کے اردگرد حقانیوں کے ٹھکانوں میں القاعدہ کے اسکواڈ کے درجنوں ڈیرے ہیں۔

حالیہ سالوں میں حقانی نیٹ ورک مضبوط ہوا ہے اور القاعدہ کی سرگرمیاں محدود ہوتی چلی گئی ہیں، اس لیے نیٹ ورک کی سہولت کاری کا رول تقریباً ختم ہو کر رہ گیا ہے۔ تاہم القاعدہ، اسلامی جہاد یونین اور دوسرے گروہ ابھی خودکش بمبار اب بھی فراہم کر رہے ہیں۔ کابل میں قتل و غارت کے کئی بڑے کمانڈو مثال۔ خودکش مشنز میں القاعدہ کے تربیت یافتہ حملہ آور استعمال ہوتے ہیں مثلاً اکتوبر 2009ء میں اقوام متحدہ کے گیسٹ ہاؤس پر حملے میں القاعدہ کے تربیت یافتہ غیر افغان افراد کو استعمال کیا گیا۔ حقانی نیٹ ورک کا القاعدہ کے ساتھ براہ راست رابطہ (ڈرون حملوں کے باعث انتہائی خطرناک اور مشکل ہونے کی وجہ سے) اب نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے۔ تاہم یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ تعلقات مقامی گروپ کی (القاعدہ کے دشمن) حکومت پاکستان سے ملاپ کی وجہ سے متاثر ہوئے ہیں۔

پاکستانی حکومت نے حقانیوں کے ٹھکانوں پر جہاں القاعدہ کے لوگ یا ان کی رسد موجود ہے، بارہا حملے کیے ہیں لیکن حقانی نیٹ ورک کے لوگوں کو بالکل نہیں چھیڑا گیا۔ اسی لیے القاعدہ نے جنوبی وزیرستان میں دوسرے جنگجوؤں سے آہستہ آہستہ اپنی قربت بڑھائی ہے۔ ان میں بیت اللہ محسود اور بعد ازاں حکیم اللہ محسود کے حامی گروپ شامل ہیں جو پاکستانی حکومت سے بھی برسر پیکار ہیں۔

القاعدہ کے ساتھ حقانی نیٹ ورک کی نظریاتی وابستگی کے بارے میں حتمی فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ نیٹ ورک کے کمانڈروں کا کہنا ہے کہ ان کی تحریک القاعدہ کے بین الاقوامی جہاد کے نظریے کے بجائے کوئٹہ طالبان شوریٰ کے قوم پرستی پر مبنی جدوجہد کے زیادہ قریب ہے لیکن گروپ کے

بہت سے لوگ القاعدہ کی زبان استعمال کرتے ہیں۔ حقانیوں نے پاکستانی طالبان اور القاعدہ کے پاکستان مخالف اشتراک سے ہمیشہ دور رہنے کی کوشش کی ہے۔ جون 2006ء میں حقانی گروپ کے آفس نے اپنے ایک خط میں واضح طور پر کہا کہ "پاکستان پر حملہ کرنا ہماری پالیسی نہیں ہے جو ہم سے متفق ہیں وہ ہمارے دوست ہیں اور لوگ ہم سے متفق نہیں اور پاکستان پر غیر اعلانیہ جنگ جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ ہمارے دوست نہیں اور نہ ہی ہم انہیں اپنی صفوں میں گھسنے کی اجازت دیں گے۔"

سراج الدین نے ایک انٹرویو میں اس کی مزید وضاحت کی کہ اس نے "مسلمانوں کے دوسرے غیر مسلم ممالک میں حملے کی بھی" مخالفت کی۔ مئی 2009ء میں دو غیر ملکی صحافیوں سے بات کرتے ہوئے کہا "یہ سوچنا غلط ہے کہ القاعدہ اور طالبان ایک ہی مقصد کے لیے مصروف عمل ہیں۔ القاعدہ ساری دنیا میں اپنا اثر و نفوذ بڑھانا چاہتا ہے۔ ہمیں اس میں کوئی دلچسپی نہیں۔ طالبان کا مقصد افغانستان کو غیر ملکی افواج کے تسلط سے آزاد کرانا ہے۔"

تاہم حقانی نیٹ ورک کے سابقہ کمانڈروں کا کہنا ہے کہ تحریک کے القاعدہ کے ساتھ ناطے اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتے جب تک ان پر سفارتی اور فوجی ذرائع سے زبردست دباؤ نہ ڈالا جائے۔ یہ بھی واضح نہیں کہ نیٹ ورک کے سارے کمانڈر القاعدہ سے تعلق کے بارے میں سراج الدین سے متفق ہیں۔ ایک اہم فوجی کمانڈر ملا سنگین نے القاعدہ کے میڈیا نمائندے اسحاب سے شیخ عثمان سے کہا "ہم نے امیر المومنین ملا عمر کو بارہا اپنی وفاداری کا یقین دلایا ہے۔ ہمارے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔"

نیویارک ٹائمز کے صحافی ڈیوڈ روہڈ نے، جسے حقانی نیٹ ورک کے لوگوں نے اغوا کر لیا تھا اور سات ماہ تک شمالی وزیرستان میں قید رکھا تھا، بچ نکلنے کے بعد کہا کہ "میں پوری طرح سمجھ نہیں پایا کہ بہت سے طالبان کس حد تک انتہا پسند ہو چکے ہیں۔ اغوا ہونے سے پہلے میں انہیں القاعدہ کی طرح کا سمجھتا تھا جو مذہبی میلان کی وجہ سے بنیادی طور پر افغانستان پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن حقانی نیٹ ورک کے لوگوں کے ساتھ رہتے ہوئے میں نے جانا کہ شدت پسند طالبان کا مقصد بہت بڑا ہے۔ قبائلی علاقے میں غیر ملکی جنگجوؤں کی موجودگی نے نوجوان طالبان پر خاصا گہرا اثر ڈالا ہے اور وہ القاعدہ کے ساتھ مل کر پوری مسلم دنیا میں اسلامی امارت قائم کرنے کے خواہاں ہیں۔"

حقانی نیٹ ورک: حربے اور حکمت عملی

حقانی نیٹ ورک نے افغانستان میں شہری مراکز پر اہم حملوں کے دوران دوسرے باغی گروہوں کی نسبت کہیں زیادہ Sophistication اور جرأت مندی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان کی پہلی ایسی کارروائی 2008ء کی ابتداء میں کابل کے سرینا ہوٹل پر حملہ تھا۔ آنے والے برسوں میں گروپ نے بہت سے حملے کیے جن میں اوپر تلے اہم مقامات کو نشانہ بنایا گیا۔ ان میں صدر کرزئی پر قاتلانہ حملہ، بھارتی سفارت خانے کے خلاف دو کار بم دھماکے اور دوسرے حکومتی دفاتر پر حملے شامل ہیں۔ اس طرح کی قتل و غارت عموماً غیر ملکی جنگجو کرتے رہے ہیں۔ حقانی نیٹ ورک نے "حمزہ بریگیڈ" کے نام سے ایک گروپ تشکیل دیا ہوا ہے جو خودکش حملوں کو نہ صرف منظم بلکہ استعمال بھی کرتا ہے۔ ملا نذیر اور مولانا صادق نور جیسے پاکستانی جنگجو اور بعض اوقات عرب گروہ بھی بھی حقانی نیٹ ورک کو بھیجنے سے پہلے خودکش بمباروں کی بھرتی اور تربیت کا کام کرتے ہیں

2009ء میں نیٹ ورک نے گردیز (پکتیا)، خوست شہر اور پل عالم (لوگر صوبہ) کے نسبتاً چھوٹے غیر محفوظ شہری علاقوں میں بھی اسی طرح کے حملے کیے۔ طالبان کے ایک رسالے "الصمود" میں دیے گئے انٹرویو میں حقانی نیٹ ورک کے کمانڈر مولوی نور قاسم نے وضاحت کی۔ "اس قسم کے حملوں کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ مجاہدین میں شہروں کے بیچوں بیچ حملے کرنے کی صلاحیت موجود ہے اور وہ کہیں بھی فوجی اور حکومتی مراکز کو براہ راست نشانہ بنا سکتے ہیں۔

دیہاتی علاقوں میں حقانی نیٹ ورک روڈ سائڈ بموں اور مارو اور بھاگ جاؤ جیسے حربے استعمال کرتا ہے۔ (طالبان کی طرح) تاہم طالبان کے برعکس نیٹ ورک کے زیر کنٹرول علاقوں میں کوئی واضح حکومتی ڈھانچہ نہیں۔ مثلاً غزنی اور ہلمند کے صوبوں میں طالبان کی مکمل انتظامیہ موجود ہے جو کہ مصنوعی وزارتوں کا سسٹم اور صوبے کے شعبوں پر مشتمل تھے۔ حقانی کے زیر کنٹرول علاقوں میں ایسے ادارے ناپید ہیں تاہم پکتیا کے علاقوں میں کہا جاتا ہے کہ جھگڑوں کو طے کرنے کے لیے اسلامی عدالتیں بنائی گئی ہیں۔

حقانیوں کے سوویت مخالف بغاوت کے زمانے سے آئی ایس آئی سے قریبی تعلقات چلے آتے ہیں۔ اس زمانے میں جلال الدین کو سی آئی اے اور آئی ایس آئی کا پسندیدہ کمانڈر سمجھا جاتا تھا۔ یہ تعلقات آج بھی قائم ہیں۔ پاکستان کی خفیہ ایجنسیوں کے افسران کے خیال میں حقانی نیٹ ورک افغانستان میں پاکستان کے مفادات کو آگے بڑھانے میں انتہائی اہم ہے۔ مثلاً 2008ء کے موسم گرما میں کابل کے بھارتی سفارت خانے پر کار دھماکہ افغان اور امریکی خفیہ اداروں کے مطابق آئی ایس آئی اور حقانی نیٹ ورک کی مشترکہ کارروائی تھی۔ اس حملے میں دو سینئر بھارتی افسروں کو نشانہ بنایا گیا تھا جن میں سے ایک ڈیفنس اتاشی مارا گیا تھا۔ آئی ایس آئی نے بھارتی افسروں کے

راستوں اور وقت کے متعلق حقانی نیٹ ورک کو مکمل تفصیل فراہم کی تھی۔ خودکش بمبار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ حملہ ایسے ہوا جیسے وہ بھارتی ڈیفنس اتاشی کے پیچھے آنے کا ہی منتظر تھا۔

جلال الدین حقانی نے 2001ء میں جب طالبان کی حکومت ختم ہونے جا رہی تھی افغانستان میں عسکریت پسندوں کی حمایت سے متعلق پاکستانی اداروں کو اس طرح بیان کیا تھا۔ "پاکستان کی مشرقی سرحد پر بھارت ہے۔ پاکستان کا ازلی دشمن۔ افغانستان میں طالبان حکومت کی موجودگی میں پاکستان کے پاس 2300 کلومیٹر طویل بے مثال گہرائی موجود ہے جس کا صدر مشرف نے بھی بڑے فخریہ طور پر اظہار کیا ہے۔ کیا پاکستان واقعی ایک ایسی نئی حکومت چاہتا ہے جس میں پرو انڈیا لوگ بھی شامل ہوں گے اور اس طرح ساری اسٹریٹجک گہرائی ہوا ہو جائے گی۔"

حقانی نیٹ ورک کے لوگ اور امریکی خفیہ اداروں کے افسران، دونوں کا ہی کہنا ہے کہ حقانیوں کے لیے آئی ایس آئی کی امداد براہ راست اور واضح نہیں ہے۔ پاکستانی خفیہ اداروں نے حقانی نیٹ ورک کو معمولی مالی امداد اور تھوڑی بہت تربیت دی ہے لیکن در اصل اہم بات یہ ہے کہ وہ انھیں خفیہ معلومات اور محفوظ پناہ گاہ فراہم کر رہے ہیں۔

حقانی نیٹ ورک کے سابقہ اور حالیہ جنگجوؤں کے مطابق آئی ایس آئی کے افسران میران شاہ میں ان کے ٹھکانوں پر چھاپے سے پہلے سراج الدین کو بتا دیتے ہیں۔ حقانی جنگجو اپنے اہم کاغذات اکٹھے کر کے پہاڑی پناہ گاہوں کی طرف فرار ہو جاتے ہیں اور صورت حال محفوظ ہونے تک وہیں انتظار کرتے ہیں۔ یہ کوئی بہت شاندار سسٹم نہیں۔ جسے عام طور پر ہتھیاروں کی تباہی کی کہانی بتاتے ہیں یا کبھی کبھار کسی القاعدہ لیڈر کے پکڑے یا مارے جانے کی خبر پہنچ ہوتے ہیں جس سے نیٹ ورک اور القاعدہ کے مابین تلخیاں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ بہرحال اس طرح حقانیوں کو انتہائی قیمتی محفوظ پناہ گاہ حاصل رہتی ہے۔ بعض اوقات تو نیٹ ورک کے آپریشن کمانڈر پاکستانی فوج سے خوف زدہ ہونے کے بجائے مزے سے بیٹھے نظر آتے ہیں۔

شمالی وزیرستان کی وجہ سے حقانیوں کو ایسا ٹھکانا میسر ہے جہاں وہ امریکی فوجی حملوں سے بچ سکتے ہیں (البتہ سرحد پار سے ان پر ڈرون حملے ہوتے رہتے ہیں) لیکن اس صورت حال سے بھی کئی پیچیدگیاں جنم لیتی ہیں۔ حقانی نیٹ ورک کے سابقہ اور حالیہ جنگجوؤں کو یہ شکایت رہی ہے کہ پاکستان ان سے اپنی باتیں منواتا رہتا ہے اور مشکل وقت میں انھیں تنہا چھوڑ دیتا ہے۔

2010ء کے موسم سرما میں طالبان لیڈروں کی گرفتاری کی اس صورت حال کو واضح کرتی ہے۔ پاکستان نے ان مہینوں کے دوران کئی بار حقانی گروپ کے کئی اہم لیڈروں کو گرفتار کیا ہے جن میں نصیر حقانی بھی شامل ہے۔ ان سب کو بعد ازاں رہا کر دیا گیا لیکن اس طرح کی گرفتاریاں انھیں

تحریک کے مقابلے میں پاکستان کی برتری کا احساس دلاتی رہتی ہیں۔ ایک انٹرویو کے دوران ایک حقانی کمانڈر نے کہا: "پاکستان جب چاہے، ہمارے پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچ سکتا ہے۔"

حافظ گل بہادر اور قبائلی جنگجو

حقانیوں کے بعد حافظ گل بہادر شمالی وزیرستان میں پاکستانی جنگجوؤں کا ایک اہم لیڈر ہے۔ وہ تقریباً 49 سال کا ہے اور اس کا تعلق عثمان زئی وزیر قبیلے کی شاخ مداخیل سے ہے جو میران شاہ اور افغان سرحد کے درمیان پہاڑیوں میں رہتا ہے۔ وہ لواڑہ کا رہائشی ہے اور ایک روحانی کردار، ایپی کے فقیر کی اولاد میں سے ہے جس نے 1930 اور 1940ء کے درمیان برطانوی قبضے کے خلاف بغاوت کے نت نئے طریقے اختیار کیے تھے۔ بہادر ایک مذہبی عالم ہے اور اس نے ملتان کے ایک دیوبندی مدرسے سے تعلیم حاصل کی تھی۔ بہادر نے افغانستان کی سول وار میں بھرپور حصہ لیا تھا۔ سوویت فوجوں کی واپسی کے بعد وہ شمالی وزیرستان واپس آگیا اور فضل الرحمٰن کی جمعیت علمائے اسلام کا سرگرم سیاسی کارکن بن گیا۔ وہ 2004ء میں شمالی وزیرستان میں فوجی آپریشن کے دوران مشہور ہوا۔ وہ افغان حکمت عملی اور آپریشن کے حوالے سے حقانیوں کے ساتھ قریبی رابطے میں رہتا ہے۔ آج براہ راست بہادر کی کمانڈ میں 1500 جنگجو ہیں۔

حکمت عملی اور تعلقات

بہادر انتہائی زیرک اور گہری سوجھ بوجھ کا مالک ہے۔ شمالی وزیرستان میں اور باہر بھی اس کے جنگجو گروہوں سے بہت اچھے تعلقات ہیں۔ وہ پاکستانی حکومت سے تصادم سے بچنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ بلا وجہ کی محاذ آرائی نہ ہو۔ اس نے اگرچہ بیت اللہ محسود اور اس کے جانشینوں کے ساتھ پاکستان مخالف تحریک طالبان پاکستان کے ساتھ اتحاد ضرور کیا لیکن حتی الامکان ایسے اقدامات سے گریز کرتا رہا جس کے نتیجے میں پاکستانی حکومت بھڑک جائے۔ یہ قطعاً حیرت کی بات نہیں کہ پاکستان کے بارے میں گل بہادر کا رویہ بھی حقانیوں سے ملتا جلتا ہے (جو کہ ISI کے پسندیدہ سمجھے جاتے ہیں) حقانیوں کی طرح گل بہادر کی تمام کارروائیوں کا ہدف بھی امریکی اور نیٹو افواج ہیں۔

دوسری ایجنسیوں میں موجود طالبان جنگجوؤں کے ساتھ گل بہادر کے تعلقات خاصے پیچیدہ ہیں۔ اگرچہ اس نے 2006 اور 2008ء میں پاکستانی فوج کے خلاف شمالی وزیرستان میں طالبان جنگجوؤں کا ساتھ دیا تھا مگر ساتھ ہی اس نے پاکستانی حکومت کے ساتھ دو امن معاہدے بھی کیے۔ بہادر پاکستانی طالبان کے دوسرے گروہوں کے اتحاد میں آتا جاتا رہا ہے لیکن

اس سے ان سے ہمیشہ کارآمد تعلقات قائم رکھے ہیں۔ حال ہی میں بیت اللہ محسود کی موت کے بعد، اس نے پاکستان مخالف محاذ سے علیحدگی اختیار کر لی تاہم وہ اب بھی جنوبی وزیرستان میں پاکستانی فوج کے حصوں سے بچ نکلنے والے محسود گروپ کے لوگوں کو پناہ دے رہا ہے۔

پاکستانی طالبان نامی تنظیم دسمبر 2007ء میں فاٹا اور سرحد کے صوبے میں موجود جنگ جوؤں کے مختلف گروہوں کو اکٹھا کرنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ اس کی تشکیل کے وقت بیت اللہ محسود کو اس کا امیر اور گل بہادر کو اس کا نائب بنایا گیا تھا۔ یہ اتحاد خاصا تعجب انگیز تھا کیونکہ بیت اللہ محسود کے جنوبی وزیرستان میں شدید مخالف ملا نذیر سے گل بہادر کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ مزید یہاں گل بہادر محسود کے اربک ساتھیوں سے بھی خاصا تنگ تھا جو ملا نذیر کے علاقے وزیرستان سے نکالے جانے کے بعد میر علی کے علاقے میں آباد ہو گئے تھے۔

گرچہ پاکستانی طالبان TTP اتحاد پاکستانی حکومت کے خلاف بنایا گیا تھا لیکن اس کے بنتے ہی گل بہادر نے حکومت سے مذاکرات شروع کر دیے۔ یہ قطعاً حیرت انگیز نہیں کہ وہ زیادہ عرصہ طالبان کے ساتھ نہیں چل سکا۔ اس نے پاکستان سے محاذ آرائی پر مصر بیت اللہ محسود کی مخالفت میں ملا نذیر کے ساتھ مل کر جولائی 2008ء میں یہ اتحاد قائم کر لیا۔ بعض رپورٹس کے مطابق بیت اللہ محسود کی طاقت ختم کرنے کے لیے حکام نے اس اتحاد کی بھرپور حمایت کی تاہم محسود مخالف اتحاد بھی زیادہ عرصہ چل سکا۔ 2009ء میں امر نج الدین حقانی کے کہنے پر بیت اللہ محسود، ملا نذیر اور حافظ گل بہادر نے شوریٰ اتحاد المجاہدین کا اعلان کر دیا۔ یہ اتحاد باہمی تنازعات کو ختم کرنے کے لیے بنایا گیا تھا اور کہا جاتا ہے کہ اس میں شامل تمام گروہوں کی گزشتہ غلطیوں کو معاف کر دیا گیا تھا۔ جون 2009ء میں اسی معاہدے کے تحت گل بہادر نے شمالی وزیرستان میں ایک فوجی قافلے پر حملہ کیا جو محسود کے خلاف جنوبی وزیرستان میں فوجی آپریشن کی مدد کے لیے جا رہا تھا۔ جنوبی وزیرستان میں جانے کے لیے فوجی رسد کے راستوں پر ان کے حملے بیت اللہ محسود کے خلاف کارروائی میں پاکستانی فوج کے لیے نہایت خطرناک تھے کیونکہ جنوبی وزیرستان کے لیے موزوں راستے نہ ہونے کے برابر ہیں۔

کہا جاتا ہے اگست 2009ء میں بیت اللہ محسود کی موت کے بعد شوریٰ اتحاد بھی ختم ہو کر رہ گیا۔ اب گل بہادر اور پاکستانی فوج کے درمیان تصادم کے واقعات منظر پر نہیں آ رہے۔ لگتا ہے کہ بہادر کے لوگ پاکستانی فوج کی شمالی وزیرستان میں آنے جانے پر کوئی رکاوٹ نہیں ڈال رہے۔ یہ واضح نہیں کہ بیت اللہ محسود کی موت کے محسود جنگ جوؤں اور گل بہادر کے درمیان تعلقات پر کیا اثرات ہوئے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ بیت اللہ محسود کی وفات کے بعد اتحاد ختم ہو

گیا۔ بعض دوسرے کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہو کیونکہ بیت اللہ کے جانشین اور اس کے کزن حکیم اللہ محسود کے گل بہادر سے خاصے قریبی تعلقات ہیں۔ (خیال کیا جاتا ہے کہ جنوری 2010ء کے ڈرون حملے میں حکیم اللہ محسود مارا گیا تاہم پاکستانی طالبان اس کی موت سے انکاری ہیں)

گل بہادر کا انتہائی اہم کمانڈر صادق نور وزیر قبیلے سے تعلق رکھتا ہے۔ 45 سالہ صادق نور کے افغان طالبان سے 1996ء سے تعلقات ہیں جب انہوں نے افغانستان میں حکومت قائم کی تھی۔ بہادر کی طرح صادق نور بھی میران شاہ کے قریبی علاقے میں رہائش پذیر ہے اور منبع الاسلام نامی مدرسہ چلاتا ہے جو جلال الدین نے 1980ء کے عشرے میں سوویت مخالف افغان جہاد کی مدد کے لیے بنایا تھا۔ یہ مدرسہ اور اس کے ساتھ ہی واقع رہائشی عمارت صادق نور کا ہیڈ کوارٹر بھی رہے۔ ستمبر 2008ء کے ایک ڈرون حملے میں اس ہیڈ کوارٹر کو تباہ کر دیا گیا۔ گرچہ صادق نور اس حملے میں خود تو بچ نکلا مگر کہا جاتا ہے کہ اس میں اس کے گھر سے کے پاکستانی گھرانے کے کئی افراد مارے گئے تھے۔

جلال الدین سراج الدین کے ساتھ صادق نور کی انتہائی قربت، ان کے مدرسے منبع الاسلام میں اس کی کارگزاری کے پس منظر میں اس طرح کی بھی یقیناً قابل فہم ہے۔ صادق نور کے گروہ میں آٹھ سو لڑاکے شامل ہیں۔ شمالی وزیرستان میں صادق کا دایاں بازو سعید خان روور ہے۔ اس کا کردار منشیر کی طرح کا ہے۔ سعید خان بھی میران شاہ سے ہے۔ وہ صادق نور اور بہادر سے خاصا چھوٹا ہے۔ اس کی عمر 33 یا 34 برس ہوگی۔ یونیورسٹی سے گریجویشن کی ہوئی ہے اور کہتے ہیں کہ وہ کمپیوٹر کا بھی ماہر ہے۔ کچھ خواہوں کے مطابق اس کا کوڈ نام آر ہوتا ہے۔ لیکن وہ منظر عام پر نہیں آتا اور میڈیا سے خصوصاً دور رہتا ہے۔

بہادر کا ایک اور کمانڈر مولانا عبدالخالق حقانی ہے۔ اس کا تعلق بھی وزیر قبیلے سے ہے۔ میران شاہ میں رہتا ہے اور اس کے پاس پانچ سو کے قریب لڑاکے ہیں۔ عبدالخالق بھی گل بہادر کی طرح پاکستانی طالبان اور حکومت کے درمیان ایک طرح کا توازن رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ تاہم مقامی اداکاروں کے مطابق پاکستان حکومت کے خلاف بھرپور قسم میں عبدالخالق جنگ جوؤں کی مزاحمت کا ساتھ دے گا۔ وحید اللہ وزیر میران شاہ کے اردگرد موجود بے قبیلے کے دو سو جنگ جوؤں کا سربراہ ہے۔ وحید اللہ گروپ بھی سرحد پار افغانستان کے حملوں میں ملوث ہے لیکن 2006ء اور 2008ء کے دوران پاکستانی فوج کے خلاف بھی وارداتیں کر چکا ہے۔ اسی طرح ایک اور 39 سالہ حکیم اللہ وزیر نامی جنگ جو بہرعلی میں رہتا ہے۔ اس کا گروہ 150 آدمیوں پر مشتمل ہے۔ وہ بھی سرحد پار حملہ آور فوج پر حملوں میں شامل ہے تاہم اس نے بھی 2006ء اور 2008ء میں

پاکستانی فوج کے خلاف خاصی سرگرمی دکھائی تھی۔

شمالی وزیرستان میں بہادر کا ایک اور اتحادی سیف اللہ وزیر ہے۔ شوال میں موجود مقامی عثمان زئی وزیروں سے اس کا تعلق ہے۔ شوال (Shawal) شمالی وزیرستان میں غیر ملکی جنگ جوؤں کی پناہ گاہ کے طور پر خاصا بدنام ہے۔ وہ بہادر کے خاصا قریب ہے اور جنگ جوؤں اور پاکستانی حکومت کے مابین 2006ء کے امن معاہدے میں اس نے گل بہادر کی نمائندگی کی تھی۔ اس کی ملیشیا میں چار سو لڑاکے ہیں جن میں بہت سے افغانستان میں نیٹو اور امریکی افواج کے خلاف نبرد آزما ہیں۔ پاکستانی فوج کے ساتھ محاذ آرائی کے بارے میں بھی اس کی خاصی شہرت ہے۔

شمالی وزیرستان میں کئی طرح کے گروپ، ذاتی یا سیاسی وجوہ کی بنا پر گل بہادر کی براہ راست کمان میں کام نہیں کرتے۔ ایک گروہ کا سربراہ میران شاہ سے وزیر قبیلے کا، مجیر نامی شخص ہے جس کی تمام تر توجہ افغانستان میں امریکی اور نیٹو افواج پر حملوں پر ہے۔ گل بہادر اور دوسرے جنگ جو گروہوں (جس کا تعلق جمعیت علمائے اسلام کے فضل الرحمن گروپ سے جا ملتا ہے) کے برعکس مجیر کا سیاسی تعلق جماعت اسلامی اور گلبدین حکمت یار کی حزب اسلامی سے ہے۔

میر علی کے ایک سکول ٹیچر رسول خان داوڑ کی بھی ایک آزاد ملیشیا ہے۔ گل بہادر نے میر علی بازار کا سربراہ بنایا تھا لیکن 2009ء میں اسے ہٹا دیا گیا، جس کے بعد وہ اپنا جنگ جو گروپ چلا رہا ہے۔ اس کی زیادہ تر کارروائیاں مجرمانہ نوعیت کی ہوتی ہیں۔ شاید گل بہادر نے اسی وجہ سے اپنے گروپ سے نکالا ہو۔ اس کے جنگ جو امریکی یا نیٹو افواج پر حملے نہیں کرتے ہیں بلکہ پاکستانی فوج اور شمالی افغانستان میں فوجی ٹھکانوں کو نشانہ بنانے کے لیے مشہور ہیں

ایک اور اہم اور آزاد جنگ جو لیڈر مولانا منظور داوڑ ہے۔ یہ میر علی کے قریب واقع ایدک نامی گاؤں سے تعلق رکھتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کے پاس 300 طالبان جنگ جو ہیں اور غیر ملکی جنگ جوؤں میں اس کی خاصی حمایت موجود ہے۔

اسی حمایت کی وجہ سے بہادر اور صادق نور کے ساتھ اس کا جھگڑا شروع ہوا کیونکہ 2006ء میں انہوں نے غیر ملکی جنگ جوؤں کو علاقے سے نکالنے کی کارروائی کی تھی۔ منظور کی ملیشیا افغانستان میں امریکی اور نیٹو افواج اور پاکستان میں پاکستانی افواج سے متصادم رہتی ہے۔ ایک اور جنگ جو گروہ کا سربراہ 45 سالہ حق نواز داوڑ ہے۔ وہ داوڑ قبیلے کا ایک عام آدمی ہے۔ اس کی کارروائیاں میران شاہ کے ارد گرد ہوتی ہیں۔ اس کا تعلق بھی ردیلی گاؤں ایپوری سے ہے۔ علاقے میں کام کرنے والے غیر ملکی جنگ جوؤں (خصوصاً ازبکوں سے) سے اس کے تعلقات اچھے ہیں۔ صادق نواز اور گل بہادر کے ساتھ بھی اس کی دیرینہ رنجش بھی ہے۔ حق نواز پاکستانی فوج

سے لڑنے سے بچتا ہے۔ تقریباً 300 جنگجو اس کی کمان میں ہیں۔

غیر ملکی عسکریت پسند

قبائلی لڑاکوں کے علاوہ، حق نواز ایک عراقی جہادی ابو کاشا کے گروہ کے ساتھ بھی کام کرتا ہے۔ ابو کاشا 2002ء سے اپنے بیوی بچوں سمیت میر علی میں رہائش پذیر ہے۔ اس کا اصلی نام عبدالرحمن ہے۔

ابو کاشا ایک دلچسپ شخصیت ہے کیونکہ اس نے القاعدہ کے ساتھ تعاون بھی کبھی کبھار ہی کیا ہے۔ 2005ء میں اپنے عراقی لیڈر شپ ابی الفلوجری سے اختلافات کے بعد اس نے گروپ چھوڑ دیا تھا۔ اگرچہ اب بھی ابو کاشا کے القاعدہ سے گہرے تعلقات ہیں مگر اس نے جیش المہدی کے نام سے اپنا علیحدہ گروپ قائم کر رکھا ہے جس میں مقامی دور قبیلے، ازبک، چیچن، تاجک اور ترکمانوں پر مشتمل 250 سے 300 تک لوگ ہیں۔ ابو کاشا کے ازبکستان کی اسلامی تحریک اور اسلامی جہاد گروپ سے بھی قریبی تعلقات ہیں۔

ابو کاشا نے مقامی سوسائٹی میں اپنا مقام بنانے کے لیے بہت محنت کی ہے اور اب اسے مقامی ہی سمجھا جاتا ہے۔ میر علی میں خوشی یا غم کا کوئی بھی موقع ہو، ابو کاشا اس میں شریک ہوتا ہے۔ اس کے بعض ساتھی اسے پیر بھی سمجھتے ہیں۔ 2006ء کے ایک واقعے کی وجہ سے۔ (پاکستان فوج کے آپریشن کے دوران) ابو کاشا کسی مقامی کے گھر ٹھہرا ہوا تھا۔ وہاں سے رخصت ہوتے ہوئے اس نے مکان مالک سے کہا کہ اس کا گھر تباہ نہیں کیا جا سکے گا۔ پاکستانی فوج نے اس گھر کو کئی دفعہ مسمار کرنے کی کوشش کی لیکن وہ گھر کو ذرا سا نقصان نہیں پہنچا سکے۔ اس وقت سے مقامی لوگ اس سے اپنے مسائل حل کرانے، تعویذ وغیرہ لینے جاتے رہتے ہیں اس وعدے کے ساتھ کہ اس سے حاصل شدہ منافع کو امریکی اور نیٹو فوج کے خلاف جہاد کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ ابو کاشا مقامی عدالت بھی لگاتا ہے اور فریقین میں مصالحت کرانے کی فیس سے پچاس ہزار روپے تک فیس لیتا ہے۔ اگر کوئی یہ رقم دینے میں ہچکچاہٹ محسوس کرے تو اس کے مسلح جیش کے لوگ اس کی ادائیگی پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ رقوم افغانستان میں جنگ کے لیے استعمال ہوں گی۔ حال ہی میں جنوبی وزیرستان میں آپریشن کے دوران تحریک طالبان پاکستان کے، اس علاقے میں بھاگ کر آنے والے، جنگجوؤں کی ابو کاشا نے بہت مدد کی ہے۔

مولانا صادق نور کے ساتھ ابو کاشا کے تعلقات اچھے نہیں۔ گل بہادر کے طاقتور کمانڈر صادق نور کو میران شاہ میں ابو کاشا کے اہم رول پر سخت اعتراض ہے، بالخصوص قبائلی رسوم میں

ابوکاشہ کی شرکت اور مصالحت کاری پر۔ فاٹا میں کئی دوسرے عسکریت پسندوں کی طرح 2006ء کے ڈرون حملے کے بعد سے ابوکاشہ بھی اپنی حفاظت کا خاص خیال رکھتا ہے۔ اس ڈرون حملے میں وہ بال بال بچا تھا۔ اب وہ ڈرون ہی کی رفتار سے متحرک رہتا ہے اور چند دن سے زیادہ ایک جگہ نہیں ٹھہرتا۔

القاعدہ

غیرملکی جنگجو شمالی وزیرستان میں سرحد کے ساتھ ساتھ زیادہ تر میران شاہ اور میر علی میں رہتے ہیں۔ ابوکاشہ کی طرح اسلامی جہاد یونین کا سربراہ نجم الدین جالولوی بھی میر علی میں رہتا ہے۔ شمالی وزیرستان میں امریکی ڈرون حملوں کے ذریعے القاعدہ کے کافی اہم لیڈر مثلاً ابولیث اللبی اور ابوجہاد المصری مارے جا چکے ہیں۔ 8 دسمبر 2008ء کو صالح الصومالی (رکن القاعدہ) کو ڈرون کا نشانہ بنایا گیا۔ کہتے ہیں وہ بیرونی حملوں کی منصوبہ بندی کیا کرتا تھا۔ القاعدہ کے عربوں کے بارے میں خیال ہے کہ وہ شوال پہاڑیوں، میر علی اور میران شاہ کے علاقوں میں رہتے ہیں۔

افغانستان اور پاکستان میں القاعدہ کے حملوں کے حوالے سے القاعدہ کا شمالی وزیرستان سے متعلق پروپیگنڈہ اس کی اہمیت کا اظہار ہے۔ 2004ء سے 2009ء تک القاعدہ کی جاری کی گئی افغانستان کے حصوں سے متعلق 89 ویڈیوز میں سے 47 ویڈیو پکتیا کے واقعات کی ہیں جو شمالی وزیرستان سے سرحد پار حقانیوں کا مرکزی علاقہ ہے۔ عین ممکن ہے کہ یہ قلیل رفاقت القاعدہ کے جنگجوؤں سے کی ہو لیکن جغرافیائی رفتار کی یہ نمائش حقانی گروپ کے القاعدہ کے ساتھ تعلقات اور علاقے میں کارروائی کرنے کی اہلیت ضرور ظاہر کرتی ہے۔

اسلامی جہاد یونین

اسلامی جہاد یونین کا اہم ترین مرکز شمالی وزیرستان میں میر علی میں واقع ہے، جہاں اسے مختلف مقامی جنگجو قبائل کی مدد حاصل ہے۔ اس یونین کا مقصد ازبکستان میں اسلام کریموف کی سیکولر حکومت کا تختہ الٹنا ہے۔ پچھلے پانچ سالوں میں اس نے (Sauerland) سیل کے ذریعے کئی حملے منظم کیے اور مختلف تربیتیں دیں۔ اسی سیل نے جرمنی میں (جنوری 2007ء میں) امریکی فوجی اڈوں پر حملے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس کا لیڈر نجم الدین جالولوف ہے عبدالوف (اس کا نائب امیر) اور محمد فاتح اس کے ساتھی ہیں۔

اسلامی جہاد یونین پاکستان میں 2002ء میں اسلامی تحریک ازبکستان سے مزاحمتی گروپ کے طور پر بنایا گیا تھا۔ اس گروپ میں زیادہ تر ازبک لڑکے ہیں تاہم اس میں تاجک، کرغیز اور

قاری جنگ جو بھی شامل ہیں۔ فاٹا میں موجود چیچن گروپ سے بھی اس کے قریبی تعلقات ہیں۔ یونین نے ترکی زبان میں بے تحاشا پراپیگنڈا مواد بنایا ہے۔

اختتامیہ

شمالی وزیرستان فاٹا میں جہادی جنگ جوئی کا آج اہم ترین مرکز ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ یہاں ان کی کاروائیوں پر کوئی خاص قدغن نہیں لگ سکی۔ پاکستانی حکومت نے دوسرے علاقوں میں (پاکستان مخالف) عسکریت پسندوں کا مقابلہ کیا ہے لیکن یہاں کی سرگرمیاں عموماً نظرانداز کی گئی ہیں۔ حقانی نیٹ ورک اور گل بہادر کا گروہ پاکستانی حکومت کو اپ سیٹ نہیں کرتے اور اس سلسلے میں وہ سیاسی طور پر بہت حساس اور محتاط ہیں۔ تاہم کبھی کبھار ان کا پاکستانی حکومت سے ٹکراؤ بھی ہو جاتا ہے۔ جنوبی وزیرستان میں حقانی نیٹ ورک، ورگل بہادر نے پاکستانی طالبان کے ساتھ مل کر خاصی کاروائیاں کی ہیں۔ 2009ء کے آخر اور 2010ء کے شروع میں جنوبی وزیرستان سے ملٹری آپریشن کے دوران بھاگ آنے والے محسود لڑاکوں کو پناہ دی۔ مقامی گروپ کے جنوبی وزیرستان میں موجود القاعدہ ارکان سے بڑی گہری قربت ہے اور وہ القاعدہ کے بنیادی مقصد خلافت کے قیام کی حمایت کرتا ہے۔ تاہم نیٹ ورک کے لیڈروں کی تمام تر توجہ افغانستان پر ہے۔ بسا اوقات کسی اور جگہ وہ القاعدہ کی مدد خاموشی سے کر دیتے ہیں۔ تاہم ان کی موجودہ قیادت اپنی کاروائیوں کا دائرہ وسیع نہیں کرنا چاہتی۔

شمالی وزیرستان میں جنگ جوؤں پر ڈرون حملے مجبوری کے تحت کیے جاتے رہے۔ مقامی رائے عامہ پر اس کا اثر ہمیشہ منفی رہا۔ موجودہ ڈرون حملوں نے شمالی وزیرستان میں جنگ جوؤں کو خاصا خوف زدہ کر رکھا ہے اور شاید پاکستانی حکومت کو زیادہ جارحانہ حملوں کے لیے تیار کرنا بھی اس کا مقصد ہو...یاد رہے کہ اکتوبر 2009ء میں جنوبی وزیرستان میں پاکستانی فوج کے آپریشن کی ابتدا کے ساتھ ہی امریکی ڈرون حملے روک دیے گئے تھے لیکن شمال میں ان حملوں میں اضافہ کر دیا گیا تھا۔ فوجی روابط سے متعلق یہ اشارے بتاتے ہیں کہ شمالی وزیرستان میں ہونے والے ڈرون حملے دراصل پاکستانی فوج کے آئندہ آپریشن کے لیے راہ ہموار کر رہے ہیں۔

جنگ جوؤں کے خلاف جتنی بھی جارحانہ اپروچ اپنائی جائے لیکن حقانی گروپ کو ختم کرنے کے لیے فیصلہ کن اقدامات کرنا پاکستان کے لیے بہت دشوار ہوگا۔ حقانی نیٹ ورک پاکستان کی بنیادی سوچ (انڈیا پر اجمالی فوکس) سے بخوبی واقف ہے... وہ اس دشمن کے خلاف اپنی افادیت ظاہر کرتے ہوئے پاکستانی کریک ڈاؤن کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔

کوئٹہ شوریٰ کے نائب کمانڈر ملا برادر اور دوسرے افغان لیڈروں کی 2010ء کی ابتدا میں گرفتاریاں (جنگ جو نیٹ ورکس کے خلاف) پاکستان پالیسی میں تبدیلی ظاہر کرتی ہیں لیکن کس حد تک یہ معلوم نہیں کہ آیا ملا عمر اور کوئٹہ شوریٰ کے خلاف کریک ڈاؤن میں حقانیوں کو بھی شامل کیا جائے گا یا نہیں۔ بہر حال شمالی وزیرستان کے جنگ جو عسکری طاقت کے ساتھ ساتھ سیاسی رسوخ کی وجہ سے کسی بھی سے کم نہیں۔ وہ عملیت پسند تو ہیں ہی لیکن ساتھ ہی القاعدہ سے نظریاتی طور پر متاثر بھی ہیں۔ وہ افغانستان سے مذاکرات کرنے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ اس سے کوئی معاہدہ بھی کریں گے۔ ان کی فوجی طاقت، پاکستان کے لیے بنیادی اہمیت اور سیاسی معاملہ فہمی کو اکٹھا کر کے دیکھا جائے تو شمالی وزیرستان کے عسکریت پسند گروپوں کو ختم کرنا، پاکستان کے لیے انتہائی مشکل کام ہوگا۔

آنند گوپال کابل میں مقیم صحافی ہیں وہ وال اسٹریٹ جرنل اور کرسچن سائنس مونیٹر کے نمائندے ہیں۔ وہ 11 ستمبر 2001ء کے بعد کے افغانستان کی تاریخ لکھ رہے ہیں۔ یہ آج کل نیو امریکن فاؤنڈیشن میں ریسرچ فیلو ہیں۔

باجوڑ میں عسکریت پسندی اور تصادم

رحمان اللہ اپریل 2010ء

باجوڑ فاٹا کے سات انتظامی اکائیوں میں سے سب سے چھوٹا ہے اور پر پیچ پہاڑی راستوں کی وجہ سے بے پناہ دشوار گزار بھی۔ اس کی سرحد افغان صوبے کنڑ سے اور دوسری جانب پاکستان میں ضلع دیر سے ملتی ہے (دیر وادی سوات کا گیٹ وے کہلاتا ہے) اس لیے باجوڑ پاکستان کے لیے ہی نہیں، پورے علاقے کے لیے تزویراتی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کی موجودہ آبادی دس لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ اور خار (KHAR) اس کا انتظامی مرکز ہے۔

طالبان اور القاعدہ کا اہم مرکز ہونے کی وجہ سے، افغان صوبے کنڑ نے باجوڑ کے قدامت پرست اور مذہبی قبائل پر خاص اثر ڈالا ہے۔ 200ء میں افغانستان میں طالبان حکومت کے خاتمے کے بعد جنگجو گروہ سرحد پار کر کے باجوڑ آ گئے۔ انہوں نے پختونوں کی مہمان نوازی اور پناہ گاہ کی روایات کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ باجوڑ کے قبائل نے ان کی شاندار مہمان نوازی کی۔ باجوڑ آج بھی طالبان کے لیے ڈیورنڈ لائن کے دونوں جانب آنے جانے کے لیے راہداری کا اہم مرکز ہے۔ دہشت گردی کے عملی منصوبوں میں باجوڑ کی اہمیت اس سے واضح ہوتی ہے کہ لندن اور بارسلونا میں کیے جانے والے حملوں کا منصوبہ باجوڑ سے تعلق رکھنے والے القاعدہ کارکنوں نے بنایا تھا۔ مزید یہ کہ القاعدہ کے ایک اہم لیڈر ابوفراج اللیبی نے جو جنرل مشرف پر قاتلانہ حملے کی واردات میں ملوث تھا، اپنی گرفتاری کے بعد بتایا کہ وہ کافی عرصہ باجوڑ میں مقیم رہا ہے۔

باجوڑ میں شدت پسندی کا ڈھانچہ

اگرچہ صوفی محمد (تحریک نفاذ شریعت محمدی کا بانی) شرعی یا اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے پڑوسی ضلع مالاکنڈ میں 981ء سے کوشش کر رہا تھا تاہم باجوڑ میں 2001ء میں طالبان

کے زوال سے پہلے، ایسی کوئی تحریک نہیں تھی۔ افغانستان پر امریکی حملے کے خلاف پختونوں کے غم وغصے کو استعمال کرتے ہوئے صوفی محمد نے باجوڑ کی تحصیل ماموند میں طالبان کی مدد کے لیے بھرتی مرکز قائم کر دیا۔ باجوڑ میں طالبان کمانڈر فقیر محمد (جو شریعت محمدی تحریک کا نائب امیر بھی تھا) نے اس سلسلے میں اس کی بھرپور مدد کی۔ 2001ء کے آخر میں تقریباً دس ہزار مقامی افراد صوفی محمد کی قیادت میں، اتحادی افواج سے جنگ کرنے سرحد پار گئے۔ ان میں سے باجوڑ کے سینکڑوں جنگجو مارے گئے یا گرفتار کر لیے گئے۔ بعض خبروں کے مطابق، ان میں سے بہت سے کبھی تک واپس نہیں آئے۔ شاید وہ ابھی تک افغان جیلوں میں ہیں۔ صوفی محمد کے ساتھ افغانستان جانے والے ایک صحافی کا کہنا ہے کہ قیدیوں میں سے آدھے واپس آ گئے ہیں۔ اور آدھے افغانستان میں مارے گئے یا ابھی وہیں قید ہیں۔ نور اللہ نامی صحافی نے کہا کہ صوفی محمد کے آدمی مشرقی افغانستان میں واقع صوبہ کنڑ میں، خار سے 30 کلومیٹر دور (شمالی مشرقی) اور دہ گائی کے راستے سے داخل ہوئے۔ خار باجوڑ کا اہم ترین قصبہ ہے۔

جونہی سابق صدر جنرل مشرف نے طالبان مخالف امریکی فوجی کارروائیوں کی حمایت شروع کی، قبائلی علاقے میں پاکستانی فوج کا تصور بگڑنا شروع ہو گیا۔ ایک یہ بات اور دوسری امریکہ اور امریکیوں سے انتقام لینے کی خواہش نے باجوڑ کو طالبان کا مرکز بنانے میں اہم رول ادا کیا۔ 2002ء کی ابتداء میں صوفی محمد کی پاکستان واپسی کے بعد سے اور اس کے بیٹے فضل اللہ کو امریکیوں کے خلاف لشکر بنانے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ اس صورت حال نے باجوڑ اور سوات کے لوگوں کو مزید مشتعل کر دیا... اس غصے کی بدولت باجوڑ کے جنگجو فقیر محمد کی قیادت میں اکٹھے ہو گئے۔ اس کے حامی سرِبازار لاؤڈ سپیکر کے ذریعے چندہ دینے اور رضاکار بھرتی کرنے کی اپیلیں کرنے لگے۔ 2002ء میں آہستہ آہستہ فقیر محمد نے چار سے پانچ ہزار لڑاکوں کی فوج جمع کر لی (باجوڑ کی ماموند اور ناوگئی تحصیلوں میں) مقامی طالبان نے افغانستان سے بھاگ کر آنے والے غیر ملکی اور افغان جنگجوؤں کو پناہ دی اور بسا اوقات ان بیرونی لوگوں کو شادی بیاہ کے ذریعے اپنے خاندانوں میں شامل کر لیا۔

افغانستان میں جنگ کی طوالت کے ساتھ ساتھ باجوڑ کے لوگوں کی ہلاکتوں میں اضافے کی وجہ سے صوفی محمد کی حمایت میں کمی آتی چلی گئی۔ وہ اپنے پیچھے افغانستان میں ہزاروں لوگ چھوڑ آیا تھا جن میں سے اکثریت واپس نہ آ سکی۔ لیکن یہ ناامیدی اتنی بھی نہیں تھی کہ باجوڑ کے لوگوں میں (شمالی اتحاد) امریکی اور نیٹو افواج کے لیے نفرت میں کمی آ جاتی چنانچہ افغان میدان جنگ سے بھاگ کر آ کر پناہ لینے والے طالبان کو باجوڑ میں خود کو دوبارہ اکٹھا کرنے میں کوئی

پریشانی نہیں ہوئی۔ (2000ء کی ابتدائی دہائی میں) باجوڑ کے ایک گاؤں صوابی میں 1970ء میں پیدا ہونے والا فقیر محمد مقامی طور پر مقبول اور طاقت ور ممند قبیلے سے تعلق رکھتا ہے اس نے 1980ء کے عشرے میں سوویت قبضے کے خلاف جہاد میں حصہ لیا اور بعد ازاں اگلے عشرے میں طالبان کے ساتھ افغانستان میں کارروائیوں میں شریک رہا۔ مدنگی ماحول کے پروردہ فقیر محمد نے ایک مقامی مدرسے میں تعلیم حاصل کی جہاں ایک مشہور عالم مولانا عبدالسلام اس کے استاد تھے۔ وہ دیوبندی عقیدے سے تعلق رکھتے تھے مگر انہیں سیاست یا عسکریت پسندی سے کوئی علاقہ نہیں تھا۔ (کیپٹل عبدالناصر نامی تجزیہ نگار کے مطابق) فقیر محمد نے مولانا عبدالسلام سے درس نظامی حاصل کیا جو عربی سے کے برابر ہوتا ہے۔ دارالعلوم پنج پیر میں اس نے قرآن فہمی پیدا کی۔ صوابی کا یہ مدرسہ وہابی مکتبۂ فکر کا حامل ہے۔ سعودی عرب میں بھی اس عقیدے پر ہی عمل کیا جاتا ہے۔

فقیر محمد طویل قامت اور اچھے قد کاٹھ کا مالک ہے۔ اس کی طالبان سٹائل سیاہ داڑھی ہے۔ اس کی ایک بیوی ہے مگر خاندان خاصا بڑا ہے اور ان میں سے ہر کوئی اس کی جنگ جویانہ سرگرمیوں میں شامل ہے۔ 1993-94ء میں تحریک نفاذ شریعت میں شمولیت سے پہلے فقیر محمد قبائلی علاقے میں جمعیت جماعت اسلامی کا مقامی لیڈر تھا۔ تحریک نفاذ شریعت میں شمولیت کے بعد فقیر محمد نے امریکیوں سے جہاد کے لیے افغان جنگ جوؤں کے ساتھ پاکستانی لڑکوں کو شامل کرنے کی ناکام کوشش میں صوفی محمد کا ساتھ دیا۔ ناصر کی رپورٹ کے مطابق اس نے بیٹے دو بیٹوں اور دو بھتیجوں اور بھائیوں مولوی محمد کریم اور مولوی جان محمد کے ساتھ افغانستان میں ہی تحریک میں شمولیت اختیار کی تھی۔ اس وقت فقیر محمد کے پاس چھ ہزار رضاکار ہیں جن میں سے پانچ سو افغان اور سو دوسرے جنگ جو (عرب، چیچن) شامل ہیں۔ ہر ایک جنگ جو باجوڑ کی ماموند تحصیل کے علاقے چارمنگ میں موجود ہیں۔ قاری ضیاء الرحمن ان کا کمانڈر ہے۔ کچھ حفاظتی درج کے مطابق وہ دوسرے غیر ملکی جنگ جوؤں کو تربیت دیتا ہے۔ مولوی فقیر محمد تحریک طالبان پاکستان کے بانیوں میں سے ہے۔ دسمبر 2007ء میں یہ تحریک پاکستان کے مختلف جنگ جو گروہوں کو اکٹھا کرنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ بیت اللہ محسود اس کا پہلا امیر تھا۔

بیت اللہ کے نائب ہوتے ہوئے اس نے کوئٹہ شوریٰ طالبان کے ملا عمر سے وفاداری کا کئی بار اعلان کیا۔ "ہم افغان اور پاکستانی طالبان کی تحریکوں کو ایک ہی سکے کے دو رخ سمجھتے ہیں۔" ایک مقامی رہنما، محسود خان کے مطابق مولوی فقیر محمد نے 2008ء میں صوابی کے ایک بڑے اجتماع میں کہا۔ "ہم ملا عمر اور اسامہ بن لادن کو اپنے سپریم کمانڈر سمجھتے ہیں حالانکہ اسامہ نے ہمارے ساتھ ایک رات بھی نہیں گزاری۔ تاہم اگر وہ یہاں آئے تو ہم اس کا خیر مقدم

کریں گے۔" ایک اور مقامی عمران خان نے فقیر محمد کو اس کے ایف ایم ریڈیو پروگرام میں ملا عمر اور بن لادن کی حمایت کا اعلان کرتے سنا: "ہم اور ملا عمر ایک ہیں۔ ہماری تحریکوں میں کوئی اختلاف نہیں۔"

باجوڑ کے عسکریت پسند گروہوں سے کوئٹہ شوریٰ طالبان کے کوئی معلوم آپریشنل لنکس نہیں ہیں تاہم باجوڑ میں موجود طالبان پاکستانی ریاست کے خلاف کاروائی کرتے رہتے ہیں جبکہ افغان طالبان، ملا عمر اور کوئٹہ شوریٰ کے تحت اپنی تمام تر جنگی کاروائیاں امریکی اور نیٹو افواج پر مرکوز رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ افغانستان کے طالبان پاکستانی طالبان جنگ جوؤں کے لیے "طالبان" کی اصطلاح کے استعمال کو بھی پسند نہیں کرتے کیونکہ ان کے خیال میں اس سے ان کی عوامی حمایت متاثر ہو سکتی ہے۔ 2009ء کے موسم سرما میں افغانستان میں بنائے گئے طالبان کے "ضابطہ اخلاق" کا باجوڑ میں طالبان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

فقیر محمد نے القاعدہ کے لیے اپنی حمایت کا اعلان کیا ہوا ہے اور افغانستان میں پاکستان طالبان کے ہاتھوں امریکی اور نیٹو افواج کو نشانہ بنانے کی سرگرمیوں کی بھی حمایت کی ہے۔ گیارہ ستمبر کو امریکہ میں ہونے والے دہشت ناک واقعات کے بارے میں اس کا خیال ہے کہ نائن الیون کے بعد حالات میں تبدیلی بہتری کے لیے آئی ہے۔ اس سے جدوجہد میں استقلال آیا ہے۔ مسلمانوں کی آنکھیں کھل گئی ہیں۔ امت کو اپنے دشمنوں کا پتہ چل گیا ہے۔ اگر حملہ پہلے ہو گیا ہوتا تو اب تک کئی مسلمان ملک غیر ملکی قبضے سے آزاد ہو چکے ہوتے۔" پاکستانی حکومت نے اس کی گرفتاری پر 15 ملین روپے کا انعام رکھا ہے۔

وادی سوات میں صوفی محمد اور اس کے داماد فضل اللہ کی طرح، مولوی فقیر محمد کو بھی ریڈیو کی اہمیت کا بخوبی علم ہے۔ اس کے وعظ اور تقریریں اس کے غیر قانونی ایف ایم چینل پر پورے باجوڑ میں سنے جا سکتے ہیں۔ اس کا براڈکاسٹنگ یونٹ با آسانی اسمگل کیا جا سکتا ہے اور کسی بھی جگہ لے جایا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستانی حکومت اس کی نشریات ابھی تک نہیں روک پائی۔ وہ میڈیا کے لوگوں سے بھی ملتا رہتا ہے، انٹرویو دیتا رہتا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اگست 2009ء میں بیت اللہ محسود کی موت کی افواہیں اڑانے کے بعد سے وہی تحریک طالبان پاکستان کا قائم مقام امیر ہے۔

افغانوں اور دوسرے غیر ملکی جنگ جوؤں کے علاوہ منش محمد اور پاکستانی تحریک نفاذ شریعت جیسے کالعدم گروہوں کے پیروکار بھی مولوی فقیر محمد کے ساتھ ہیں۔ طالبان کی شوریٰ اور یہ گروپس مشترک عدالتیں چلاتے ہیں۔ جاسوسی کے الزام میں پکڑے جانے والوں کو یکساں سزائیں دیتے ہیں۔ مشترکہ جرگے اور اجلاس بلاتے ہیں تاکہ باجوڑ میں عسکریت سے متعلق اہم

امور پر بحث لا سکیں۔ ان کے نام مختلف ضرور ہیں مگر ان میں کوئی ظاہری اختلاف نہیں۔ مولوی فقیر محمد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کے القاعدہ کے سرود ہیڈ ایمن الظواہری سے قریبی رابطہ ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ ڈمہ ڈولا میں جنوری 2006 میں اس نے دہشت گرد لیڈر کی حمایت کی تھی جس کو ڈرون حملے کے ذریعے نشانہ بھی بنایا گیا تھا۔ مارچ 2010ء کے شروع میں مولوی فقیر محمد کی پاکستان کے (مہمند ایجنسی کے علاقے میں) ایک ہوائی حملے کے ذریعے ہلاکت کی خبر بھی پھیلی تھی لیکن بعد میں رائٹر کے ایک رپورٹر کو ٹیلی فون کال کی گئی جس میں مولوی فقیر محمد نے خود کو شناخت کرایا۔ رپورٹر نے مولوی فقیر کی آواز پہچانے کی تصدیق کی۔ بعد ازاں فقیر محمد نے بی بی سی کے پشاور آفس میں فون کیا اور انھیں اطلاع دی کہ وہ اس کے لئے گفتگو اور پیغام دعائیہ ہیں۔

یہ افواہیں بھی سننے میں آئیں کہ فقیر محمد کو باجوڑ کی امارت سے ہٹا دیا گیا ہے اور اس کی جگہ تحریک طالبان پاکستان کے ایجنسی میں نائب امیر جمال الدین داد اللہ کو دے دی گئی کیونکہ مولوی فقیر نے 2010ء کے آپریشن کے دوران اپنے حامیوں کو پاکستان کے خلاف لڑنے سے منع کر دیا تھا۔ اس نے اہم طالبان لیڈروں کو سخت پریشان کر دیا کیونکہ وہ مسلسل پاکستانی ریاست کو نشانہ بناتے رہتے ہیں۔ جمال الدین داد اللہ مرحانو زنگل (وارہ) ماموند تحصیل (خار کے شمال مغرب میں) سے تعلق رکھتا ہے۔ اس نے پنج پیر مدرسے سے کچھ تعلیم بھی حاصل کی ہے۔ اس سے زیادہ اس کے بارے میں کچھ اور معلوم نہیں۔ مولوی فقیر اس طرح سے انکار کرتا ہے لیکن باجوڑ میں طالبان کے ساتھ اپنے اختلافات کو تسلیم کرتا ہے۔

باجوڑ میں دوسرے جنگجو گروہ

تحریک طالبان پاکستان اور تحریک نفاذ محمدی باجوڑ کے بڑے جنگجو گروپ ہیں لیکن کچھ اور جہادی گروہ بھی برسرکار ہیں۔ قاری ضیاء الرحمن جیش اسلامی کا سربراہ ہے جو ماموند تحصیل کے یوسف خیل قبیلے سے ہے۔ وہ ماموند تحصیل میں خاصا سرگرم ہے۔ 2008ء میں جیش اسلامی کا سربراہ بننے سے پہلے وہ مولوی فقیر کا نائب اہم سیکورٹی کمانڈر تھا۔ مولوی فقیر نے جب باجوڑ میں فوجی آپریشن کے دوران پاکستانی فوج کے حملوں کا جواب نہیں دیا تو جیش اسلامی علاحدہ جدا ہوئی اور اس نے مولوی فقیر پر گورنمنٹ سے جا ملنے کا الزام لگایا۔ ان دونوں گروپوں میں خاصی مخاصمت پائی جاتی ہے۔

حرکت جہاد اسلامی شدت پسندوں کا ایک پنجابی گروپ ہے۔ کبھی قاری سیف اللہ اختر اس کا سربراہ ہوا کرتا تھا۔ یہ بھی باجوڑ میں خاصی متحرک ہے۔ پاکستانی خفیہ اداروں کا دعویٰ ہے کہ

اختر اور حرکت جہاد اسلامی ستمبر 2008ء کے میریٹ ہوٹل اسلام آباد پہ کیے گئے خودکش حملے کے ساتھ ملک میں کیے جانے والے کئی اور خودکش حملوں میں ملوث ہیں۔ سابق وزیراعظم بےنظیر بھٹو (کے قافلے پر) پر 18 اکتوبر 2007ء کو کراچی میں کیا جانے والا حملہ بھی انہی لوگوں نے کیا تھا

اسلامی تحریک ازبکستان اور اسلامی جہاد یونین نامی دو ازبک گروہ بھی کسی حد تک باجوڑ اور سرحد پار صوبہ کنڑ میں موجود ہیں لیکن ان کے اراکین کی تعداد سو کے لگ بھگ ہوگی۔ مزید براں، باجوڑ میں کئی عرب جنگجو بھی ہیں جو 2001ء میں طالبان حکومت کے خاتمے کے بعد سرحد پار کرکے آئے تھے۔ باجوڑ کے ان غیرملکی گروہوں کو اکٹھا رکھنے میں مولوی فقیر محمد کو کمال حاصل ہے اور ملا عمر اور بن لادن سے ان کی حمایت اس بات کی دلیل ہے کہ باجوڑ میں موجود ان عربوں میں سے کچھ القاعدہ کے اہم لوگ ہوں۔

مولوی فقیر محمد کے علاوہ تھوڑے بہت طالبان کمانڈر بھی ہیں۔ پرویز خار کے مغرب میں لوئی تحصیل پر قابض ہے۔ ایک افغانی ضیاالرحمٰن کنڑ کی سرحد کے ساتھ ساتھ چارمنگ کے علاقے کا انتظام سنبھالے ہوئے ہے۔ مولانا اسمٰعیل چہارمنگ اور دوسرے علاقوں میں طالبان کی نگرانی کرتا ہے۔ مولوی عبداللہ سالار زئی تحصیل میں بنڈا کے علاقے میں تحریک کا ناظم ہے۔ ولی الرحمان لوئی ماموند تحصیل میں عرب کے علاقے کا سربراہ ہے۔ ان کمانڈروں کا آپس میں زبردست مواصلاتی نظام قائم ہے اور ضرورت پڑنے پر وہ فقیر محمد سے رہنمائی لیتے ہیں۔ تاہم فوجی آپریشن کے دوران سیکورٹی وجوہات کی بنا پر جب رابطے مشکل ہو جائیں تو ان میں سے ہر جنگجو کمانڈر کو اپنے علاقے میں کاروائی کا اختیار بھی حاصل ہے۔ افغان سرحدی صوبہ کنڑ بائی کمانڈر گلبدین حکمت یار کا مضبوط گڑھ ہے۔ طالبان کی حکومت کے خاتمے کے بعد یہاں حکمت یار کے ساتھیوں کا سیلاب آ گیا تھا تاہم باجوڑ میں 2008ء کے فوجی آپریشن کے بعد اکثر لوگ ایجنسی سے چلے گئے۔ مہاجرین کا ایک چھوٹا سا گروپ اب بھی یہاں مقیم ہے اور وہ مذہبی سیاسی پارٹی جماعت اسلامی کے حامی ہیں جس کے گلبدین حکمت یار کی جہادی پارٹی حزب اسلامی سے گہرے تعلقات ہیں۔ تاہم حزب اسلامی کا جنگجو گروہوں سے کوئی خاص واسطہ نہیں کیونکہ پاکستان حکومت اور پاکستان مخالف طالبان دونوں سے ان کے مراسم ہیں۔

تربیتی کیمپ۔

باجوڑ میں طالبان پہاڑیوں کے درمیان واقع جنگلات میں اور مذہبی مدارس میں، جن پر پاکستانی حکومت سے پابندی لگا رکھی ہے، متحرک تربیتی کیمپ چلاتے ہیں۔ بعض کیمپ خار کے جنوب

میں 70 کلومیٹر دور مہمند کے ساتھ واقع ہے۔ مدینہ اور افغان سرحد کے ساتھ چار منگ میں موجود ہیں۔ مزید براں عسکریت پسندوں نے خار سے 12 کلومیٹر دور لوئی سام میں کچھ انفرادی گھروں پر بھی قبضہ کیا ہوا ہے اور ان میں تربیتی کیمپ چلاتے ہیں۔ ایک مقامی افسر کے مطابق بعض اور تربیتی مقامات میں مالا سعید، باندہ (سالارزئی)، مومند کا ایریا اور داماڈولا کے علاقے شامل ہیں۔ پاکستانی فوج کا کہنا ہے کہ اس نے داماڈولا کا علاقہ خالی کرا لیا ہے اور اب آگے بڑھ رہی ہے۔ حفاظتی نقطہ نظر سے تیزی سے منتقل کیے جانے والے ان کیمپوں میں نئے بھرتی شدہ عسکریت پسندوں کو راکٹ، مارٹر فائر کرنے، بم بنانے اور انہیں تیار کرنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ زیادہ تر بم اور خودکش جیکٹیں گھروں میں ہی تیار ہوتے ہیں۔ جیکٹ ان کے مختلف پرزوں، بال بیرنگ، سخت بولٹس اور کیلوں کو اکٹھا کر کے بم کی شکل دی جاتی ہے۔

باجوڑ میں موجود طالبان کے پاس وہ ہتھیار بھی ہیں جو ان کے پرانے ساتھی سوویت مخالف جہاد میں استعمال کرتے رہے ہیں۔ نئے رضاکاروں کو گھوڑا فائرنگ وغیرہ کی تربیت دینے کی زیادہ ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ کلاشنکوف جیسی خطرناک رائفلیں چلانے کے وہ بچپن ہی سے عادی ہوتے ہیں

مالی معاونت

بہت سے پاکستانی حکام کو یقین ہے کہ پاکستان میں طالبان کو غیر ملکی مدد ملتی ہے۔ اویس غنی، گورنر سرحد نے بارہا یہ دعویٰ کیا ہے کہ افغان نارکوٹکس مافیا پاکستانی طالبان کو بھرپور مدد دیتی ہے۔ فروری 20.0ء میں ان کا اندازہ تھا کہ تحریک طالبان پاکستان اپنے چندہ و جرائم کاموں پر 3.6 ملین روپے خرچ کرتی ہے اور اس آمدنی کا بڑا حصہ افیم کی تجارت سے آتا ہے۔

گرچہ باجوڑ افغان افیم تجارت، ٹریفک میں براہ راست ملوث نہیں تاہم سرحدی علاقہ ہونے کی وجہ سے اس کے اثرات محسوس ہوتے ہیں عسکریت پسند باجوڑ میں لکڑی کی سمگلنگ میں بھی ملوث ہیں۔ مقامی مساجد میں چندہ جمع ہوتا ہے۔ مقامی باشندوں سے بھتہ وصول کرنا اور اغوا برائے تاوان بھی فنڈنگ کا ذریعہ ہے۔

خودکش حملوں کا حربہ

فاٹا میں کسی بھی جگہ خودکش حملوں کا ماسٹر مائنڈ، جنوبی وزیرستان کا باشندہ قاری حسین ہے۔ تحریک طالبان کا ایک کمانڈر مرحوم بیت اللہ محسود کا دایاں بازو سمجھا جاتا تھا۔ خودکش حملہ آوروں کی تربیت اور ان کا استعمال باجوڑ میں بھی ہوتا ہے۔ قاری حسین یہ خودکش بمبار فاٹا میں کہیں بھی بھیج

سکتا ہے۔ مولانا فضل اللہ نے بھی خودکش بمباروں کے سوات میں پاکستانی فوج اور حکومت کے ٹھکانوں پر حملہ آور ہونے کی حوصلہ افزائی کی ہے اور اب یہ باجوڑ تک پھیل گئے ہیں۔ سوات کے طالبان لیڈر نے جولائی 2007ء میں کہا تھا "خودکش بمباروں کے ذریعے مسلم نوجوان دنیا کو بتا رہے ہیں کہ وہ اپنی ہڈیوں اور گوشت کو کافروں پر حملہ آور ہونے کے لیے گولیوں کی طرح استعمال کر سکتے ہیں۔"

مقامی لوگوں نے مولوی فقیر کو باجوڑ کے مختلف علاقوں میں مجمعے میں کہتے سنا ہے کہ تحریک طالبان پاکستان کے پاس بہت سارے خودکش بمبار ہیں۔ اس نے دعویٰ کیا کہ یہ جنگ جو خدا کی محبت میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ لوگوں سے یہ کہتے بھی سنا ہے کہ عورتیں بھی خودکش بمبار بننا چاہتی ہیں... باجوڑ کے مختلف شہروں میں 2008-9ء کے درمیان تقریریں کرتے ہوئے مولوی فقیر محمد نے کہا۔ اس کے پاس بہت سارے رضاکار خودکش بمبار ہیں۔ اس نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ طالبان نوجوان کو کارروائی سے پہلے بہت کچھ دیتے ہیں مگر اصل اجر جنت ہے۔ 3 جنوری 2009ء کو ایک خودکش حملہ آور نے خار میں ایک پولیس چیک پوسٹ پر حملہ کیا جس میں کم از کم سترہ لوگ مارے گئے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلسل فوجی آپریشنوں کے باوجود تحریک شہر کے عین مرکز میں حملہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

باجوڑ میں فوجی آپریشنز

جنوری 2006ء کے دوران شمالی باجوڑ میں ایک مشتبہ ڈرون حملے میں ایک گھر تباہ ہو گیا جس میں 12 افراد مارے گئے۔ یہ حملہ القاعدہ کے نائب امیر ایمن الظواہری کو نشانہ بنانے کے لیے کیا گیا تھا جو وہاں رات کو ایک میزبان پارٹی میں شریک تھا۔ الظواہری تو اس حملے سے بچ نکلا تاہم اس کا داماد جو القاعدہ کے میڈیا کا اہم آدمی تھا اور ابو عبیدہ المصری (افغانستان کے لیے القاعدہ کا آپریشنل سربراہ) اس حملے میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

باجوڑ کے گاؤں چناگئی سے کچھ دور واقع ایک مدرسے پر اکتوبر 2006ء کے آخر میں ایک حملہ کیا گیا۔ حملے کے بارے میں کہا گیا کہ یہ گن شپ ہیلی کاپٹروں کی مدد سے پاکستانی فوج نے کیا تھا تاہم کئی مقامی لوگوں کے مطابق یہ بھی ڈرون حملہ تھا جو الظواہری کے لیے کیا گیا تھا۔ اس میں 80 سے زیادہ جنگجو ہلاک ہوئے تھے تاہم رہائشیوں کا دعویٰ ہے کہ مرنے والے مدرسے کے طلبہ تھے اور تحریک نفاذ شریعت کے مدرسے کے سربراہ مولانا لیاقت بھی ان کے ساتھ تھے۔ اکتوبر کے حملے سے صرف دو دن پہلے مدرسے سے 5 کلومیٹر دور صدیق آباد میں تین ہزار جنگجوؤں

سے ایک ریلی نکالی تھی جس میں وہ ملا عمر اور اسامہ بن لادن کی حمایت میں نعرے لگا رہے تھے۔

مولوی فقیر محمد نے اس ہلاکت پر شدید غم و غصے کا اظہار کیا۔ سی بی سی تباہ شدہ عمارت کے احاطے میں اپنے مسلح ساتھیوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا، "اللہ شیخ اسامہ کی حفاظت کرے اللہ ملا عمر کی حفاظت کرے۔" اور پھر ڈرامائی انداز میں کہا کہ کاش وہ خود بھی شہید ہو گیا ہوتا!

2006ء میں دو فضائی حملوں نے پاکستانی حکومت اور امریکی فوجوں کے خلاف اہل باجوڑ کے جذبات بری طرح مشتعل کر دیئے اور مولوی فقیر محمد کی پرجوش تقاریر نے باجوڑ میں طالبان کی حمایت میں زبردست اضافہ کر دیا۔ دوسرے حملے کے صرف ایک ہفتے بعد طالبان نے درگئی میں پاکستانی فوج کے ٹھکانے پر حملہ کیا۔ پاکستان کی فوج کے خلاف یہ خطرناک ترین حملہ تھا جس میں کم از کم چالیس فوجی مارے گئے اور 22 زخمی ہوئے۔ فوجی ترجمان میجر جنرل شوکت سلطان نے کہا۔ "ہمیں پورا شک ہے کہ فوجی مرکز پر حملہ آوروں کا تعلق باجوڑ کے طالبان سے تھا اور انہیں نے باجوڑ القاعدہ کے مولوی لیاقت اور مولوی عمر کی زیر نگرانی چلنے والے مدرسے میں تربیت دی گئی۔"

مولوی فقیر محمد نے طالبان کے بے دریغ پیمانے پر بھرتیاں کیں اور 2006ء کے موسم گرما اور سرما کے دوران کہا جاتا ہے کہ طالبان نے باجوڑ میں 90 فوجی چوکیوں پر قبضہ کر لیا تھا۔

باجوڑ غالباً دو قبائلی اور جنوبی وزیرستان حملوں کا شکار رہا ہے۔ پہلا حملہ 2008ء میں ڈاماڈولا میں، جہاں القاعدہ کا منصوبہ ساز ابو سلیمان الجزیری اپنے درجن بھر ساتھیوں کے ساتھ مارا گیا۔ الجزیری (الجیریا کا باشندہ) مغرب پر حملوں کی منصوبہ بندی کیا کرتا تھا۔ ایک اور معلوم حملہ اکتوبر 2009ء میں ہوا جس کا نشانہ مولوی فقیر کو بنایا گیا تھا مگر وہ چند لمحے پہلے تباہ ہونے والے گھر سے نکل چکا تھا۔ اس حملے میں مولوی فقیر کے بھتیجے اور داماد کے علاوہ تیس افراد مارے گئے تھے...اس حملے میں باجوڑ کی طالبان شوریٰ کو نشانہ بنایا گیا تھا۔

باجوڑ میں پاکستانی فوج کے حملے

معمولی سلحے سے لیس اور غیر تربیت یافتہ سپاہیوں پر مشتمل فرنٹیئر کور جب فقیر محمد کی قیادت میں مسلح طالبان کا صفایا کرنے میں ناکام ہو گئی تو 2008ء میں پاکستانی فوج کو باجوڑ میں طالبان کے خلاف کارروائی کا فرض سونپا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ علاقے کو طالبان سے صاف کر دیا جائے جنہوں نے وہاں اپنی متوازی حکومت قائم کر رکھی تھی۔ وہ مقامی منڈی کی قیمتیں کنٹرول کرتے

تھے۔ دائیوں کو دائی کے کام سے منع کرتے تھے اور پولیو کے خلاف ویکسین پلانے کی مہم کو روک رہے تھے۔ آپریشن شیر دل اگست 2008ء کی ابتداء میں شروع ہوا۔ اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ افغانستان کے صوبہ کنڑ میں یہاں سے جنگجوؤں کا داخلہ روکا جائے۔ مقامی افسروں کا دعویٰ ہے کہ بیس ہزار فوجی جوان (ان میں باجوڑ کے محافظ اہلکار بھی شامل تھے) ہیلی کاپٹر گن شپس ٹینکوں اور آرٹلری کی طاقت کے ساتھ باجوڑ میں ڈھائی تین ہزار طالبان جنگجوؤں سے نبرد آزما تھے۔ تاہم کئی ذرائع کے مطابق فوجی جوانوں کی تعداد آٹھ ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔

لڑائی کے پہلے ہفتوں میں فوج کو کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ لگتا تھا وہ باجوڑ کے طالبان کی طاقت کو سمجھ نہیں پائی یا موقع پر انہیں صحیح خفیہ معلومات نہیں مل پا رہی تھیں۔ حفاظتی دستوں کو بظاہر طالبان کے ہاتھوں بنی طویل سرنگوں کا بھی علم نہیں تھا۔ طالبان ان سرنگوں میں نہ صرف اپنے ہتھیار رکھتے تھے بلکہ پاکستانی جیٹس (Jets) کے حملے کے دوران وہاں پناہ بھی لیتے تھے۔ فاٹا سیکرٹریٹ کے ایک اعلیٰ افسر حبیب اللہ خان نے کہا: "ان سرنگوں کا سراغ لگایا جاتا ہے اور ان میں بعض میل طوالت کی ہیں۔ فوجی مشن کے دوران جنگجو وہاں کافی عرصے تک چھپ سکتے ہیں۔"[2]

20 ستمبر 2008ء کو باجوڑ کے حملے میں شدت اس وقت آئی جب ایک خود کش ٹرک بمبار اسلام آباد میں واقع ہوٹل میریٹ کی حفاظتی دیوار سے جا ٹکرایا اور اس میں 50 سے زائد شہری جاں بحق ہو گئے اور کم از کم 250 لوگ زخمی ہوئے۔ پاکستانی دارالحکومت میں ہونے والا یہ خطرناک ترین حملہ تھا۔ پاکستانی حکام کا کہنا ہے کہ میریٹ ہوٹل کو نشانہ اس لیے بنایا گیا کہ قومی اسمبلی کی سپیکر فہمیدہ مرزا اس روز صدر اور وزیر اعظم کے اعزاز میں ڈنر دینے والی تھیں۔ تجزیہ نگاروں کا البتہ کہنا ہے کہ اس مقصد کے لیے ہوٹل میں کوئی پیشگی جگہ بک نہیں کرائی گئی تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ ہوٹل کی جگہ استعمال کرنے کے لیے رئیس صدر پوچھے گئے تھے لیکن سرکاری طور پر اسے کینسل کر دیا گیا تھا۔ اس کا شک تحریک جہاد اسلامی پر کیا گیا جس کی جڑیں باجوڑ میں ہیں اور ایک پنجابی طالبان لیڈر محمد قاسمی ظفر (لشکر جھنگوی) اس میں منصوبے کا سرغنہ تھا۔ زرداری نے اس بزدلانہ حملے کی شدید مذمت کی اور ساتھ ہی پاکستان نے باجوڑ میں اپنی کارروائیاں تیز کر دیں۔ جنوبی ایشیا میں مغربی صحافیوں کے ڈین کارلوٹا گال نے آپریشن شیر دل کے چند ہفتوں کے بارے میں لکھا ہے کہ وزیرستان کے بعد باجوڑ غالباً (فاٹا میں گھس آنے والے) طالبان اور القاعدہ جنگجوؤں کا مضبوط ترین گڑھ ہے۔ گال نے اور اس کے شریک مصنف اسماعیل خان نے افسروں کو کہتے سنا ہے کہ عسکریت پسند اس علاقے میں قدم جمانے کے لیے ہر ممکن حربہ استعمال کر رہے تھے۔ انہوں نے طالبان جنگجوؤں کی مزاحمت کی سطح اور ان کے شاندار حربوں، ہتھیاروں اور مواصلاتی

ہاتھوں پر بھی حیرت کا اظہار کیا۔" ان کے زیر استعمال رائفلیں ہماری بہت سی بندوقوں سے زیادہ بہتر ہیں۔" ایک سرکاری افسر نے کہا "ان کے حربے دماغ کو چکرا دیتے ہیں اور ان کے پاس ایسے دفاعی طریقے ہیں، جنہیں تشکیل دینے میں ہمیں کئی دن لگ جائیں۔ ایسا تو لگتا ہی نہیں کہ ہم کسی دیسی ملیشیا سے برسرپیکار ہیں۔ وہ ایک منظم فوج کی طرح جنگ کر رہے ہیں۔"

2008ء کی خزاں میں پاک فوج کے آپریشنز کے دوران طالبان کا مواصلاتی سسٹم آہستہ آہستہ ختم ہونے لگا۔ مہمند اور سالارزئی کے علاقوں میں دن کے دوران ان کی پٹرولنگ کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ فوج نے طالبان کا جبراً قائم ایف ایم ریڈیو بھی بند کر دیا اور طالبان کے کئی تربیتی کیمپ بھی تباہ کر دیئے۔ ستمبر کے آخر تک، پاکستانی حکام کے دعووں کے مطابق باجوڑ میں دو ہزار جنگ جوؤں کا خاتمہ کر دیا گیا تھا۔

اسی دوران حکومت کی جانب سے طالبان کے خطرے کا کوئی موثر جواب نہ ملنے کی وجہ سے غیر سرکاری لشکر یا ملیشیا باجوڑ میں تشکیل پانے لگے۔ گرچہ 2008ء تک ان لشکروں کو استعمال نہیں کیا گیا۔ حکومت کے حامی کئی ملکوں اور ان کے حامیوں کو 2007ء میں طالبان جنگ جوؤں نے نشانہ بنایا تھا۔ تمام قبائلی علاقوں اور ان سے متصل سرحدی سوات، دیر اور بونیر کے اضلاع میں بہت سے با اثر ملک اور لشکر کے حامی قتل کر دیئے گئے۔ طالبان نے قبائلی ملیشیا پر یہ تابڑ توڑ حملے قاری ضیاء الرحمٰن کی کمان میں کیے۔

سالارزئی کے ایک بزرگ نے کہا کہ ہر کے قبیلے کو پاکستانی حکومت پر بہت غصہ تھا کہ وہ باجوڑ کے لوگوں کو تحفظ کیوں نہیں دے رہی اور یہ ہی ہے انہوں نے لشکر ترتیب دیا تھا۔ سالارزئی قبیلے کے کئی افراد کو یقین ہے کہ لشکر، ہمسایوں کی ناگفتہ حالت در اصل پاکستانی ISI کا کام تھا، تاکہ طالبان کے اثر و رسوخ کو قائم رکھا جا سکے۔ (افغانستان میں امریکی اور اتحادی افواج کے خلاف) تاہم اس کا کوئی ثبوت نہیں ملا

مہینوں کی شدید جنگ کے بعد، جس نے 5 لاکھ پاکستانیوں کو بے گھر کر کے رکھ دیا اور پانچ ہزار گھروں کو تباہ کر ڈالا، مولوی فقیر محمد نے فروری 2009ء میں یہ کہہ کر یک طرفہ جنگ بندی کا اعلان کر دیا۔ (ایک ویڈیو پیغام کے ذریعے میں) "ہم فوج سے نہیں لڑنا چاہتے لیکن بعض عناصر ہمارے درمیان غلط فہمیاں پیدا کرتے رہتے ہیں۔ پاکستان ہمارا ملک ہے اور پاکستانی فوج ہماری فوج ہے۔" چار دن بعد، فوج نے باجوڑ میں اپنا آپریشن معطل کر دیا۔ مارچ کے شروع میں فوج نے باجوڑ میں جنگ جوؤں کے خلاف فتح کا اعلان کر دیا اور حکومت نے مہمند قبیلے سے 28 نکاتی معاہدے کا اعلان کر دیا۔ بعد میں یہی معاہدہ ترکانی اور عثمان زئی قبیلوں کے ساتھ بھی کر لیا گیا جس

کے ذریعے اہم پاکستانی طالبان لیڈروں کو حکومت کے حوالے کیا جانا، ہتھیار پھینک دینا اور جنگ جوؤں کی حمایت ختم کرنا تھا۔ ماضی میں اس طرح کے معاہدوں کے ذریعے عموماً طالبان کو دوبارہ منظم ہونے کا موقع مل جاتا تھا۔ یہی کچھ 2009ء کے موسم گرما اور خزاں میں ہوتا دکھائی دیا

اگست 2009ء میں حکومت کے حامی لشکر نے طالبان ترجمان مولوی عمر کو پکڑ کے ایک اہم کامیابی حاصل کی۔ مولوی فقیر محمد کا یہ نائب بہت سے خودکش حملوں اور فوج پر حملوں کا بنیادی منصوبہ ساز سمجھا جاتا تھا۔ اسے طالبان مخالف لشکر نے مہمند کے قریبی علاقے سے گرفتار کیا۔ جنوری 2010ء کے آخر میں فوج نے باجوڑ میں آپریشن کا ایک اور سلسلہ شروع کیا۔ جس میں 25 پنجاب اور 14 پنجاب رجمنٹس، ٹوچی سکاؤٹس اور باجوڑ سکاؤٹس پر مشتمل چار ہزار جوان شریک تھے۔ کئی کاپٹر گن شپس بھی ان کے ساتھ تھے اور انھیں میدان جنگ میں طالبان جنگ جوؤں کا سامنا تھا۔ ایک ہفتے کی لڑائی کے بعد، چند درجن جنگجوؤں نے فوج کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور اس طرح مولوی فقیر کے آبائی شہر داماڈولہ جیسے اہم شہر فوج کے کنٹرول میں آ گئے۔ ہتھیار پھینکنے والوں میں، مہمند کے کالس ایریا کا طالبان کمانڈر مسعود سالار بھی شامل تھا۔ وسط مارچ میں خلیفہ نامی ایک اور اہم کمانڈر نے اپنے چالیس ساتھیوں سمیت ہتھیار ڈال دیے اور دوبارہ کبھی ہتھیار نہ اٹھانے کا وعدہ کیا۔ دماڈولا پر پورے کنٹرول کے بعد وہاں پاکستانی پرچم لہرا دیا گیا۔ "ہم نے طالبان کو مکمل شکست دے دی ہے" فوجی ترجمان میجر جنرل اطہر عباس نے کہا۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ باجوڑ کے 90% سے 95% علاقے پر طالبان کا کنٹرول ختم کر دیا گیا اس میں پچاس سے ساٹھ جنگ جو مارے گئے جبکہ دس فوجی جاں بحق ہوئے۔

مہمند کے لوگوں نے ملٹری آپریشن کا اس یقین کے ساتھ بھرپور خیر مقدم کیا کہ وہ اس بار شدت پسندوں کا مکمل قلع قمع کر دے گی۔ باجوڑ کے ایک باشندے بخت نور شاہ نے بتایا کہ ہمارے لوگوں نے فوج کا اس لیے بھرپور ساتھ دیا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ وہ ہمارے علاقے میں امن قائم کر دے گی۔ اور کئی مقامیوں کا کہنا تھا کہ دماڈولہ پر پاکستانی جھنڈا لہراتے دیکھ کر انھیں خوشی ہوئی۔ انھوں نے وہاں سے فرار ہوتے (طالبان) جنگ جوؤں کو پناہ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ سالارزئی قبیلے کے ایک بزرگ نے کہا، باجوڑ کو شدت پسندوں سے صاف کرنے کے لیے ہمیشہ حکومت کا ساتھ دیتی رہے گی۔ سالارزئی لوگوں نے باقاعدہ اعلان کیا کہ جو شخص بھی طالبان جنگ جوؤں سے تعاون کرے گا اسے دو لاکھ روپے جرمانہ کیا جائے گا اور اس کا گھر مسمار کر دیا جائے گا۔

باجوڑ کا قبائلی ڈھانچہ

ترکانی اور عثمان زئی، باجوڑ کے دو بڑے قبیلے ہیں۔ ان کی مزید قسمیں درج ذیل ہیں

ترکانی

(1) سالارزئی۔ (2) ممیند سالارزئی، کاکازئی۔ (3) چمرقند۔ (4) چارمنگ۔
(5) ناواگئی۔ (6) خار۔

اُتمان خیل

1۔ اسمبل۔ (2) شاموزئی۔ (3) مندل۔ (4) ترخزاس۔ (5) برخزاس۔ (6) آسنگ۔
(7) علی زئی

ترکانی جس میں انتہا پسندوں کی جڑیں ہیں چند لاکھ لوگوں کا قبیلہ ہے اور باجوڑ کی سات میں سے پانچ تحصیلوں میں آباد ہیں۔ ممند، چمرقند، چارمنگ، سالارزئی اور ناواگئی۔

مولوی فقیر محمد پاکستانی طالبان کا سابقہ ترجمان مولوی عمر اور باجوڑ میں طالبان عدالتوں کا سربراہ مفتی بشیر سب کے سب ترکانی ہیں۔ مفتی بشیر کا تعلق ممند سے ہے۔ عثمان خیل قبیلے کے اہم افراد میں چناگئی کا میاں مسعود جان، علی روایت کا حاجی قادر خان، عنائی کا ملک خوشدار اور لوئی کا حاجی بسم اللہ خان شامل ہیں۔ طالبان ان طاقتور قبائلی لیڈروں پر کنٹرول نہیں کر پائے کیونکہ انہوں نے اپنے علاقوں میں طالبان مخالف لشکر قائم کر رکھے ہیں۔

مقامی آبادی کی تکالیف اور مشکلات:

غربت، تعلیم کی کم شرح، صحت کی نامناسب سہولتیں اور بے روزگاری فاٹا کی سات ایجنسیوں کے بنیادی مسائل ہیں۔ سالہا سال سے پاکستانی حکومت انہیں نظرانداز کرتی رہی ہے۔ غربت کا یہ حال ہے کہ فاٹا کے 60% لوگ غربت کی لکیر سے نیچے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ علاقے میں شدت پسندی کی اسے ایک اہم وجہ قرار دیا جاتا ہے۔ فاٹا میں نوید احمد شنواری نامی تجزیہ نگار کا کہنا ہے کہ "قدرتی وسائل سے بہت کم فائدہ اٹھایا گیا ہے اور مقامی آبادی زیادہ تر زراعت، ٹرانسپورٹ، ہتھیاروں کی تیاری اور تجارت پر گزارہ کرتی ہے۔ (سرحد پار حیثیت کی تجارت یعنی سمگلنگ اور دکانداری) تمام گھرانے عام طور پر ایک ہی شخص کی آمدنی پر انحصار کرتا ہے۔ روزگار کے مواقع نہ ہونے کی وجہ سے نوجوان لوگوں کا دوسری سرگرمیوں جرائم، مذہبی انتہا پسندی کی جانب رجحان زیادہ ہو جاتا ہے۔

تجزیہ نگار حنیف کتاب نے 1908ء میں پاکستان انسٹی ٹیوٹ برائے تحقیق امن کے سے

ملک، غربت اور روزگار کا نہ ملنا، دونوں فاٹا میں (عسکریت پسندی کی تہ میں مخفی) انتہائی اہم عوامل ہیں۔ لیکن غربت تو پورے پاکستان میں پھیلی ہوئی ہے اور روزگار کے مواقع میں بھی بہت زیادہ اونچ نیچ آتی رہتی ہے۔ "پاکستانی وزیرِ داخلہ رحمان ملک نے قومی اور بین الاقوامی میڈیا (دونوں) کو بتایا کہ طالبان اپنے ٹرکوں کو بہت اچھی تنخواہیں دیتے ہیں۔" یہ واضح ہے کہ ملک کے دشمن اور (طالبان کے) کرائے کے قاتل، پے "قاتلوں کو خوش رکھنے کے لیے قتل و غارت کی کارروائیاں جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ ہم نے جن کارروائیوں کی بھی تحقیق کی، اس کے ڈانڈے جنوبی وزیرستان سے جا ملتے ہیں۔ رحمان ملک نے یہ بات پارلیمنٹ ہاؤس کے باہر اکتوبر 2009ء میں کی تھی۔

جنوبی وزیرستان القاعدہ، طالبان، غیر ملکی جنگجوؤں اور پاکستان طالبان کے لیے انتہائی محفوظ پناہ گاہ رہی ہے جہاں القاعدہ، طالبان اور بیت اللہ محسود جیسے اہم عسکریت پسندوں کو ڈرون حملوں کے ذریعے موت کے گھاٹ اتارا گیا۔

باجوڑ میں 17 بنیادی کلینک اور ایک جنرل ہسپتال خار میں ہے (ایجنسی کا انتظامی مرکز ہے) باجوڑ کے دس لاکھ سے زیادہ باشندوں کے لیے یہ تعداد انتہائی ناکافی ہے۔ اسی طرح باجوڑ میں 619 سکول جن کو خصوصی طور پر طالبان جنگجو (تعلیم کی مخالفت میں) نشانہ بناتے رہتے ہیں لوئے ہزار بچوں کے لیے کافی نہیں۔

خار تحصیل میں ہائی چینا کے ایک باشندے عبدالقیوم کا کہنا ہے "باجوڑ میں صحت اور علاج معالجے کی سہولتیں بہت کم ہیں... لیکن یہاں عورتوں کو بچے کی ولادت کے لیے ڈسپنسری میں لے جانے کا بھی کوئی تصور نہیں کیونکہ ان ڈسپنسریوں میں انہیں صحیح علاج نہیں ملتا۔" سرانگی کے حبیب اللہ کے مطابق "ہمیں فوجی آپریشن پر کوئی اعتراض نہیں لیکن حکومت ہمیں روزگار بھی تو دے۔ فوجی آپریشن ہمارا پیٹ تو نہیں بھر سکتے"

باجوڑ میں بنیادی ڈھانچے مثلاً سڑکیں وغیرہ بھی نہیں رہیں۔ ناواگئی تحصیل کے علاقے ڈوڈا کے کسان احمد خان نے کہا "سڑکوں کے تباہ ہونے کی وجہ سے ہم اپنی پیداوار بروقت منڈی میں نہیں بھیج سکتے۔ جس سے ہماری زیادہ تر فصل گل سڑ جاتی ہے اور ہمیں بے پناہ نقصان ہوتا ہے۔ ہم نہیں جانتے ہمارے وہ کون سے گناہ ہیں جن کی سزا حکومت ساٹھ سال سے ہمیں دے رہی ہے۔"

مزید برآں مقامی رہنما، پاکستانی فوج اور طالبان جنگجوؤں، دونوں سے خوفزدہ ہیں کیونکہ ان میں سے کوئی بھی باجوڑ میں امن قائم نہیں کر سکا۔ سالارزئی کے ملک عبدالناصر نے کہا "ہم امن اور بہتری کے لیے فوج کی مدد کرتے ہیں کیونکہ فوج اور ہمارے لشکر دونوں کا دشمن

مشترکہ ہے۔ "نائی کے ایک قبائلی بزرگ نے کہا۔ "ہمارے لڑاکا اور فوج شدت پسندوں کا صفایا کرنے کے لیے مشترکہ گشت کرتے ہیں۔ کیونکہ فوجی اس علاقے کی روایات سے ناواقف ہیں۔ ہم انھیں خفیہ معلومات فراہم کرتے ہیں اور شدت پسندوں سے آمنے سامنے بھی لڑتے ہیں۔ ضرورت پڑے پر ہمیں اکیلا نہیں چھوڑا جانا چاہیے کیونکہ ہمارا مقصد ایک ہے اور وہ ہے باجوڑ سے طالبان کا خاتمہ۔"

2008 کی خزاں کے فوجی آپریشن میں 5 لاکھ کے لگ بھگ باجوڑی اپنے علاقے سے دربدر ہوئے۔ انھیں یہ پریشانی طالبان اور فوج دونوں کی جنگی کارروائیوں کی وجہ سے اٹھانا پڑی۔ ان میں بہت سے لوگ سرحد کے علاقوں مردان، صوابی اور پشاور میں پناہ گاہوں سے واپس اپنے گھروں کو لوٹ چکے ہیں لیکن بہت سے ابھی تک جلوزئی، نوشہرہ اور پشاور کے کیمپوں میں مقیم ہیں۔ جلوزئی کیمپ میں مقیم ایک شخص نے کہا۔ "اگر وہاں طالبان نہ ہوتے تو فوج بھی نہ آتی۔" دونوں پر اپنا غصہ اتارتے ہوئے اس نے کہا کہ باجوڑ آپریشن کے دوران فوجی ہیلی کاپٹروں نے بہت جانی نقصان کیا۔ ماموند کے رہائشی ایک شخص نے خواہش ظاہر کی کہ پاکستانی حکومت اس کا گھر دوبارہ تعمیر کروائے۔ کیونکہ وہ فوجی آپریشن کے دوران تباہ ہوا تھا۔

رحمن اللہ پشاور میں بی بی سی کے نمائندہ ہیں۔

خیبر میں عسکریت پسندی اور تصادم

راحیل خان اپریل 2010ء

پاکستان کا شمال مغربی علاقہ، ڈیورنڈ لائن کے بالکل ساتھ ساتھ، خیبر ایجنسی کہلاتا ہے۔ اس کے سرحد کے دوسری طرف تورا بورا کے غاروں کا (مشہور پناہ گاہوں کا) پیچیدہ سلسلہ ہے جس سے 200 ء کے آخر میں اسامہ بن لادن فرار ہوا تھا۔ تاریخی درہ خیبر کے نام سے موسوم خیبر ایجنسی کا رقبہ 2576 مربع کلومیٹر ہے اور اس کی آبادی پانچ لاکھ سینتالیس ہزار کے لگ بھگ ہے۔ اس کے تین انتظامی یونٹ ہیں۔ باڑہ، جمرود اور لنڈی کوتل۔ دور دراز تیراہ وادی گرچہ چھوٹی سی ہے مگر جغرافیائی نقطہ نظر سے بہت اہم ہے اور کہا جاتا ہے کہ 2001ء میں امریکی اور نیٹو افواج کے افغانستان پر حملے کے بعد القاعدہ کے عسکریت پسند اسی راستے کو اپنے فرار کے لیے استعمال کرتے رہے ہیں۔ وادی تیراہ، خیبر ایجنسی ہی کی طرح، آفریدی قبیلے کا علاقہ ہے اور ہمیشہ سے ہی مجرموں اور اسلامی انتہاپسندوں کی محفوظ پناہ گاہ رہی ہے۔

خیبر ایجنسی میں جدید عسکریت پسندی کے مختلف رخ ہیں۔ فرقہ وارانہ قتل و غارت، کسی گروہ کی طالبان کی طرز کی حکومت قائم کرنے کی حامی، اور ڈرگ مافیا تمام ہی ایجنسی میں آگ بھڑکانے کے ذمہ دار ہیں۔ لشکر اسلام، انصار الاسلام اور تحریک طالبان پاکستان کی علاقے میں سرگرمیاں خیبر کے باشندوں کے لیے وبال جان بنی ہوئی ہیں۔ مشاہدہ کاران گروپوں میں کوئی امتیاز نہیں کر پاتے حالانکہ یہ سب آپس میں بھی متصادم رہتے ہیں۔

خیبر میں شورش کا ڈھانچہ

خیبر ایجنسی کو، اس کی شہری طرز زندگی اور پشاور کے نزدیک ہونے کی وجہ سے جدید سہولتوں کی آسانی کی بنا پر نسبتاً ترقی یافتہ اور جدید سمجھا جاتا رہا ہے۔ نائن الیون کے بعد خیبر میں مشکل صورت حال 2003ء میں اس وقت پیدا ہوئی جب حاجی نامدار نامی ایک مقامی قبائلی تاجر

2 سال کے بعد سعودی عرب سے لوٹا اور اس نے طالبان سٹائل ایک تنظیم "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" وادی تیرہ میں قائم کی۔ حاجی نامدار کی سماجی اصلاحات انتہائی سخت اور تیز تھیں۔ اس نے موسیقی کی ممانعت کر دی، منڈی کوتل میں موسیقی کی چیزوں کی دکانیں بند کروا دیں۔ مقامی لوگوں کو داڑھی بڑھانے اور خواتین کو برقع پہننے کے احکامات کر دیے۔ خیبر کے بعض علاقوں میں نامدار رحمان نے مسجدوں میں حاضری کو یقینی کرنے کے لیے رجسٹر متعارف کر دیے۔ مخالفت کرنے والوں کو سرعام مارا پیٹا جاتا یا نجی جیل (جس کا نام گوانتاناموبے اور ابوغریب رکھ گیا تھا) میں بند کر دیا جاتا۔ نامدار نے اپنے پیغامات لوگوں تک پہنچانے کے لیے سب سے بہتر طریقے اختیار کیے۔ اس کے ساتھیوں میں کہا جاتا ہے کہ عرب جنگجو بھی شامل تھے جو افغانستان میں امریکی افواج کو نشانہ بناتے رہے... اس وقت سے ہی وادی تیرہ مقامی اور غیر ملکی جنگجوؤں کا مضبوط گڑھ رہے ہیں۔ نامدار رحمان نے اپنا ایک غیر قانونی ایف ایم ریڈیو چینل قائم کیا۔ خیبر ایجنسی میں یہ پہلا ریڈیو تھا۔ اس نے شیعہ واعظ منیر شاکر کو ریڈیو پر انقلابی وعظ کرنے کے لیے باقاعدہ کام پر رکھا۔ دسمبر 2004ء میں حکومت نے اس ریڈیو کو بند کرنے کے احکامات جاری کیے مگر نامدار نے ریاست کی رٹ کو نہ مانتے ہوئے براڈکاسٹنگ جاری رکھی اور اپنے آپریشنز کا دائرہ کار اور بڑھا دیا... وہ لاشعوری طور پر دوسرے جنگجو گروہوں کے لیے ایک ماڈل تشکیل دے رہا تھا۔ حاجی نامدار کی سرگرمیوں نے شدت پسند گروہوں کے لیے گویا میدان ہموار کیا اور 2005ء تک وہاں لشکر اسلام (مفتی منیر شاکر) اور منگل باغ جولائی 2006ء میں انصار الاسلام (قاضی محبوب اور مولانا احمد) اور خیبر میں تحریک طالبان پاکستان کا خیبر ایجنسی میں داخلہ انہی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ پاکستانی حکومت اس سارے پراسس کے دوران علاقے سے غائب تھی۔ بالآخر تحریک امر بالمعروف، لشکر اسلام اور انصار الاسلام پر جون 2008ء میں پابندی لگا دی گئی۔

مفتی منیر شاکر اور پیر سیف الرحمٰن بالادستی کی پیاس

خیبر کے علاقے میں قتل و غارت مذہبی افراد کے اختلافات سے عبارت ہے۔ ان میں ایک پیر سیف اللہ بریلوی عقائد کا ہے اور دوسرا دیوبندی خیال کا مفتی منیر شاکر ہے۔ دونوں سنی عقیدے سے ہیں۔ ان میں اختلاف محض یہ ہے کہ بریلوی پیری فقیری کو (اور پیغمبر اسلام سے ان کے روحانی تعلق کو) مانتے ہیں اور دیوبندی عقیدے کے مطابق حضرت محمدؐ روحانی قوتوں کے حامل ایک انسان تھے اور ان کی اس حالت کو بڑھا چڑھا کر پیش نہیں کرنا چاہیے۔

پیر سیف الرحمٰن افغان ہے اور وہ 1977ء میں باڑا میں آباد ہوا تھا۔ وہ اسلام کے

بریلوی فرقے کا بھی حامی ہے۔ پاکستان اور افغانستان کے کئی حصوں میں بہت سے لوگ اسے روحانی بزرگ سمجھتے ہیں۔ مقامی آفریدی قبائل نے پیر رحمان کی بھرپور مدد کی اور وہ اب بھی چینل کے ذریعے پورے علاقے میں معروف مبلغ کے طور پر جانا جانے لگا۔ مفتی منیر دیوبندی عالم ہے (کرک سے)۔ اسے فرقہ وارانہ فسادات کو ہوا دینے کی وجہ سے کرم ایجنسی سے نکال دیا گیا تو وہ خیبر کے علاقے میں آ گیا۔ دونوں مذہبی شخصیتوں کا تعلق خیبر سے نہ ہونے کے باوجود انہوں نے یہاں بھی فرقہ وارانہ اختلافات کو ہوا دی ہوئی (اور اپنے اپنے ریڈیو سٹیشنز پر ایک دوسرے پر حملے کرنے لگے) اور نومبر 2005ء میں ان کے پیروکاروں میں جو میں فسادات شروع ہو گئے۔

دونوں نے ہی ایک دوسرے کو خیبر چھوڑ دینے کے فتوے دینا شروع کر دیے۔ اپنے اپنے حامیوں کے جلوس نکالنے لگے۔ باڑہ سے باہر کے لوگ بھی اس جنگ میں شریک ہونے اور اپنے اپنے فرقے کی مدد کے لیے تیار ہونے لگے۔ بریلوی مکتبہ فکر کے لوگوں نے (یہ پاکستان میں ایک بڑا فرقہ ہے) پیر رحمان کی حمایت میں پورے پاکستان میں احتجاجی مظاہرے کیے۔

2005ء کے آخر اور 2006ء کے شروع میں پیر رحمان اور مفتی منیر کے مابین حالات اور سنگین ہونے تو مسئلے کے حل کے لیے لوگوں نے حکومت کی توجہ چاہی مگر ادھر سے کوئی خاص جواب نہیں ملا۔ حکومتی مداخلت میں تاخیر نے علاقے میں تجارت کا حال بیٹھ کر دیا جس میں درجنوں جانیں ضائع ہو گئیں۔ بہت سے لوگ زخمی ہوئے اور علاقے کے امن اور تجارت کو زبردست نقصان پہنچا۔ مقامی علماء کے، میر احمد خان کی سربراہی میں ایک امن کمیٹی بنائی گئی مگر وہ تصادم کو روک سکے اور امن قائم کرنے میں ناکام ہو گئی۔

آفریدی قبیلے نے مولانا احمد کو ہٹا کر حاجی نامدار کو اس کمیٹی کا سربراہ بنا دیا جسے حکومت اور خیبر کی اسمبلی کے رکن مولانا خلیل الرحمن نے مسترد کر دیا کیونکہ حاجی نامدار کا تعلق مفتی منیر سے تھا اور اس سے خطرہ تھا کہ وہ علاقے میں طالبانائزیشن کو رواج دے گا۔ مفتی منیر کے گروپ نے انتظامیہ اور سابقہ امن کمیٹی پر قمبر آباد میں 24 فروری 2006ء کو پشاور سے صرف ۱۰ کلومیٹر دور حملہ کر دیا جس میں امن کمیٹی کے سربراہ عجیب خان سمیت سات افراد جاں بحق ہو گئے۔ جواباً حکومت نے باڑہ میں ایک بڑا آپریشن شروع کر دیا۔ غیر جانبدار لوگوں کو علاقے سے نکل جانے کے لیے کہا گیا کیونکہ منیر گروپ لوگوں کو حکومت کے خلاف اکسا رہا تھا۔ قبائلی جرگے کی درخواست پر حکومت نے فوجی ایکشن ملتوی کر دیا تاکہ جرگے کو مسئلے کے حل کا پرامن موقع مل سکے... بالآخر وہ دونوں گروپوں پر دباؤ ڈالنے پر کامیاب ہو گئے اور سیف الرحمن اور مفتی منیر نے خیبر سے نکل جانے پر اتفاق کر لیا۔

حکومت نے ان دونوں کو جنوری 2006ء میں علاقے سے نکل جانے کا حکم دیا تھا اور مقامی قبائل کے جرگے نے بھی اس فیصلے کی بھرپور حمایت کی تھی۔ چنانچہ پیر سیف الرحمن صاحب چلا گیا اور مفتی منیر کو ملک سے باہر جاتے ہوئے کراچی ایئرپورٹ پر گرفتار کر لیا گیا۔ چند روز کی نظر بندی کے بعد 2 اگست 2007ء کو رہا کر دیا گیا۔ مفتی منیر کے مطابق اس کی رہائی غیر مشروط تھی۔

پیر رحمان اور مفتی منیر کی غیر موجودگی کے باوجود خیبر میں امن قائم نہیں ہو سکا۔ ان کے حامی لشکر اسلام اور انصار الاسلام آپس میں ایک دوسرے سے الجھتے رہے۔

لشکر اسلام اور انصار الاسلام

مفتی منیر شاکر نے لشکر اسلام 2005ء میں تشکیل دی تھی تاکہ دیوبندی انتہا پسند نظریات کو آگے بڑھایا جا سکے۔ بدامنی اور عسکریت غالباً ان کے مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ تھے۔ فروری 2006ء میں جب مفتی منیر کو علاقے سے نکال دیا گیا منگل باغ نامی ایک سابقہ بس ڈرائیور کو لشکر اسلام کا سپریم کمانڈر بنا دیا گیا۔ گروپ میں کئی اہم کمانڈر شمس محمد طیب اور منصور حال موجود ہیں۔ قبائلی عمائدین میں مصری گل، حجی گل اور حاجی حلیم شاہ اور مختلف قبائل کے [illegible] دوسرے افراد لشکر اسلام کی شوریٰ میں شامل ہیں۔ [illegible] رحمان گروپ کا ترجمان ہے۔ لشکر اسلام لوگوں کو بھرتی کرنے کے لیے مالی معاونت کا سہارا بھی لیتا ہے۔ فاٹا کے دوسرے علاقوں کی طرح خیبر بھی بہت غریب اور پسماندہ علاقہ ہے اور حکومتی کرپشن سے بری طرح متاثر بھی ہے۔ لشکر اسلام رنگروٹوں کو 80 سے سو ڈالر تک ماہانہ ادا کرتا ہے اور جنگ جوئی کاروائیوں کے دوران کھانا بھی مفت دیتا ہے۔

لشکر اسلام کا بڑھتا ہوا اثر روکنے کے لیے 8 جولائی 2006ء کو انصار الاسلام بنائی گئی۔ یہ تنظیم دیوبندی مکتب کے معتدل تنظیم اتحاد علماء نے تشکیل دی اور اس میں سابقہ امن کمیٹی کے ارکان پیر رحمن کے حامی قبائلی عمائدین شامل تھے۔ اہم بات یہ ہے کہ پیر رحمن گروپ کے بریلوی اراکین بھی انصار الاسلام کی اس کے دیوبندی نظریے کے باوجود حمایت کرتے ہیں۔ یہ تنظیم مقامی بزرگ قاضی محبوب الحق امن کمیٹی کے سابقہ سربراہ احمد خان پر مشتمل ہے اور غلام نبی اور محمد حسین سمیت 20 مختلف قبائل کے عمائدین اسکی شوریٰ میں شامل ہیں۔ [illegible] تنظیم کے نائب امیر اور گروپ کے ترجمان ہیں... انصار الاسلام کا مولانا فضل الرحمن کی JUI سے قریبی تعلق ہے۔ انصار الاسلام نے جب باڑہ میں اپنے حامیوں کا جلوس نکالا تو وہ جمعیت علمائے اسلام کے

جھنڈے لیے ہوئے تھے اور فضل الرحمن گروپ سے اپنی وابستگی کا واضح اظہار کر رہے تھے۔

خیبر ایجنسی میں عسکریت پسند گروپس

انصار الاسلام   لشکر اسلام   تحریک طالبان پاکستان اورکزئی ایجنسی سے تعلق

حضرت یحییٰ اور حضرت علی TTP کے کمانڈرز برائے لنڈی کوتل

نذیر آفریدی کمانڈر تحریک طالبان پاکستان

منگل باغ آفریدی (امیر)

قاضی محبوب الحق۔ امیر

حمزہ ترجمان   د رحمان ترجمان

محمد طیب ، احسان، منظور، رضوان اہم کمانڈرز

طیب، مصری گل، جنت گل، جان گل، موسیٰ خان کے شوریٰ اراکین اور 25 دوسرے

ڈاکٹر نعیم نائب امیر اور ترجمان

مولانا احمد، غلام نبی کی شوریٰ کے ارکان اور 20 دوسرے

منگل باغ کا ظہور

35 سالہ منگل باغ کا تعلق آفریدی قبیلے کے ساتھ ہے اور سیاسی طور پر کمزور شاخ سپاہ سے ہے۔ آفریدی قبیلے کی خیبر کے علاقے میں اکثریت ہے۔ اس کے والد کا اس کے بچپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا اور اس کی ماں نے تن تنہا اس کی پرورش کی۔ منگل باغ نے روایتی تعلیم حاصل نہیں کی لیکن کچھ عرصہ اس نے ایک مدرسے میں بسر کیا۔ (وہاں بھی وہ کوئی مذہبی تعلیم حاصل نہیں کر سکا۔) ٹرکوں کی صفائی کرنا اس کا پہلا کام تھا تاہم اس کا دعویٰ ہے کہ وہ بس ڈرائیور رہا۔ اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ وہ اپنے ہی خاندان کی ملکیتی بسیں چلایا کرتا تھا۔

باغ نہایت چالاک سیاسی ذہن کا مالک ہے۔ اس نے افغان جہاد میں حصہ لیا لیکن واپس آکر عوامی نیشنل پارٹی جیسی سیکولر پارٹی میں شامل ہو گیا۔ اے این پی وہ جماعت ہے جس نے سوویت مخالف جہاد کی شدید مخالفت کی تھی اور اسے فساد قرار دیا تھا۔ اب اے این پی فاٹا کی مذہبی گروپوں کے تحت حملوں کی زد میں ہے۔ وہ سرگرم جہادی کارکن رہا اور ANP ایک سیکولر جماعت ہے مگر اس نے ان متصادم مفادات کو کبھی کوئی اہمیت نہیں دی۔ اس نے اے این پی کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کیا اور 200ء میں بارہ ٹرانسپورٹ ایسوسی ایشن کا سیکرٹری بن گیا۔

منگل باغ ایک امن پسند تبلیغی جماعت میں شامل ہونے کے بعد مفتی منیر سے ملا۔ لشکر

اسلام کے ذریعے۔ اس کے عروج کی تفصیلات واضح نہیں لیکن مفتی منیر کے خیبر سے نکالے جانے کے بعد ہوا یہ کہ اسے لشکر اسلام کا امیر بنا دیا گیا۔

منگل باغ کا سیاسی پروگرام مجرمانہ اور ڈرگ سینڈیکیٹ کے منفی اثرات اور غیر موثر حکومتی اقدامات پر بھرپور روشنی ڈالتا ہے وہ اپنے آپ کو غریبوں کا زبردست حامی اور قبائلی ملکوں کا سخت مخالف ظاہر کرتا ہے۔ حکومت سے ناجائز مفادات حاصل کرنے والے امراء کا وہ شدید ناقد ہے۔ منگل باغ عام لوگوں کے مسائل کی بات کرتا ہے اور اسی بات نے لشکر اسلام میں موجود نوجوانوں کو اس کا گرویدہ بنا دیا ہے۔ اس نے اپنے گرد بھی ایک خوف کا دائرہ بنا رکھا ہے۔ ہتھیاروں سے مسلح بہت سے محافظ اس کے ارد گرد رہتے ہیں اور مفتی منیر سے متاثر ہو کر شریعت کے نفاذ میں بھی طاقت کا استعمال کرتا ہے۔ اس نے باڑہ تحصیل میں مردوں کو ٹوپی اور عورتوں کو برقع پہننے کا حکم دیا۔ جون سے جولائی 2006 تک حکومت کو باڑہ کی مرکزی مارکیٹ کو بند کرنا پڑا کیونکہ منگل باغ نے کہا تھا کہ وہ علاقے کا کنٹرول سنبھال رہا ہے۔ اس نے موسیقی کی شاپ چلانے والوں اور منشیات کے تاجروں کو باڑے میں کام کرنے پر پابندی لگا دی۔ وہ اپنے ریڈیو سٹیشن پر بڑی پابندی سے مذہبی معاملات پر گفتگو کرتا ہے۔ اس نے خیبر میں لا اینڈ آرڈر کا ایک سسٹم متعارف کرایا ہے۔ مجرموں پر بھاری رقوم کے جرمانے عاید کر دیے۔ مثلاً قتل پر تقریباً 6000 امریکی ڈالر، ٹی وی سیٹلائٹ رکھنے پر 600 امریکی ڈالر اور پنج وقتہ نماز کی عدم ادائیگی پر 8 امریکی ڈالر سزا ہے۔

2006ء میں مفتی منیر کے علاقے سے نکالے جانے کے بعد منگل باغ نے باڑہ کے گاؤں GAGRINA میں لشکر اسلام کی سرگرمیاں جاری رکھنے کے لیے اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا۔ گروپ شروع شروع میں غیر متحرک رہا لیکن اسلامی لیڈر کے طور پر اپنی ظاہری اور نظریاتی جگہ بنانے کے بعد اس نے ریاست کی رٹ کو کھلم کھلا چیلنج کر دیا۔ اس نے حکومت کو متنبہ کیا کہ وہ اس کے ہتھیار ڈالنے کے احکامات واپس لے ورنہ وہ حکومت کے خلاف زبردست مسلح کارروائی کرے گا۔ اس نے کہا: "اب ہمارے لیے امن سے رہنا بہت مشکل ہے۔ یہ تصادم صرف خیبر ایجنسی تک ہی محدود نہیں رہے گا بلکہ تمام پشاور ریجن میں پھیل جائے گا۔" اس قسم کی جذباتی باتوں کے ساتھ ساتھ منگل باغ نے اپنا اثر و رسوخ کو قائم رکھنے کے لیے سیاسی حکمرانوں سے بھی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا۔

کافی حد تک خیبر کے علاقے میں بہت سے لوگوں کو یقین تھا کہ منگل باغ کو فوجی اسٹیبلشمنٹ کی آشیرباد حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے تحریک طالبان پاکستان کی تعاون اور

الاسلام کی کئی پیش کشوں کو مسترد کیے رکھا۔ کئی بار 2008-9ء میں پاکستانی طالبان (TTP) کے درمیان نے درمیانے کے کئی لیڈروں نے باڑہ (اور وادی تیراہ) کا دورہ کیا تاکہ اسے افغانستان میں کارروائیوں کے لیے اشتراک پر قائل کیا جا سکے۔ صراطِ مستقیم نامی فوجی آپریشن کے دوران، جون 2008ء میں اس نے اپنے حامیوں کو مزاحمت سے منع کیا۔ منگل باغ کسی بھی قیمت پر تحریک طالبان پاکستان کو خیبر میں داخل ہونے سے روکنا چاہتا تھا۔ جوں جوں اس کی حیثیت میں اضافہ ہوا اس کی کارروائیاں باڑہ سے جمرود (وادی تیراہ اور پشاور شہر) تک بڑھ گئیں۔ لیکن پاکستانی طالبان کی مخالفت کے باوجود منگل باغ حکومت کا اتحادی نہیں بن سکا اور اپوزیشن میں رہتے ہوئے بھی خیبر ایجنسی میں شریعت کے نفاذ کے لیے وقف رہا۔

باغ نے باڑہ اور وادی تیراہ میں انصار الاسلام کے خلاف کارروائیاں جاری رکھیں بلکہ ان کا دائرہ پشاور کے مضافات تک بڑھا دیا۔ اس کے حامی ان مضافات میں پٹرولنگ کرنے لگے۔ مسلح طاقت کے زور پر موسیقی سے متعلق دوکانداروں کو دھمکیاں دینے لگے۔ جون 2008ء کے آخری ہفتے میں باغ کے ساتھیوں نے پشاور کے اکیڈمی ٹاؤن سے 16 کرسچین اغوا کر لیے۔ بعد میں انہیں قبائلی جرگہ کی مدد سے آزاد کرا لیا گیا لیکن یہ حرکت لوگوں اور حکومت کے لیے واضح اشارہ تھا کہ منگل باغ اپنے برانڈ کا اسلام خیبر ایجنسی سے باہر بھی پھیلانا چاہتا ہے۔

پاکستانی حکومت پشاور شہر میں دہشت گردانہ واقعات کا منگل باغ کو ذمہ دار ٹھہراتی ہے۔ پشاور پولیس کے چیف نے دعویٰ کیا کہ 29 ستمبر 2009ء کے کار بمبنگ کے واقعے میں لشکر اسلام ملوث تھا۔ اس میں 90 لوگ جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ کئی بڑے تفتیش کاروں کو یقین ہے کہ لشکر اسلام پشاور کے اور کئی دھماکوں میں بھی ملوث ہو سکتا ہے۔

خیبر میں تحریک طالبان پاکستان کی کارستانیاں

منگل باغ کی لاقانونیت اور مذہبی قدامت پسندی کے باوجود تحریک طالبان پاکستان کو خیبر میں منظم ہونے میں مشکلات کا سامنا تھا۔ لشکر اسلام اور تحریک امر بالمعروف نے TTP کی شدید مزاحمت کی کیونکہ وہ آزادانہ کارروائیوں کے قائل تھے اور ان کا ایجنڈا بہت ہی مقامی انداز کا تھا۔ شمالی اور جنوبی وزیرستان اور افغانستان میں شدید دباؤ میں آنے کے بعد، القاعدہ اور TTP 2008ء میں خیبر اور پشاور میں نیٹو کی سپلائی پر حملے کرنے لگے لیکن منگل باغ اور حاجی نامدار سے مذاکرات سے معاہدے میں ناکامی کے بعد انہوں نے متعدد سرحدی افغان کمانڈر کی قیادت میں اچھے کچھ لوگ اس کے پاس بھیجے۔ حاجی نامدار نے شروع میں ان کی مہمان داری کی اور انہیں

ہتھیاروں اور رسد کی نقل و حرکت میں مکمل تحفظ کا یقین دلایا لیکن TTP ان لوگوں سے جو ان کی موجودگی ناپسند کرتے تھے، متصادم ہوگئی اور قبائلی جرگے پر خودکش حملہ کر ڈالا جس میں 40 سے زائد قبائلی عمائدین جاں بحق ہوگئے۔

امریکی دباؤ کے نتیجے میں پاکستانی حکومت نے (جون۔جولائی 2008ء میں) خیبر میں صراط مستقیم آپریشن شروع کیا تاکہ خیبر سے جانے والے راستوں کو محفوظ کیا جاسکے پاکستانی فوج کا آپریشن بہت کامیاب رہا اور پاکستانی طالبان پسپا ہوکر واپس اپنے محفوظ پناہ گاہوں میں چلے گئے۔ بہت سے جنگجو اس آپریشن میں گرفتار ہوئے۔ان کے ہتھیار رسید کر دیے گئے۔چونکہ ان کا میزبان اور واحد محافظ حاجی نامدار اس علاقے کا نہیں تھا اور غالباً TTP جنگجوؤں کی پناہ گاہوں سے باخبر تھا اس لیے بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ اس نے پاکستانی فوج کو ان کے ٹھکانوں کے بارے میں لاعلم رکھا۔حاجی نامدار نے بہرحال اپنے مقامی ریڈیو چینل پر یہ اعلان کیا کہ استاد یاسر اور اس کے آدمیوں کو ہتھیار ڈال دینے چاہئیں یا جنوری 2007ء میں جنوبی وزیرستان کے قبائل کے ہاتھوں ازبک جنگجوؤں جیسے قتل عام کا سامنا کریں۔حاجی نامدار نے وضاحت کی کہ اسے فوج کی مکمل حمایت حاصل ہے اور وہ شر پسندوں سے بالکل خائف نہیں۔

مقامی لوگوں کا خیال ہے کہ پاکستان خفیہ اداروں اور CIA نے حاجی نامدار کی وفاداریاں ایک لاکھ پچاس ہزار ڈالر میں خریدی تھیں۔اس پر تحریک طالبان پاکستان نے خودکش حملہ کرایا اور پھر میزائل کا نشانہ بھی بنایا گیا مگر وہ ان سے بچ نکلا۔تاہم 12 اگست 2008ء کو اپنے ہی دفتر میں نامعلوم حملہ آوروں کے ہاتھوں مارا گیا۔ TTP کے نئے امیر حکیم اللہ محسود نے اس قتل کی ذمہ داری قبول کی۔

تحریک طالبان پاکستان کو خیبر ایجنسی میں قدم جمانے میں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔منگل باغ اور نامدار خان کو اتحاد میں شامل کرنے میں انہیں کوئی خاص کامیابی نہیں ملی۔تاہم اب پاکستان طالبان کو نذیر آفریدی، حمزہ، حضرت جی اور حضرت علی جیسے سرکردہ کمانڈروں کی شمولیت کے ساتھ خیبر میں اہم حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ TTP کے مضبوط گڑھ اورکزئی کے رہنماؤں اسلم فاروقی اور سعید خان کا ان مقامی رہنماؤں کے ساتھ مستقل رابطہ ہے۔

پاکستانی طالبان کے ہاتھوں، حاجی نامدار کا قتل گروپ کی ایک بڑی کامیابی تھی۔اب یہ نیٹو فوج کی رسد پر حملے کے لیے خیبر ایجنسی کو استعمال کر رہے ہیں۔ فوجی اور بین الاقوامی تنظیموں کے افراد اغوا کیے جا رہے ہیں، دہشت گردوں پر حملوں کے منصوبے بن رہے ہیں۔اب تک سات سو کار گو ٹرک اور فوجی گاڑیاں تباہ کیے جا چکے ہیں۔تمام رسد کا چھوٹا سا حصہ ہونے کے

بالخصوص ایشیا خاصی بڑی مقدار میں تھیں۔

2009ء کے شروع میں نیٹو اور اتحادی افواج کی 80% سے زیادہ سپلائیز پاکستان کے راستے کی جاتی تھیں۔ ایجنسی میں سے جانے والے اشیائے رسد کے یہ قافلے جنگ جوؤں کے لیے انتہائی دلکش ٹارگٹ بن گئے۔

پاکستان کے حفاظتی اداروں نے رسد کے ان راستوں کو کھلا رکھنے کے لیے بہت محنت کی ہے۔ مئی 2009ء میں کسور کے مقرر کردہ یحییٰ مصطفیٰ نامی افغان (جو اتحادیوں میں ہجرت کے نام سے مشہور تھا) پشاور میں فوج کے ہاتھوں مارا گیا۔ پشاور، طورخم روڈ پر نیٹو کی سپلائیز کو منقطع کرنے اور تباہ کرنے کی تمام تر ذمہ داری ہجرت ہی کی تھی۔ وہ کافی عرصہ حکام کی واچ لسٹ میں رہا۔ وہ پہلے بھی جمرود کے ایک ہوٹل ٹھکانے سے نیٹو سپلائیز پر حملے کی کئی وارداتوں میں ملوث ہونے کی وجہ سے گرفتار کیا گیا تھا۔ 5 اگست 2009ء کے ایک ڈرون حملے میں TTP کے بیت اللہ کی وفات کے بعد گروپ نے خیبر ایجنسی میں بے انتہا خوفناک حملہ کیا۔ اگست 2009ء کے آخری ہفتے میں طورخم میں پاک افغان سرحد کے ساتھ ایک پولیس پوسٹ پر حملہ کیا گیا جس میں 22 افراد مارے گئے۔ خیبر ایجنسی میں TTP کے یہ حملے اور بھی بڑھ سکتے ہیں کیونکہ جنوبی وزیرستان میں کیے گئے راہ نجات آپریشن کے نتیجے میں (اکتوبر 2009ء میں) طالبان جنگ جو اورکزئی اور خیبر ایجنسی میں آن پہنچے ہیں۔

TTP کے خیبر ایجنسی کے مقامی جنگ جوؤں کے ساتھ تعلق کے باوجود لشکر اسلام کی کارروائیاں بشمول سرحد سے دوری کی ترتیب، بارہ، خیال، باڑہ، مرو اور تیراہ..... پشاور کے مضافات میں بدستور جاری ہیں۔ لوگ خوف میں زندگی گزار رہے ہیں اور وہ حکومت سے جنگ جو گروہوں کے خلاف ٹھوس اقدامات کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ نومبر 2009ء کے آخری ہفتے میں، حکومت نے خیبر کے علاقے میں فوجی آپریشن (تم مجھے پسند کرو گے) شروع کیا۔ حکومت کا دعویٰ ہے کہ اس سے تیراہ اور باڑہ میں جنگ جوؤں کو خاصا نقصان پہنچا ہے۔

پاکستانی فوج کے حملے

پاکستانی فوج نے خیبر ایجنسی میں کئی آپریشن کیے جن کے نام یہ ہیں: "میں آ گیا" "میں دوبارہ آ گیا"، "صراط مستقیم" اور "تم مجھے پسند کرو گے"۔ (یہ سب نام پشتو میں رکھے گئے تھے) ان آپریشنوں کا بنیادی مقصد منگل باغ، تحریک طالبان پاکستان اور دوسرے جنگ جوؤں کو طارق آفریدی گروپ اور انصار الاسلام سے علیحدہ کرنا تھا تاکہ پشاور پر موجود دباؤ کو ختم کیا جا سکے

اور درہ خیبر کے ذریعے نیٹو کے سامان رسد کی نقل و حمل کو محفوظ کیا جا سکے۔ ان آپریشنز کا سلسلہ 2007ء کے موسم گرما میں شروع ہوا۔ ان میں سے پانچ خوش اسلوبی سے مکمل ہوئے جبکہ بعض آپریشنز مثلاً جون 2008ء کا حملہ فرنٹیئر کور کے ذریعے کیا گیا جو ہنوز ناقص تربیت اور جامد سوچ کے لیے خاصا معروف ہے۔ ... شدت پسندوں کے خلاف فوجی "آپریشن "تم مجھے پسند کرو گے' کے بعد فوجی حکام نے دعویٰ کیا کہ انہوں نے باڑہ اور تیرہ وادی اور ارد گرد کے علاقوں میں کامیابیاں حاصل کی ہیں مگر وہ جنگ جوؤں کا صفایا کرنے میں ناکام رہے۔ یہ کارروائی خاصی مختصر ہی تھی۔ اس میں بمشکل 200 فوجی شامل تھے۔ لنڈی کوتل میں فوجیوں کی یہ تعداد کنٹرول کرنے کے لیے انتہائی ناکافی تھی۔ فوج بدرو گن شپ، ہیلی کاپٹر، جنگی جیٹ طیاروں اور بھاری آرٹلری طالبان کو ختم کرنے کے لیے استعمال کرتی رہی ہے لیکن ان اقدامات سے بھی علاقے کو محفوظ نہیں بنایا جا سکا۔ حملے آج بھی جاری ہیں۔

فروری 2010ء کی ابتدا میں TTP کے جنگ جوؤں نے خودکش بمباروں سمیت خیبر میں نیٹو کے ٹرمینلز پر حملہ کیا۔ کئی فوجی پوسٹوں کو نشانہ بنایا، الیکٹریکل سب اسٹیشن کو تباہ کر دیا اور ایک بچے کو بھی قتل کر ڈالا۔ خود پاکستانی فوج کے بھی، خیبر میں، کئی جوان مارے گئے۔ 10 فروری 2010ء کو ایک تباہ شدہ ہیلی کاپٹر کے پائلٹ اور گنر کی لاشوں کے حصے تلاش کرتے ہوئے فوجی ریسکیو پارٹی کا سربراہ ایک بریگیڈیئر طالبان جنگ جوؤں کے ہاتھوں مارا گیا۔ عسکریت پسندی بہرحال ایک بڑا مسئلہ ہے کیونکہ پاکستانی فوج کے حملوں میں باقاعدگی اور تسلسل نہیں ہے۔ بعض لوگ ان کو ختم کرنا چاہتے ہیں مگر بعض ایجنسی کے خارجی سیاسی ڈائنامکس کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ پاکستان کے قبائلی علاقوں میں عسکریت پسندی ایک غبارے کی مانند ہے، ایک طرف سے دبایا جائے تو وہ دوسری طرف سے پھول جاتا ہے۔ شدت پسندی کو اگر خیبر کے علاقے میں دبا دیا جائے تو ٹولے اورکزئی یا کرم کی طرف چلے جاتے ہیں۔

خیبر میں قبائلی ڈھانچہ

خیبر ایجنسی میں بنیادی طور پر چار قبیلے آباد ہیں: آفریدی، شنواری، ملاگوری اور شلمانی۔ یہ قبیلے پہاڑوں میں بستے ہیں اور غیر معمولی طور پر جفاکش سمجھے جاتے ہیں۔ یہ پیدائشی جنگ جو ہوتے ہی ہیں لیکن مسلح بھی خوب رہتے ہیں۔ قبائلی جنگ جو ایسے گھروں میں رہتے ہیں جن کے سامنے مٹی گارے کی دیوار ہوتی ہے اور ہر کمپاؤنڈ کے ساتھ ایک واچ ٹاور ہوتا ہے۔ دوسرے پختونوں کی طرح ان کی بھی روایات ہیں جن میں مہمان نوازی، انتقام اور دوسروں سے زیادتی یا غلط سلوک

کے لیے معافی کی تلاش کی ضرورت شامل ہیں۔

ان میں آفریدی قبیلہ غالب اکثریت میں ہے لیکن وہ آٹھ ذیلی شاخوں میں تقسیم ہے۔ آدم خیل، اکاخیل، قمبر خیل، قمر خیل، ملک دین خیل، کوکی خیل، ذکا خیل، اور سپاہ۔ شنواری قبیلہ دوسرا بڑا قبیلہ ہے اور اس کی تین شاخیں ہیں: خوجہ خیل، میرداد خیل اور سیکوئی. شلمانی اور ملاگوری بہت چھوٹے قبائل ہیں۔

آفریدی قبیلہ خیبر میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے اور اگر قبیلے کے بااثر لوگوں کو موثر طریقے سے متحرک کیا جائے تو وہ خیبر کے علاقے میں طالبان کے خاتمے میں بے پناہ مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ 2006ء کے شروع میں ایک قبائلی جرگے نے پیر سیف الرحمن اور مفتی منیر کو علاقے سے نکل جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ قبائل ان عسکریت پسندوں کے خلاف کھڑے ہو سکتے ہیں لیکن انھیں حکومت کے حفاظتی نظام پر اعتبار نہیں رہا۔ زیادہ جارحانہ حکومتی پالیسیاں، جس سے طالبان کو جڑ سے کھینچنے کی خواہش اور قبیلوں کی مکمل حمایت ظاہر ہو تو مقامی لشکر ان جنگ جوؤں کو خیبر ایجنسی سے باہر نکال سکتے ہیں۔

اختتامیہ

پشاور کے انتہائی قریب واقع ہونے اور ایک اہم تجارتی شاہراہ ہونے کے باوجود خیبر ایجنسی کی معاشی اور سماجی صورت حال فاٹا کے دیگر علاقوں سے مختلف نہیں۔ ہر قسم کی شدت پسندی، جس میں فرقہ وارانہ عصبیت اور تحریک طالبان بھی شامل ہیں، نے عدم تحفظ، معاشی ناہمواری اور غیر منصفانہ حکمرانی کے تصور کی بنا پر بے پناہ طاقت حاصل کی ہے اور اب یہ سوسائٹی کے رگ و پے میں رچ بس گئی ہے۔ ایک چیلنج تو آمریت اور جنگ جوئی کے حامل گروہوں کا ہے (مقامی جنگ جو، پاکستانی طالبان، قانون کے نفاذ کے مختلف ادارے، نیٹو اور امریکی افواج) جن کے مفادات درہ خیبر سے اشیا و رسد کی نقل و حمل سے منسلک ہیں۔ ایسے پیچیدہ ماحول میں جامع حکمت عملی کی تشکیل اور نفاذ ہی بہت مشکل ہے کیونکہ مختلف گروہوں کے درمیان پہچان اور خاص خاص علاقوں پر توجہ مرکوز کرنا ہی بڑا مسئلہ ہے۔ دراصل افغانستان کی صورت حال کا براہ راست اثر فاٹا کے علاقے پر پڑتا ہے۔ بہت سے مقامی قبائلیوں کا خیال ہے کہ افغانستان میں جنگ جوؤں کی کارروائیوں کی وجہ سے خیبر پر وہاں سے بھاگ آنے والے جنگ جوؤں کا خیال رکھنے کی ذمہ داری آن پڑتی ہے۔

ر میں حال پشتو ٹیلی ویژن کے اینکر ہیں۔ وہ اسلام آباد میں مشعل ریڈیو کے چیف اور میڈیا اینڈ ریسرچ کمپنی کے سربراہ ہیں۔

مہمند میں شدت پسندی اور تصادم

رضا خان۔ اپریل 2010ء

مہمند میں بھی فاٹا کے دیگر علاقوں کی طرح، معاشی اور انتظامی مسائل کی صورت حال خاصی سنگین ہے، مقامی باشندوں میں صرف 7.7% کو پینے کے صاف پانی کی سہولت میسر ہے۔ ضلع کے سکولوں میں 21.8% بچے رجسٹرڈ ہیں اور سیکنڈری سکول میں طلبہ کی شرح خطرناک حد تک کم یعنی 6.5% (وورطالبات کی شرح فیصد) ہے۔(۳) فاٹا کے منتخب نمائندوں کا خیال ہے کہ پاکستانی حکومت مہمند میں یا فاٹا میں ترقی کے لیے کوئی منصوبہ بندی نہیں کی ہے۔

2010ء میں حکومت نے فاٹا کے چالیس لاکھ لوگوں کے لیے صرف ایک ارب روپے (40 ملین ڈالر) مختص کیے۔ یہاں مدد کی عدم فراہمی بہت اہم مسئلہ ہے کیونکہ یہاں کے لوگوں کو یقین ہے کہ ان کی غربت دور کرنے میں حقیقی معاونت پاکستانی حکومت ہی کر سکتی ہے۔ مہمند کے لوگ خاصے مذہبی اور قدامت پسند ہیں لیکن یہ ایجنسی فاٹا کے دوسرے علاقوں کی نسبت پاکستانی معاشرے اور اس کی ثقافت سے کہیں زیادہ مربوط ہے۔ مقامی لوگ زیادہ تر دیوبندی مکتب فکر (سنی فقہ کی سیاسی قدامت پسند سوچ) کے حامی اور عدم تشدد کے قائل ہیں۔ تاہم 1970ء کے عشرے میں جب مقامی لوگوں نے کام کی غرض سے خلیج اور عرب ممالک کا رخ کرنا شروع کیا، مہمند ایجنسی میں سلفی نظریات کی پیروی کا رجحان تیزی سے بڑھا۔ مقامی باشندوں کی اکثریت اب شریعت کے نفاذ کی بھرپور حمایت کرتی ہے لیکن کس فقہ کی شریعت؟ اس بارے میں ان میں اتفاق نہیں۔ یہاں کے نوجوان ایسے سماج میں رہ رہے ہیں جس میں (عمومی سماجی رویوں کے خلاف) روایتی ضابطہ اخلاق کی سخت پابندیاں ہوتی ہیں۔ شاید اسی تضاد کی بدولت مہمند کے بہت سے نوجوانوں کو سلفیت اور القاعدہ کے نئے اور جدید نظریات نے شدید متاثر کیا اور اب یہ ہو رہا ہے کہ عدم تشدد کی حامی سنی جماعت کو، روایتی طور پر ترجیح دینے والے، اب شدت پسند گروہوں کی جانب راغب ہیں۔

بغاوت کا ڈھانچہ

فاٹا کے دوسرے علاقوں کی طرح مہمند بھی 1980ء کے عشرے کی سوویت مخالف افغان جنگ سے متاثر ہوا۔ جب افغان پناہ گزینوں کا جم غفیر مقامی معیشت اور معاشرت پر ناقابل برداشت بوجھ بن گیا۔

تاہم دوسرے قبائلی علاقوں کے برعکس مہمند میں شدت پسندوں کی بھرتی اور ان کی تربیت کے چند ہی کیمپ بن پائے تھے۔ 1989ء میں سوویت افواج کے افغانستان سے انخلا کے بعد تحریک نفاذ شریعت محمدی جیسے مقامی شدت پسند گروپ شانگلہ اور اس کے پڑوسی علاقے مالاکنڈ میں قائم ہونے لگے۔ ان تحریکوں کا مہمند پر اثر تو ضرور ہوا مگر علاقے میں ان کا کوئی خاص تنظیمی ڈھانچہ نہیں بن سکا۔

مہمند کی اپنی جنگجو روایتیں ہیں تاہم اس کا زیادہ تر تعلق صافی قبیلے سے ہے۔ شروع شروع میں پنج پیری نامی جنگجو پیدا ہوا کرتا تھا جس نے جمیل الرحمن کو تربیت دی۔ اس نے 1985ء میں گلبدین حکمت یار کی حزب اسلامی چھوڑ دی اور ایک جہاد پرست سلفی گروپ، جماعت الدعوہ میں شامل ہو گیا۔ جماعت الدعوہ میں عام سے عرب جنگجو شامل تھے سعودی اور کویتی باشندوں کی مالی معاونت سے جمیل الرحمن دریائے کنڑ کی وادی میں (افغانستان میں، مہمند سے بالکل متصل) ایک طاقت ور شخص بن گیا۔ وہ افغانستان کی وادی (Pech) میں پلا بڑھا اور 1979ء میں افغان کمیونسٹ حکومت کے خلاف بغاوت میں اس نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ اور اس کی تحریک نے مقامی کنٹرول سنبھال لیا تھا مگر 1991ء میں ایک مصری کے ہاتھوں قتل ہونے کے بعد، مقامی کنٹرول دوبارہ جمیل الرحمن کے قائد گلبدین حکمت یار کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ حزب اسلامی اور سلفی گروہ اگرچہ پاکستان میں اسلامی حکومت کے قیام کے لیے متفق الرائے ہیں تاہم جمیل الرحمن کی موت کے بعد کئی عملی معاملات اور اختیارات کے سلسلے میں، ان میں باہمی جھڑپیں ہوتی رہی ہیں۔ موجودہ طالبان کمانڈر عمر خالد کا تعلق صافی قبیلے سے ہے اور اس کی بہت سی سرگرمیوں اور طور طریقوں میں جمیل الرحمن کا رنگ جھلکتا ہے۔

(۱) قبیلہ مہمند شاخیں: ترکزئی، حلیم زئی، خواجزئی، بیزئی۔

(۲) قبیلہ صافی شاخیں: قندھاری، گربز، مسعود، شنواری۔

(۳) عثمان خیل شاخیں: عمرتاس خیل، لاسن، اتمان خیل۔

نائن الیون کے بعد مہمند میں ابھرنے والی شدت پسندی کی لہر شمالی اور جنوبی وزیرستان میں قبائلی طالبان کے 2004ء میں نمودار ہونے کے بعد آئی۔ یہ دونوں علاقے مہمند کے جنوب میں سینکڑوں میل تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اسی وجہ سے جنگجو مہمند کی طرف زیادہ نہیں آ پائے۔ یہاں طالبان کا نفوذ پڑوسی مالاکنڈ ڈویژن کی طرف سے ہوا جہاں اسلامی شدت پسند نائن الیون یا افغانستان میں طالبان کے ظہور سے بھی پہلے موجود تھے۔ ان میں سے اہم ترین جنگجو گروپ تحریک نفاذ شریعت محمدی تھا جو صوفی محمد نے 1989ء میں بنائی تھی۔ باجوڑ اس کا مضبوط گڑھ تھا اور

مہمند میں بھی اس کے اثرات تھے۔ افغانستان پر امریکی حملے کے فوراً بعد صوفی محمد نے ملاکنڈ، باجوڑ اور مہمند سے دس ہزار مسلح رضاکار اکٹھے کیے تاکہ امریکی اور اتحادی افواج سے جنگ کی جا سکے لیکن اس کی یہ مہم بری طرح ناکام ہوگئی۔ اس کے غیر تربیت یافتہ جنگ جو امریکی افواج کی جدید حربی صلاحیتوں کے آگے ٹک نہ سکے اور ہزاروں لوگ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اسی وجہ سے صوفی محمد ملاکنڈ، باجوڑ اور مہمند کے قبائل میں اپنی حمایت سے محروم ہوگیا۔

تاہم اس ناکامی کے باوجود، 2006ء میں مقامی طالبان مہمند میں ایک اہم طاقت بن کر ابھرے، جب انہوں نے علاقے میں پٹرولنگ شروع کردی اور مقامی لوگوں کو اپنے بنائے ہوئے ضابطہ اخلاق پر عمل کرنے پر مجبور کرنے لگے۔ 2006ء سے پہلے مہمند کے باشندے شدت پسندی کو زیادہ خطرہ نہیں سمجھتے تھے کیونکہ وہ پورے مہمند میں کارروائیاں کرنے کے باوجود صافی، حوائزئی اور بائزئی میں مرتکز تھے۔ تاہم جون 2006ء میں شدت پسند زیادہ موثر اور منظم ہوگئے۔ انہوں نے مہمند کے ایک جرگے میں بم کا دھماکہ کرکے اپنی اہمیت جتائی۔ وہاں ایک رقعہ پایا گیا جس میں قبائلی عمائدین کو متنبہ کیا گیا تھا کہ وہ حکومت کی حمایت میں شدت پسندوں کے خلاف جرگے بلانا بند کردیں۔

جولائی 2007ء میں اسلام آباد کی لال مسجد کے سانحے کے بعد مہمند میں تشدد کی لہر ابھرنا شروع ہوئی۔ ہوا یوں کہ حکومت نے اسلام آباد شہر کے عین درمیان، واقع لال مسجد پر (جو شہر میں شدت پسندوں کا اہم گڑھ بن گئی تھی) پر حملہ کردیا۔ اسلام آباد میں لڑنے والے جنگ جوؤں سے اظہار یک جہتی کے طور پر دو سو جنگ جوؤں نے ماضی کے برطانیہ مخالف حریت پسند حاجی صاحب ترنگ زئی کے مزار اور مہمند سے 25 میل دور واقع غازی آباد کی ایک مسجد پر قبضہ کرلیا۔ شدت پسندوں نے گاؤں کی مسجد کا نام، اسلام آباد کی مسجد میں لڑنے والوں سے یک جہتی کے لیے، لال مسجد رکھ دیا۔ گروپ نے علاقے میں عدالتی اختیارات سنبھالنے کی بھی کوشش کی اور بالآخر 12 اکتوبر 2007ء کو چھ مقامی مجرموں کے سر بھی قلم کردیے۔

سر قلم کرنے کی اس واردات کے نتیجے میں مہمند کے موجودہ کمانڈر عمر خالد (طالبان) کو آگے آنے کا موقع ملا۔ اس نے اپنی تحریک کو مہمند کی تاریخی جنگ جو قیادت اور علاقے میں پاکستان کے لیے پائی جانے والی منفی عصبیت کو یہ کہہ کر باہم مسلک کیا کہ ہم حاجی ترنگ زئی اور لال مسجد کے خطیب غازی عبدالرشید کے مشن کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں۔ دسمبر 2007ء میں بیت اللہ محسود نے تحریک طالبان پاکستان بنائی تو تمام پاکستان مخالف تمام جنگ جو گروہ عمر خالد سمیت اس کی چھتری تلے اکٹھے ہوگئے۔ تحریک کی تشکیل نے عمر خالد کے طالبان کو گویا تقویت بخش دی اور

بس سے ایجنسی میں اپنی عدالتیں قائم کر کے سزائیں سنانا شروع کر دیں۔ ان کا ایک فیصلہ بہت مشہور ہوا جس میں مرد اور عورت کو سنگسار کرنے کی سزا سنائی گئی۔ وہ جوڑا قبائلی علاقے سے فرار ہو کر نوشہرہ چلا گیا جہاں فوجی چھاؤنی بھی ہے۔ عمر خالد کے جنگجو اس جوڑے کو نوشہرہ سے واپس مہمند لائے اور انہیں برسرِعام سنگسار کیا۔ مہمند سے بہت دور ایک فوجی چھاؤنی کے مرکز نوشہرہ سے اس جوڑے کا عمر خالد کے گروہ کے ذریعے واپس لے جایا جانا، اس گروہ کی رسائی کا کمال ہے۔ عمر خالد کی طالبان میں شمولیت کے باوجود مقامی طالبان کی سرگرمیاں اپنے طور پر بھی جاری رہیں اور ان کارروائیوں میں جنوبی وزیرستان کی تحریک سے ان کا رابطہ ہونے کے برابر تھا۔ عمر نے بہرحال مہمند کے طالبان پر اپنا کنٹرول قائم رکھا ہے اور جنوبی وزیرستان میں تحریک کے لیڈروں پر ہوتے حملوں کے باوجود اس کی اپنی کارروائیوں میں کوئی خلل اندازی دکھائی نہیں دیتی

سیاست: مہمند کے طالبان پاکستان کی طاقتور مذہبی سیاسی جماعتوں سے منسلک ہیں۔ جمعیت علمائے اسلام (فضل الرحمٰن گروپ) اور جماعت اسلامی۔ 2002ء میں ان دونوں پارٹیوں نے دیگر مذہبی جماعتوں کے ساتھ مل کر متحدہ مجلس عمل تشکیل دی تھی۔ اس اتحاد نے مہمند کی قومی اسمبلی کی ساری نشستیں جیت لی تھیں۔ افغانستان میں امریکی اور مغربی مداخلت کی شدید مخالف اس اتحاد پر بعد ازاں صوبے کے باشندوں نے کرپشن اور شدت پسندی کے حوالے سے ایم ایم اے پر شدید تنقید کی۔

بعض مشاہدہ کاروں کا خیال ہے کہ پاکستانی آئی ایس آئی نے عمر خالد کا باقاعدہ ابھرنا اس لیے بنایا تھا تاکہ ایم ایم اے کے سیاسی مخالفوں کو کمزور کیا جا سکے۔ اس صورتحال سے ظاہر ہوتا ہے کہ آئی ایس آئی سیکولر اور قوم پرست پختون (جماعت اے این پی کے) نظریات کی مخالف تھی کیونکہ محسوس ہو رہا تھا کہ فروری 2008ء کے الیکشن میں اے این پی ایم ایم اے سے اقتدار چھین لے گی۔

آئی ایس آئی نے اے این پی کو اس کے تاریخی تناظر میں بھارت کی حامی جماعت سمجھتی ہے۔ یاد رہے کہ جماعت کے بانی خان عبدالغفار خان نے آزادی کی جنگ میں نیشنل کانگریس کی حمایت کی تھی جو کہ متحدہ بھارت کی پرچارک تھی۔ اسی نظریے کے تحت آئی ایس آئی نے علاقے میں اسلامی تحریکوں کو آگے بڑھایا تاکہ ایم ایم اے کی انتخابی جیت کے امکانات کو بڑھایا جا سکے۔ آئی ایس آئی کے مفادات کے مطابق ایم ایم اے اس کے لیے زیادہ قابل قبول تھی۔

وجوہ کچھ بھی رہی ہوں 2008ء کے انتخابات میں اے این پی اپنی جیت کے بعد فاٹا سے تعلق رکھنے والے طالبان کے مسلسل حملوں کی زد میں رہی ہے۔ 2009ء کے شروع میں بیت اللہ محسود نے بھی اے این پی لیڈرشپ کو ۳۰ دن کے اندر اندر حکومت سے مستعفی نہ ہونے کی

صورت میں خطرناک نتائج کی دھمکی دی تھی۔ انھوں نے اس دھمکی پر عمل بھی کیا اور سینکڑوں اے این پی کارکنوں کو جن میں ان کے اراکین قومی و صوبائی اسمبلی بھی شامل ہیں قتل کر ڈالا۔

اہداف

مہمند میں شدت پسند علیحدگی کے حامی نہیں۔ انہیں پتہ ہے کہ تن تنہا صورت حال میں ایک چھوٹی سی امارت کو چلانا ناممکنات میں سے ہے۔ تحریک طالبان پاکستان کے دوسرے گروہوں کی طرح وہ بھی پورے پاکستان میں شریعت کا نفاذ چاہتے ہیں۔ ان کے خیال میں ایسی حکومت علما کی زیر قیادت ہوگی۔ ظاہر ہے طالبان کی تحریک کے جراتمند ملاؤں کے سوا اور کون ریاست کا انتظام چلا سکے گا۔ وہ افغانستان میں امریکی اور نیٹو افواج کی کاروائیوں کے خلاف القاعدہ اور طالبان کی جدوجہد کے حامی ہیں۔ وہ عراق اور فلسطین میں مسلح جہادیوں کے ساتھ ہیں۔ گرچہ اس طرح کے جوشیلے بیانات دینے میں ان کا ایک مقصد مقامی باشندوں کی حمایت جیتنا بھی ہے۔ ان کا فوری مقصد مہمند میں اسلامی امارت قائم کرنا ہے جو پورے ملک کے لیے ایک مثال بن سکے۔

اصولی طور پر ان کا یہ ہدف پاکستان کی آزادی کی تحریک سے قطعی متصادم نہیں کیونکہ اس کا مقصد بھی مسلمانوں کے لیے ایسا وطن حاصل کرنا تھا جہاں وہ اپنے نظریات اور قوانین کے تحت زندگی گزار سکیں لیکن عملی طور پر مہمند طالبان شریعت کی ایک محدود تفہیم کے قائل ہیں جس میں لوگوں کے منتخب نمائندوں کے لیے اقتدار کی کوئی گنجائش نہیں۔

تنظیم

مہمند میں طالبان کا تنظیمی ڈھانچہ کچھ اس طرح ہے: امیر عمر خالد، ڈپٹی کمانڈر قاری شکیل، ترجمان اسد سعید اور مہمند کی سات تحصیلوں کے مقامی امیر (ان لوگوں کے نام بھی ظاہر نہیں کیے گئے۔ دوسرے طالبان شدت پسند مختلف جگہوں پر اپنے مختلف نام استعمال کرتے ہیں)

عمر خالد۔ عمر خالد کا اصلی نام عبدالولی ہے، قندھارہ کا باشندہ ہے اور صافی قبیلے کی شاخ قندھاری سے تعلق رکھتا ہے۔ صافی خود کو مہمند قبیلے کا حصہ سمجھتے ہیں لیکن مہمند کے قبائلی انھیں اسی نسل کا نہیں مانتے اور قبیلے کی دوسری شاخوں کی نسبت انھیں زیادہ مذہبی اور قدامت پرست سمجھا جاتا ہے۔ صافیوں کی آبادی بھی دوسری قبائلی شاخوں کی نسبت خاصی کم ہے۔ ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ قبائلی صافیوں کو (اس علاقے کے قبائل میں) سب سے بعد میں مسلمان ہونے والے لوگ سمجھتے ہیں۔

میں سالہ خالد نے تعلیم اپنے گاؤں میں ہی پائی۔ جوانی میں اس نے حرکت المجاہدین کے ساتھ کام کیا۔ (یہ گروپ کشمیر میں بھارتی فوج سے لڑنے کے لیے معروف ہے)۔ ۱۹۹۰ء کے عشرے میں اس نے کشمیر کا دورہ کیا، پھر افغانستان میں شمالی اتحاد کے خلاف لڑنے کے لیے طالبان سے مل گیا۔ کشمیر میں اس کی کارروائیوں کا کچھ پتہ نہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ جنگجو مختلف جگہوں پر مختلف ناموں سے کام کرتے ہیں۔ تاہم لگتا ہے کہ عمر خالد کا افغانستان میں طالبان کی نسبت کشمیری مجاہدین کے ساتھ زیادہ قریبی تعلق تھا۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ نائن الیون کے بعد اپنے لڑکوں کے ساتھ افغانستان گیا تھا تا کہ طالبان کے ساتھ دشمن سے جنگ میں شامل ہو سکے۔

عمر خالد کی مہم میں بھی اگرچہ صوبائی محرکے سے اندر جھلکتے ہیں، دونوں تحریکیں کم و بیش ایک ہی وقت میں شروع ہوئی تھیں۔ تاہم خالد نے اپنی دیرینہ خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جولائی 2007ء میں لال مسجد کے قضیے سے فائدہ اٹھایا اور شدت پسند کمانڈر کے روپ میں ظاہر ہوا۔ ان دنوں اس نے طالبان یا القاعدہ سے لاتعلقی کا اظہار کیا تھا لیکن ساتھ ہی کہا تھا۔

"اگر طالبان ہمارے پاس آئے تو ہم ان کا خیر مقدم کریں گے اور لال مسجد کے امام غازی عبدالرشید کے مشن کو پورا کرنے کے لیے ہمیں اپنی جانیں بھی قربان کرنا پڑیں تو دریغ نہیں کریں گے۔"

مہمند کے طالبان پر کنٹرول قائم کرنے کے لیے خالد کو لڑائیاں بھی کرنا پڑیں۔ اس نے اپنے مخالف شاہ صاحب کے گروپ کا خاتمہ کیا۔ شاہ صاحب سلفی عقیدے کے تھے اور ایک قومی دھارے کی جماعت "جمعیت اہل حدیث" سے ان کا تعلق تھا۔ جمعیت نے الزام لگایا کہ عمر خالد کے طالبان گروپ نے جان بوجھ کر شہریوں کو مار ڈالنے کی اجازت دی ہے۔ لال مسجد کے واقعے اور خالد کے منظر عام پر آنے سے پہلے شاہ صاحب کا گروپ مہمند کا سب سے بڑا گروپ تھا اور ان کی تمام تر توجہ امریکی اور نیٹو افواج کے خلاف کارروائیوں پر مرکوز تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے گروپ میں کشمیری جہادی گروہ لشکر طیبہ کے لوگ بھی شامل تھے۔

ستارہ یاسر سے استفادہ کے باوجود عمر خالد نے طالبان کمانڈر کے طور پر شاہ صاحب کے گروپ پر 2008ء میں حملہ کیا۔ اس حملے میں شاہ صاحب جاں بحق ہو گئے اور ان کی تنظیم کا صفایا کر دیا گیا۔ تنظیم کو دوبارہ بحال کرنے کی کوششیں ناکامی سے دوچار ہوئیں۔ عمر خالد کے ہاتھوں شاہ صاحب کا خاتمہ ایک اہم واقعہ تھا کیونکہ بیت اللہ محسود (TTP) ایسے تصادم کے خلاف تھا اور طالبان گروہوں کے مابین لڑائی کا خاتمہ چاہتا تھا۔

قاری شکیل اور سعد سعید ۔ یہ دونوں عمر خالد کے اہم ترین نائب کمانڈر ہیں۔ قاری شکیل

مہمند کے مخفی علاقے سے ہے اور مبینہ طور پر وہ پہلے جرائم پیشہ رہا ہے۔ اسد سعید نے خیبر میڈیکل کالج پشاور سے میڈیسن کی ڈگری لی۔ وہ نظریاتی طور پر متشدد ہے اور القاعدہ کے تکفیری نظریے کا حامی ہے۔

مہمند میں طالبان کی دستہ بندی

عمر خالد کا دعویٰ ہے کہ ڈھائی ہزار جنگجو اس کی پشت پر ہیں۔ لیکن مہمند میں وہ عوامی تائید سے محروم ہیں تاہم مضبوط اپوزیشن نہ ہونے کی وجہ سے اس کے گروپ کو خاصی طاقت حاصل ہو گئی ہے۔ خالد کے ساتھی ہر جگہ موجود ہیں اور سات میں سے تین تحصیلوں حوارئی، بائزئی، لکارو اور صافی پر اسے مکمل کنٹرول حاصل ہے۔ یہ دور دراز علاقے ہیں تاہم لکارو اور صافی افغان سرحد کے بالکل ساتھ ہیں۔ لکارو صافی قبیلے کا بھی گڑھ ہے اور باجوڑ سے ملا ہوا ہے۔ جو قبائلی علاقے میں طالبان کا ایک اور بڑا گڑھ ہے۔

قبائلی گروہوں پر طالبان کے حملوں نے علاقے میں گہرے اثرات ڈالے ہیں۔ کئی ایک نے ان سے مقابلے کے لیے لشکر ترتیب دے رکھے ہیں۔ مقامی لشکروں کے بہت سے اہم کمانڈروں کی موت کے باوجود، مقامی مزاحمت، پاکستان فوج کی کارروائیوں کی نسبت کہیں زیادہ طاقت ور رہی ہے۔ 7 اگست 2009ء کو لشکریوں نے طالبان کے ترجمان مولوی عمر کو پکڑ لیا جس نے 1994ء میں صوفی محمد کے گروپ میں شمولیت کی تھی اور تحریک طالبان پاکستان کی پہچان بن گیا تھا۔ گرفتاری سے قبل وہ مسلسل میڈیا سے رابطے میں تھا تاکہ پاکستان بھر میں ہونے والے دہشت گردی کے تمام حملوں کا کریڈٹ طالبان کے لیے لیا جا سکے۔

کوئٹہ شوریٰ طالبان

ملا عمر مہمند کے تمام شدت پسندوں کے لیے روحانی قوت کا ایک اہم مرکز ہے لیکن وہ طالبان لیڈر کی مکمل ہدایات پر عموماً کان نہیں دھرتے بلکہ بعض ایسی حرکتیں بھی کر جاتے ہیں جن سے کوئٹہ شوریٰ پر زد پڑتی ہے۔ مہمند کے شدت پسند عموماً کہتے ہیں کہ ملا عمر ان کا عظیم لیڈر ہے اور وہ خود کو اس کی سیاسی اور مذہبی تحریک کا ایک حصہ سمجھتے ہیں۔ تاہم مہمند کے شدت پسندوں پر ملا عمر کا کوئی آپریشنل کنٹرول نہیں ہے۔ دراصل شہریوں پر حملے اور ان کے سرقلم کرنے کے معاملات انھیں کوئٹہ شوریٰ طالبان کے رویوں سے مختلف کرتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ کوئٹہ ان سے 850 میل دور ہے اور جدید کمانڈ اینڈ کنٹرول سسٹم کے بغیر، انھیں ہدایات دینا کوئٹہ شوریٰ کے لیے بہت مشکل ہے۔ مہمند کے طالبان کو کچھ مدد افغانستان کے طالبان لیڈر ضیاالرحمن سے بھی

لگی رہتی ہے۔

حزب اسلامی (گلبدین)

حزب اسلامی افغانستان کے کنڑ، ننگرہار اور کاپیسا (مہمند کے قریبی افغان صوبے) میں سرگرم عمل ہے تاہم مہمند طالبان کے ان کے ساتھ براہ راست رابطے نہیں ہیں۔ حکمت یار کی حزب اسلامی، دیگر طالبان کی طرح مذہبی انتہا پسندی اور شدت پسند طریقوں سے بچنے کی کوشش کرتی ہے۔ مثلاً حال ہی میں ایک پمفلٹ مہمند میں تقسیم ہوا جس میں سوال اٹھایا گیا کہ آیا اسے وہابی ہو جانا چاہیے یا مذہبی ہی رہنا چاہیے۔ یہ پمفلٹ اس وقت شائع ہوا جب حزب اسلامی کے افغان حکومت سے 2010ء کے شروع میں مذاکرات ہونے ہی والے تھے۔ حکمت یار کا کہنا تھا کہ شدت پسندی کی کارروائیاں منسلک گروہ کر رہے تھے اور سعودی حکومت کے بعض عناصر، کئی ایک عرب خیراتی تنظیمیں اور پاکستانی خفیہ اداروں کے کچھ حصے ان کی مدد کر رہے ہیں۔ ممکن ہے حکمت یار یہ بتانا چاہتا ہو کہ وہ ایک قابل اعتماد افغان سیاست دان ہے اور اس کا القاعدہ اور دوسرے شدت پسند تحریکوں سے کوئی تعلق نہیں۔

غیر ملکی شدت پسند

مہمند کے دور دراز علاقوں کے لوگوں کا کہنا ہے کہ انہوں نے مقامی جنگجوؤں کے ساتھ بہت سے غیر ملکی شدت پسندوں کو بھی دیکھا ہے لیکن ان کی تعداد اور ممکنہ لوکیشن کے بارے میں یقین سے نہیں بتا سکتے۔ کیونکہ انہیں چھوٹے چھوٹے گروپوں میں متحرک دیکھا گیا ہے۔ 1 جون 2001ء کو چھ سو جنگجوؤں نے جن میں غیر ملکی بھی شامل تھے، مہمند میں غرشہ کور کی چیک پوسٹوں پر حملہ کیا تھا۔ رات بھر کی اس لڑائی میں ایف سی کے دس سپاہی اور 40 جنگجو مارے گئے تھے۔

ان میں زیادہ تر شدت پسند افغان سرحد کی طرف سے آئے تھے اور مقامی طالبان کی اس کارروائی میں شامل ہوئے تھے۔ کئی مشترکہ گروپوں نے بعد ازاں سرحد پر واقع غرشہ کور کے ایک ناکے پر بھی حملہ کیا تھا۔

القاعدہ کے لیڈروں نے مہمند کو پناہ گاہ کے طور پر بھی استعمال کیا ہے اگرچہ بظاہر یہ غیر ملکی شدت پسندوں کا گڑھ نہیں ہے۔ ستمبر 2008ء میں وزیر داخلہ رحمان ملک نے انکشاف کیا تھا کہ القاعدہ کا نائب امیر ایمن الظواہری، مہمند ایجنسی میں فوجی آپریشن کے دوران بال بال بچ نکلا تھا۔

پاکستانی فوجی آپریشنز

2007ء سے پہلے پاکستان فوج نے مہمند میں سخت فوجی آپریشنز نہیں کیے تھے۔ ایک وجہ

یہ تھی کہ شاہ صاحب کی سربراہی میں جنگ جو گروپ وہاں حاوی تھا جس کی تمام تر توجہ افغانستان میں کارروائیوں پر مرکوز تھی۔ خالد عمر کے منظر عام پر آنے کے بعد صورت حال بدل گئی اور دسمبر 2007ء میں اس کے تحریک طالبان پاکستان میں شامل ہونے کے بعد معاملہ اور بھی بگڑ گیا گرچہ پاکستانی فوج نے مہمند میں کوئی خاص کارروائی نہیں کی تھی مگر عمر خالد نے ایجنسی میں حکومتی حامیوں کو نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ تاہم مئی 2008ء میں مقامی حکومتی حامیوں اور طالبان جنگ جوؤں کے درمیان معاہدہ طے پا گیا۔

امن کے معاہدے اور شاہ صاحب کے قتل سے عمر خالد کے طالبان کی علاقے میں حاکمیت کو اور مضبوط کر دیا۔ اور اس نے پاکستانی ریاست کے متوازی انتظامیہ قائم کر لی۔ معاہدے کے مطابق خالد عمر کو حکومت اور افواج پر حملے روک دینا تھے اور حکومت کی جانب سے اسے اجازت دے دی گئی کہ بین الاقوامی اداروں سے فنڈ لینے والی غیر سرکاری تنظیموں کی سرگرمیوں میں باقاعدگی پیدا کرے تاہم کسی بھی مذہبی تنظیم یا مدرسوں کے چلانے کی اجازت نہیں دی گئی۔

اکتوبر 2008ء میں سیاسی پریشر نے افواج کو مہمند میں طالبان کے خلاف آپریشن کرنے پر مجبور کر دیا۔ گزشتہ کیے گئے آپریشنز بے دلی اور ناقص منصوبہ بندی کے ساتھ کیے گئے تھے کئی کارروائیوں میں بدترین شدت پسند صاف بچ نکلے اور بے گناہ شہری مارے گئے لیکن 2008ء کا آپریشن بہت جارحانہ تھا۔ پاک فوج کے مطابق اس کارروائی میں سینئر طالبان لیڈروں سمیت بہت سے طالبان مارے گئے۔ مئی 2009ء تک علاقے کے بہت سے طالبان نائب کمانڈروں نے حکومت کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے جن میں یاسر سعید (صافی تحصیل کا پہلا کمانڈر) بھی شامل تھا۔ سعید نے دعویٰ کیا کہ وہ بے خانماں لوگوں (IPPS) کی وجہ سے ہتھیار ڈال رہا ہے تاکہ ان کی مشکلات کا مداوا ہو سکے لیکن درحقیقت وہ پاک فوج کے شدید دباؤ میں آ گیا تھا۔

ستمبر 2009ء تک پاک فوج کے دعوے کے مطابق مہمند کا 80% علاقہ شدت پسندوں سے واگزار کرا لیا گیا تھا۔ البتہ افغان سرحد کے قریب کے علاقے رہ گئے کیونکہ وہ جنگ جوؤں کا زبردست گڑھ تھے۔ بہر حال مہمند میں طالبان کو شکست نہیں دی جا سکی اور مہمند کے بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ طالبان گروپ وہاں دوبارہ منظم ہو رہے ہیں۔ ہزاروں بے خانماں افراد پشاور کے نزدیک خیموں میں رہ رہے ہیں۔ انھیں خوف ہے کہ اگر وہ گھروں کو لوٹے تو ایک بار پھر قتل و غارت اور ٹارگٹ کلنگ کا نشانہ بننے پر مجبور ہوں گے۔

رضا صاحب پشتو اخبار نویس ہیں وہ کئی سرکاری محکموں میں کام کرتے رہے ہیں۔

جنوبی وزیرستان میں شدت پسندی اور تصادم

منصور خان محسود، اپریل 2010ء

گیارہ ستمبر 2001ء کے بعد فاٹا کے تمام علاقوں اور قبائل میں جنوبی وزیرستان امریکہ کے لیے سب سے زیادہ اہمیت کا حامل رہا ہے۔ یہ چھ ہزار چھ سو بیس کلومیٹر پر پھیلا ہوا ہے اور انتہائی جنوب کی جانب، پاکستان کی وسیع ترین قبائلی ایجنسی ہے۔

پاکستان بننے کے بعد (947) جنوبی وزیرستان میں 975-76ء میں ملا نور محمد وزیر کی بغاوت کے استثنا کے علاوہ امن رہا۔ ملا نور کی بغاوت کو فوجی آپریشن کے ذریعے کچل دیا گیا تھا۔ تاہم 978ء میں کمیونسٹ انقلاب (افغانستان) کے خلاف افغانستان میں بغاوت اور بعد ازاں سوویت مخالف جہاد نے سرحدی قبائلی ایجنسی جنوبی وزیرستان کو بری طرح متاثر کیا۔ ہزاروں لاکھوں افغان مہاجرین کا سیلاب وزیرستان کے پناہ گزین کیمپوں میں آ گیا۔ کچھ لوگوں نے افغان مجاہدین یا جہاد کے لیے تربیتی کیمپ قائم کیے۔ ان مہاجرین نے مقامی لوگوں کو بتایا کہ سوویت فوجی اور ان کے افغان اتحادی کس طرح افغان مسلمانوں کی بے عزتی کر رہے ہیں، ظلم و ستم کا نشانہ بنا رہے ہیں اور اس طرح مقامی لوگوں کے دلوں میں سوویت فوج اور ان کی کٹھ پتلی افغان حکومت کے لیے نفرت پیدا کی۔ وزیرستان سے بہت سے نوجوان سوویت فوجوں سے لڑنے کے لیے افغانستان چلے گئے۔ یہ وہ رجحان تھا جس کی اس وقت پاکستان اور امریکی خفیہ ایجنسیوں نے بھرپور سپورٹ کی۔ انہوں نے سوویت یونین کے خلاف باقاعدہ پروپیگنڈہ مہم شروع کر دی تاکہ جنگ جوؤں کی بھرتی کی جا سکے۔

جنوبی وزیرستان کے تقریباً تمام لوگ سنی عقیدہ کے حامل ہیں اور ان میں سے کچھ بالکل جاہل ہیں۔ (شدت پسند) بہت سے لوگ ان مولویوں کے پیروکار ہیں جنہیں سوویت مخالف جہاد میں حکومت پاکستان کی طرف سے مالی مدد دی جاتی رہی۔ اس زمانے میں ان مذہبی

رہنماؤں سے قبائلی علاقوں میں لاتعداد مدرسے قائم کر دیے جہاں نوجوان محسود اور وزیر قبائل کو اسلامی جہاد کے نظریے کی تعلیم دی جانے لگی۔ ان مدرسوں کو خلیجی ممالک کی حکومتوں بالخصوص سعودی عرب سے بے پناہ مالی امداد ملی جس سے جنوبی وزیرستان میں علماء کے تشخص اور حیثیت کو زبردست اہمیت حاصل ہوگئی ان میں بہت سے مدرسے جمعیت علمائے اسلام سے منسلک تھے۔ یہ جماعت 950ء کی دہائی میں تشکیل دی گئی تھی اور قبائلی علاقوں میں خاصی مقبول ہے۔ 989ء میں سوویت افواج کے انخلا کے بعد افغان جہاد میں شریک بہت سے مقامی قبائلی واپس آئے تو اپنے ساتھ ہی جہادی نظریات بھی لائے۔ ان میں سے بعض مقبوضہ کشمیر بھارتی فوجوں سے لڑنے چلے گئے۔ 1994ء میں جونہی طالبان نے افغانستان میں طاقت پکڑنا شروع کی تو بہت سے جہادیوں نے افغانستان میں ان کے ساتھ شمولیت اختیار کر لی طالبان کی افغان حکومت قائم ہوئی تو جلد ہی اسے وزیرستان میں مقبولیت ملی۔ قبائل طالبان کی حکومت کے نفاذ شریعت (اور اپنے زیر کنٹرول علاقوں میں امن و امان) کے اقدامات اور اسلامی حکومت کی شکل سے بہت متاثر ہوئے۔ بہت سے لوگوں نے افغان طالبان سے اپنے تعلقات استوار کیے اور آہستہ آہستہ طالبان کے نظریات کو وزیرستان میں متعارف کرانے لگے۔ تاہم 1996ء اور 2001ء کے درمیان جنوبی وزیرستان کے لوگوں کے طالبان حکمرانوں سے زیادہ تعلقات نہیں تھے۔

جنوبی وزیرستان میں حالات نے خطرناک صورت اس وقت اختیار کی جب امریکی اور نیٹو افواج نے اکتوبر 200ء میں افغانستان پر حملہ کر دیا۔ نائن الیون کے افسوسناک واقعے کے بعد جب افغانستان نے القاعدہ لیڈر اسامہ بن لادن کو امریکہ کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا تھا، جسے اس غیر انسانی المیے کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا تھا۔ ہزاروں افغان طالبان، عرب القاعدہ اور ان کے غیر ملکی ساتھی جن میں ازبک، چیچن اور تاجک شامل تھے، پناہ لینے کے لیے جنوبی وزیرستان آگئے۔ وہ اسے امریکی اور نیٹو فوج کے خلاف اپنی مزاحمت کا اڈا بھی بنانا چاہتے تھے۔ مقامی قبائل نے ان کے مقصد کی ہمدردی میں انہیں پناہ بھی دی اور جنگجوؤں کو امداد بھی فراہم کی جبکہ مقامی جنگ جوؤں نے جو افغان طالبان حکومت سے منسلک رہ چکے تھے، پورے جنوبی وزیرستان میں مقامی طالبان گروپس منظم کرنے شروع کر دیے۔ ان میں عبداللہ محسود، بیت اللہ محسود، نیک محمد، حاجی شریف اور حاجی عمر شامل تھے۔

نیک محمد احمد زئی وزیر قبیلے کا تھا اور تحریک طالبان میں 993ء میں شامل ہوا اور اٹھارہ سال کی عمر میں جنوبی وزیرستان میں طالبان کا پہلا ممبر بنا دیا گیا۔ بعد میں اس نے شمالی اتحاد سے جنگ کی اور افغانستان پر امریکی حملے کے بعد کابل کے نزدیک بگرام ایئر بیس پر بھی کارروائیاں کیں۔

طالبان کی حکومت کے خاتمے کے بعد (نیک محمد) 2001ء دسمبر میں جنوبی وزیرستان واپس لوٹا اور یہاں اس نے مقامی طالبان کو منظم کرنا شروع کر دیا۔ کچھ مقامی وزیر قبائل کو ساتھ ملا کر 2003ء میں وہ افغانستان میں امریکی فوج کے خلاف کارروائیاں کرنے لگا۔ حاجی عمر، حاجی شریف اور مولوی عباس جیسے مجاہد کمانڈر اس کی حمایت میں تھے۔ نیک محمد نے افغانستان سے بھاگ کر آنے والے افغان جنگجوؤں، عرب القاعدہ شدت پسندوں اور (طاہر یلدشیف کی) ازبک تحریک اسلامی کے اراکین کو اپنے ہاں پناہ دی۔ مختلف طرح کے شدت پسندوں کے جنوبی وزیرستان میں اکٹھا ہونے اور ان کی جنگجویانہ کارروائیوں پر امریکی حکومت نے پاکستان پر شدید دباؤ ڈالا جس کے نتیجے میں حکومت نے پہلا فوجی آپریشن وانا میں 2004ء میں کیا۔ طالبان اور ان کے غیر ملکی جنگجو ساتھیوں سے مقابلے کے لیے سات ہزار فوجی علاقے میں بھیجے گئے۔

نیک محمد جنگجوؤں کا امیر تھا جبکہ بیت اللہ محسود، عبداللہ محسود اور ان کے ساتھی اس کی بھرپور معاونت کر رہے تھے۔ کئی ہفتوں کی شدید جنگ کے بعد حکومت کو نیک محمد کے شدت پسندوں سے صلح کا معاہدہ کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ تاہم وہاں شکئی معاہدے کے تحت، نیک محمد نے ہتھیار ڈالنے اور علاقے میں موجود غیر ملکیوں کو رجسٹر کرنے پر اتفاق کیا اور حکومت نے مقامی طالبان کو رقم فراہم کرنے کا وعدہ کیا تاکہ وہ لوگ القاعدہ سے لیے ہوئے قرضے واپس کر سکیں۔ معاہدہ جلد ہی ٹوٹ گیا۔ نیک محمد کچھ ہی دنوں بعد ایک امریکی ڈرون حملے میں مارا گیا۔ وہ اس وقت سیٹلائٹ فون کے ذریعے ایک غیر ملکی ریڈیو کو انٹرویو دے رہا تھا۔ نیک محمد وزیرستان میں ایک ہیرو کی شکل اختیار کر گیا۔ وہ مرد آہن جس نے پاکستانی فوج کو شکست دی۔ محسود اور وزیر قبائل کے جو بہادر لوگ وہاں موجود جنگجوؤں کے ساتھ شامل ہوئے جنوبی وزیرستان پہنچ گئے۔

نیک محمد کی موت کے بعد حاجی عمر وانا کے طالبان کا امیر بن گیا۔ اس نے بھی جنوبی وزیرستان میں موجود ازبک اور دوسرے غیر ملکی شدت پسندوں کی حمایت جاری رکھی۔ ازبک سمجھتے تھے کہ سرحد پار افغانستان میں امریکی اور نیٹو فوج پر حملے کرنے کے بجائے پاکستانی حکومت اور فوج سے جنگ کیا جانا زیادہ اہم ہے۔ اسی بنا پر طالبان کمانڈر ملا نذیر اور ان کے درمیان تنازعہ پیدا ہو گیا اور اس نے غیر ملکی شدت پسندوں اور ان کے حامی حاجی عمر اور حاجی شریف کو اپریل 2007ء میں اپنے گروپ سے نکال دیا۔ ازبکوں نے اس وقت جنوبی وزیرستان میں محسود قبیلے کے زیر کنٹرول علاقے میں پناہ لی جہاں اس وقت تک عبداللہ محسود اور بیت اللہ محسود مقامی طالبان تحریک منظم کر چکے تھے جو مغرب مخالف ہونے کے ساتھ ساتھ پاکستان مخالف بھی تھی۔ یہ گروپ سرحد

پر امریکی اور نیٹو افواج کے خلاف کارروائیاں کرنے لگے جبکہ ان کے افغان (مقامی) اتحادی
شدت پسندانہ کارروائیاں پاکستان میں کرنے لگے۔

تحریک طالبان پاکستان کا ظہور

ایک ایسے مرحلے میں مقامی طالبان جنگجو گروپس اتنے طاقتور ہو گئے کہ دسمبر 2007ء میں انہوں نے پاکستان بھر میں موجود شدت پسند گروپوں کو اکٹھا کر کے تحریک طالبان پاکستان تشکیل دے ڈالی۔ بیت اللہ محسود اور حافظ گل بہادر اس کی ابتدائی قیادت تھے۔ مولانا گل بہادر کو امیر اور فضل اللہ (سوات میں طالبان کا امیر) کو جنرل سیکرٹری منتخب کیا گیا (جنرل سیکرٹری کا عہدہ صرف فضل اللہ کو خوش کرنے کے لیے دیا گیا تھا اور اس کی عملی اہمیت ہونے کے برابر تھی) گل بہادر نے 2008ء میں خود کو طالبان سے علیحدہ کر لیا کیونکہ وہ پاکستانی حکومت سے جنگ نہیں چاہتا تھا۔ جبکہ بیت اللہ محسود حکومت، فوج اور شہری ٹھکانوں کو ٹارگٹ کرنا چاہتا تھا۔ 2009ء کے موسم بہار میں، بہادر، نذیر، اور بیت اللہ نے شوریٰ اتحاد المجاہدین (ان تینوں کے گروپس کا اتحاد) تشکیل دیا اور پچھلے اختلافات ختم کرنے کا دعویٰ کیا لیکن 2009ء کے آخر تک نذیر کے گیارہ آدمیوں کے قتل کے واقعے کے بعد، یہ اتحاد بکھرنا شروع ہو گیا۔ یہ واردات ازبک جنگجوؤں نے سرانجام دی تھی۔ ازبکوں کے تحفظ کے بدلے وار بیت اللہ نے ان (10 ازبک اور 4 محسود) قاتلوں کو ملا نذیر کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔

جنوبی وزیرستان اور ضلع ٹانک کے رپورٹ کے مطابق، تقریباً 40 طالبان گروپس نے تحریک طالبان پاکستان میں شمولیت اختیار کی۔ ان تمام گروپوں کو TTP کی شوریٰ میں نمائندگی حاصل ہے۔ اس مجلس شوریٰ کا مرکز میران شاہ (شمالی وزیرستان کا انتظامی مرکز) ہے۔ اس کا مقصد افغانستان میں امریکی اور نیٹو افواج کے خلاف جہاد کو مربوط کرنا اور قابض فوج کے ساتھ ساتھ پاکستانی فوج پر زیادہ سے زیادہ دباؤ بڑھانا تھا۔ خفیہ کے ذرائع سے موصول شدہ ایک اطلاع کے مطابق طالبان پاکستان نے یہ فیصلہ بھی کیا تھا کہ اگر پاکستانی فوج نے طالبان کے کسی بھی حامی گروہ پر حملہ کیا تو وہ حملہ تحریک کے تمام گروہوں پر تصور ہوگا۔ تحریک طالبان پاکستان نے بتدریج ملک کے تمام قبائلی علاقوں اور سرحدی صوبے کے اضلاع تک پھیلا رہی ہے۔ بنوں، کرک، ہنگو، کلاچی، دیر، بنیر، ڈیرہ اسماعیل خان، لکی مروت، دیر، کوہاٹ اور کسی حد تک مردان، وادی سوات اور ضلع شانگلہ۔

طالبان نے جنوبی وزیرستان کا پورا کنٹرول سنبھال لیا تھا۔ انہوں نے اپنی عدالتیں قائم

اور مقامی لوگوں سے ٹیکس وصول کرنے لگے۔ انہوں نے محسود اور وزیر قبائل میں القاعدہ و شیعہ مخالف نظریات بھی پھیلانا شروع کر دیے۔ اس سے پہلے یہاں فرقہ واریت کا کوئی تصور نہیں تھا۔ تحریک طالبان نے شیعوں کے خلاف کئی خودکش حملے بھی کیے۔ انہوں نے ڈی آئی خان، ہنگو، ٹانک اور کرم قبائلی علاقے میں اس اقلیتی فرقے کو باقاعدہ ٹارگٹ کیا۔ مثلاً 20 فروری 2009ء کو ڈیرہ اسماعیل خان میں ایک شیعہ رہنما کے قتل ہونے کے بعد اس کی آخری رسومات کی ادائیگی کے دوران، طالبان نے ایک خودکش حملہ کیا جس کے نتیجے میں کم از کم 32 شیعہ مارے گئے جنازے میں شریک سو سے زیادہ دوسرے لوگ شدید زخمی ہوئے۔ شیعہ مخالفت میں بدنام قاری حسین محسود طالبان کا لیڈر ہے اور خودکش حملوں کی تربیت بھی دیتا ہے۔ وہ کالعدم سپاہ صحابہ کا جنوبی وزیرستان میں انتہائی سرگرم کارکن ہے۔ ایک اور بدنام زمانہ دہشت گرد قاری ظفر، جسے قاری حسین کا قریبی دوست سمجھا جاتا ہے، 2006ء میں کراچی کے امریکی قونصل خانے پر خودکش حملے میں ملوث تھا۔ اس نے بعد میں جنوبی وزیرستان میں پناہ لی۔ کراچی کے اس خودکش حملے میں ایک امریکی سفارت کار اور تین پاکستانی مارے گئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ظفر فروری 2010ء میں شمالی وزیرستان میں ایک میزائل حملے میں مارا گیا۔

جنوبی وزیرستان میں بغاوتوں کا ڈھانچہ

جنوبی وزیرستان میں طالبان اپنے ساتھی ایجنسی کے مختلف قبائل میں سے بنتے ہیں۔ جن میں احمد زئی وزیر، محسود اور بھٹانی شامل ہیں۔ غیر ملکی شدت پسندوں کی موجودگی ان میں خلفشار کا باعث بنتی رہی ہے کیونکہ ہمیشہ یہ سوال اٹھتا ہے کہ امریکی اور نیٹو فوجوں کے ساتھ پاکستانی حکومت اور ریاست کو بھی جنگی ہدف بنایا جانا چاہیے یا نہیں۔ مرحوم بیت اللہ محسود اور اس کے جانشین ہمیشہ پاکستانی ریاست کے خلاف کارروائیوں کے حق میں رہے ہیں اور ازبک جنگجوؤں کو پناہ دیتے رہتے ہیں۔ دوسری جانب ملا نذیر کے طالبان جنگجوؤں کو جو وانا میں سرگرم ہیں، افغانستان میں مغربی افواج کے خلاف کارروائیوں تک محدود رکھتا ہے۔ اس نے 2007ء میں ازبک جنگجوؤں کو زبردستی نکال باہر کیا تھا۔

القاعدہ اور ازبک اسلامی تحریک

2002ء کی دہائی میں امریکی فوجوں کے ہاتھوں طالبان حکومت کے خاتمے کے فوراً بعد ازبک اسلامی تحریک کے ہزاروں لوگ طاہر یلدیشیف کی قیادت میں اور القاعدہ کے سینکڑوں عرب اراکین جنوبی وزیرستان آ گئے۔ پہلے یہ لوگ وانا میں رہائش پذیر ہوئے۔ یہ احمد زئی وزیر قبیلے کا

علاقے سے۔ ازبک اور عرب باشندے فر فر پشتو بولتے تھے اور مقامی شلوار قمیض پہنتے تھے۔ اسی لیے فوری طور پر ان کی پہچان بھی خاصی مشکل مسئلہ تھی۔ انہوں نے انگور اڈہ، اعظم ورسک، اور شن ورسک (وانا کے ارد گرد، افغان سرحد کے ساتھ ساتھ) میں جائیدادیں اور زرعی زمینیں بھی خریدی ہیں۔ تاجک، ترکمان اور چیچن لوگوں نے بھی یہی کچھ کیا۔ وانا میں 2004ء کے فوجی آپریشن کے دوران، القاعدہ کا نائب امیر یمن الظواہری بھی مبینہ طور پر وانا کے قریب ہی کہیں مقیم تھا۔

2008-09ء میں امریکی ڈرون کے مسلسل حملوں کی وجہ سے القاعدہ سے وابستہ بہت سے عرب جنوبی وزیرستان کے محسود قبیلے کے زیر کنٹرول علاقوں میں منتقل ہو گئے، مثلاً باروند، مکین، مدعا سام، دریگا، سرا روگاہ اور دوا توئی وغیرہ ہیں۔ ازبک اسلامی تحریک کا لیڈر طاہر یلداشیف محسودوں کے اسی علاقے میں امریکی ڈرون حملے کے نتیجے میں (اگست 2009ء کے آخر میں) شدید زخمی ہو کر جاں بحق ہو گیا۔ اگرچہ تازہ اطلاعات یہ ہیں کہ وہ ان حملوں سے بچ نکلا تھا۔ حالیہ پاکستانی فوجی آپریشن کی وجہ سے مجبور ہو کر، ازبکوں کی اکثریت، لگ بھگ 2500، مدعا کے نزدیک ایک پہاڑی علاقے پیر غر میں جا بسی۔

اسی دوران وہاں میں مقیم ازبک جنگجوؤں سے محسود طالبان کو بہت توقعات تھیں کہ وہ خزاں 2009ء کے فوجی آپریشن کے خلاف جنگجوی دیں گے، باروند، مکین، مدعا، سرا روگا میں بھرپور جوابی کارروائی کریں گے لیکن انہوں نے مایوس کیا تو جنوبی وزیرستان کے تمام اہم دیہات اور قصبوں میں ان کا تعاقب کیا گیا اور ان میں سے کئی کو شمالی وزیرستان میں جا کر پناہ لینا پڑی۔ تاہم بچے کچھے ازبک پاکستانی فوج کے خلاف کارروائیاں کرتے رہتے ہیں... مدعا، مکین، کانی گرم اور دوا توئی کی فوجی چوکیوں کو اور بعض اوقات جنوبی وزیرستان میں سرروغہ کے فوجی ٹھکانوں کو نشانہ بناتے ہیں۔ شمالی اور جنوبی وزیرستان کے درمیان (پیر غر کے) پہاڑی راستوں پر وہ گھوڑوں پر سفر کرتے ہیں۔ رات کے وقت بورا کئی اور توحیدی چندئی کے دیہات میں قیام کرتے ہیں اور اسی طرح میر علی اور میران شاہ لوٹتے ہیں۔

القاعدہ سے وابستہ زیادہ تر عرب باشندے، جنوبی وزیرستان کے شہروں اور ان کے ارد گرد ڈرون حملوں کی وجہ سے، جنوبی وزیرستان سے شمالی وزیرستان منتقل ہو گئے ہیں۔ فاٹا تحقیقاتی مرکز کے لیے جنوبی وزیرستان کے نمائندے سیلاب محسود اور ایسوسی ایٹڈ پریس کے رپورٹر اشتیاق محسود کے مطابق 2009ء کے آخر اور 2010ء کی ابتدا میں پاکستانی فوج کے ساتھ تصادم میں (اور امریکی ڈرون حملوں) 32 سینئر یا درمیانے درجے کے القاعدہ شدت پسند عرب مارے گئے تھے۔

کوئٹہ شوریٰ طالبان۔ پاکستانی طالبان تحریک (وزیرستان) اور کوئٹہ شوریٰ کے مابین تعلق بہت پیچیدہ ہے۔ دونوں تنظیمیں ہی انتہائی خفیہ ہیں لیکن پاکستانی طالبان ملا عمر کو اپنا امیر سمجھتے ہیں۔ کوئٹہ شوریٰ طالبان کے موسم گرما 2009ء میں جاری کردہ ضابطہ اخلاق کا جنوبی وزیرستان TTP کے آپریشنز پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ تاہم سراج حقانی اور اس کے ایک اہم کمانڈر ملا سنگین کے ذریعے پاکستانی طالبان اور کوئٹہ شوریٰ طالبان کے درمیان باہمی میں رابطے رہے ہیں۔

تحریک طالبان پاکستان

نیچے دیا گیا چارٹ تحریک طالبان کے جنوبی وزیرستان میں موجودہ ڈھانچے کا ایک مختصر سا خاکہ ہے جس کی تفصیلات کچھ یوں ہیں:

امیر — حکیم اللہ محسود

نائب امیر — مولوی فقیر محمد

جنرل سیکرٹری — مولانا فضل اللہ

(وہ سوات کے طالبان کے بھی لیڈر ہیں۔)

امیر جنوبی وزیرستان — ولی الرحمن محسود

نائب امیر جنوبی وزیرستان — خان سعید موسوم سجنا

طالبان کا فوجی منصوبہ ساز اور خودکش حملوں کا سربراہ۔ قاری حسین

جرائم پیشہ افراد کا سربراہ — شمیم محسود

اور لدھا کا امیر

ترجمان۔ رئیس خان محسود (موسوم اعظم طارق)

وزیرستان میں ٹرانسپورٹ کا سربراہ۔ نور محمد

فاٹا میں TTP گروپس سے۔ شیر اعظم اکا

وانا طالبان:

سربراہ۔ ملا نذیر

نائب امیر — ملنگ وزیر حلیم خان وزیر

وانا میں احمد زئی وزیر قبیلے کی شاخوں کے ساتھ رابطہ کار — مشتاق خان وزیر

عبداللہ محسود گروپ

گروپ کا سرپرست اعلیٰ۔ بائث خان محسود شیر محمد محسود

فوجی سرگرمیوں کا انچارج مصباح الدین محسود نائب امیر ترکستان بھٹانی
ترکستان بھٹانی گروپ
امیر ترکستانی گروپ، ترکستان بھٹانی
نائب امیر اخلاص خان بموسوم وزیرستان بابا

وزیرستان کی جنگ، بیت اللہ کے بعد

تحریک طالبان کا پہلا لیڈر بیت اللہ محسود 1980ء کی دہائی میں سوویت مخالف جہاد کے دوران ایک کرشماتی شخصیت بن گیا تھا۔ شوبی خیل کی شاخ سے تعلق رکھنے والا یک محسود، جو دعا فوجی کا شوقین تھا، افغانستان سے واپس آیا تو بنوں کے نزدیک لنڈی دھوک کے ایک پرائمری سکول میں جم ٹیچر بننے کا خواہاں تھا۔ 1990ء کے عشرے کے آخر میں اس کے افغان طالبان سے قریبی تعلقات ہو گئے تھے کیونکہ وہ علاقے میں آنے والے افغان مجاہدین سے مسلسل رابطے میں رہتا تھا۔ 2001ء میں افغانستان میں طالبان حکومت کے خاتمے کے بعد بیت اللہ محسود نے جنوبی وزیرستان میں مقامی طالبان تحریک منظم کرنا شروع کر دی۔ اس تحریک نے افغانستان سے آنے والے طالبان اور القاعدہ کے لوگوں کو پناہ دی اور مدد دی۔ اس طرح اس کے ان سے رابطے اور بھی گہرے ہو گئے۔ بیت اللہ محسود اپنی ذہانت، تحمل اور برداشت کے لیے مشہور تھا اور بے پرجوش اور وفادار (اور علاقے میں آنے والے ازبک باشندوں) ساتھیوں کی بیچ میں رہتا تھا۔ تحریک طالبان پاکستان کی تشکیل کے ساتھ ہی وہ منظر عام پر آیا جس میں اس نے مختلف طالبان گروپوں کو ایک ہی تنظیم کے تحت اکٹھا کر دیا۔ اس کے دو اہم منصوبے بہت مشہور ہوئے۔ ایک تو سابق وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کے 2007ء میں قتل کا منصوبہ تھا اور دوسرا پارلیمنٹ میں پبلک فرارت کو نشانہ بنانے کے لیے پاکستانیوں کی ٹیم روانہ کرنا۔

5 اگست 2009ء کو مارے جانے سے قبل وہ مسلسل امریکی ڈرون حملوں کا ٹارگٹ رہا۔ بیت اللہ محسود کی وفات کے بعد اس کا ترجمان حکیم اللہ محسود جو کہ اس کا ڈرائیور رہا تھا، قاری حسین (ولی الرحمن محسود)، سعید، مولوی نظمت محسود، رئیس خان بموسوم اعظم طارق) کے ساتھ ساتھ خود بھی تحریک طالبان پاکستان کی امارت کا اہم امیدوار بن گیا۔ افغان جہاد کے ایک دیومالائی کردار جلال الدین حقانی کے بیٹے سراج الدین حقانی نے مداخلت کر کے طالبان کے موجودہ امریکی جنگ کو گروہی تصادم ہونے سے بچایا۔ اس نے انہیں بتایا کہ "عظیم لیڈر کے راستے کی پیروی کرو (اور) اپنی کوششیں اپنے حقیقی دشمنوں کے لیے بچاؤ۔" حکیم اللہ اور ولی الرحمن

بھی تصادم سے بچنا چاہتے تھے۔ انھیں پتہ تھا کہ اس طرح (جنوبی وزیرستان میں ہی نہیں بلکہ پورے فاٹا اور صوبہ سرحد میں) ساری تحریک تتر بتر ہو جائے گی۔ کہا جاتا ہے کہ ولی الرحمٰن کو آئیندہ ہونے والی "پیشرفت" کے بارے میں علم تھا اور وہ پاکستانی طالبان میں کوئی تفرقہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا

امارت کے لیے تین اہم امیدواروں حکیم اللہ محسود، قاری حسین اور اعظم طارق کا تعلق محسود قبیلے کی بہلول زئی شاخ سے تھا جبکہ ولی الرحمٰن، مولوی عظمت اللہ اور سعید منان زئی شاخ سے تھے۔ تاریخی طور پر مان زئی محسود علاقے کی اقتدار کی سیاست میں ہمیشہ آگے آگے رہے ہیں۔ مزید براں جنوبی وزیرستان میں محسود طالبان سے مبینہ طور پر ولی الرحمٰن کی حمایت کی کیونکہ وہ بیت اللہ کا نائب رہ چکا تھا۔

2009ء کے موسم گرما کے آخر میں، کئی ہفتوں کے لڑائی جھگڑے کے بعد، مان زئی بہلول زئی کے مقابلے میں امارت کی جنگ ہار گئے کیونکہ حکیم اللہ محسود کے لیے بہلول زئی قبیلے کی حمایت تو تھی ہی، جبکہ باجوڑ، کرم اور اورکزئی کے علاقوں میں طالبان جنگ جوؤں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ ان بحرانی ہفتوں میں میڈیا میں یہ افواہیں بھی گردش کرتی رہیں کہ حکیم اللہ محسود، ولی الرحمٰن کے ساتھ ایک تصادم میں مارا گیا ہے لیکن بعد میں مقامی انتظامیہ نے جنوبی وزیرستان کے صحافیوں کو مدعو کیا اور اس میٹنگ میں سارے لیڈروں کو ایک ساتھ پیش کرا کے اتحاد کا مظاہرہ کیا۔ جب حکیم اللہ محسود نے سارے اہم امیدواروں کو ایک طرف کر دیا تو 40 رکنی طالبان شوریٰ کے پاس اسے تحریک کا امیر بنانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ حوصلہ افزائی کے لیے ولی الرحمٰن کو جنوبی وزیرستان کے طالبان کا امیر بنا دیا گیا، جہاں سے 7 سے دس ہزار افراد اس کی کمان میں ہیں۔

مقامی ذرائع کے مطابق حکیم اللہ، حسین اور اعظم طارق نے جنوبی وزیرستان کے محسود طالبان پر کنٹرول حاصل کیا اور اب وہ پاکستانی فوج سے نبرد آزما ہیں۔ وزیرستان میں طالبان ذرائع نے یہ بھی کہا ہے کہ حکیم اللہ نے اپنے اہل خانہ کو شمالی وزیرستان شفٹ کر دیا ہے جہاں (شمالی وزیرستان کا طالبان امیر) حافظ گل بہادر ان کا خیال رکھتا ہے۔ ولی الرحمٰن بھی اپنے گھرانے کے ساتھ میران شاہ میں ہی مقیم ہے۔

جنوبی وزیرستان میں اہم جنگ جو کمانڈر

محسود تحریک طالبان کا پہلا امیر 31 سالہ حکیم اللہ محسود اشنگی کی ایک شاخ ووگی خیل سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ عبداللہ دین محسود کا بیٹا تھا۔ اس کے چار بھائیوں میں سے کم از کم دو، اعجاز اور کلیم اللہ 2008ء میں پاکستانی فوج کے ساتھ ایک تصادم میں مارے گئے تھے۔ اس کی چار بہنیں

بھی ہیں۔ حکیم اللہ کوٹ کئی (سپین کئی رغزئی) کے علاقے سے تھا۔ تحریک کے اس امیر کی دو بیویاں تھیں۔ ایک اس کے اپنے اشنگی قبیلے سے اور دوسری اورکزئی میں آفریدی قبیلے سے۔ اس نے پانچ سال کی عمر میں پہلی ابتدائی تعلیم جنوبی وزیرستان کی تحصیل سروکئی میں دارالعلوم شریعت کے مدرسے سے حاصل کی۔ کوٹ کئی سے ہی اس نے مڈل سکول کا امتحان بھی پاس کیا۔ اس نے مذہبی تعلیم ادھوری ہی چھوڑ دی کیونکہ اس نے 2003ء میں جنوبی وزیرستان میں قائم ہونے والی مقامی طالبان تنظیم میں شمولیت کر لی اور امریکیوں سے لڑنے افغانستان چلا گیا، جہاں اس نے چار ماہ گزارے۔ افغانستان میں حکیم اللہ کا پہلا جنگی تجربہ بیت اللہ محسود کی قیادت میں ہوا۔ دو ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ اس نے 2006ء میں کچھ وقت کے لیے بیت اللہ محسود کے ترجمان کے فرائض بھی انجام دیئے۔ پکتیا میں طالبان کمانڈر مولانا نظیمیں اور سراج الدین حقانی کے جنگ جوؤں کے ساتھ مل کر 2004ء میں صوبہ خوست میں مشا کندی چیک پوسٹ پر حملہ کیا۔ افغانستان میں قیام کے دوران حکیم اللہ نے صوبہ ہلمند کے ضلع سنگین میں اتحادی افواج کے خلاف کئی ہفتے تک جنگی سرگرمیاں جاری رکھیں۔

قابل وہ سرحد پار حالیہ حملوں میں شریک رہا ہے اور نیٹو کے فوجی قافلوں اور اشیائے رسد کے سینکڑوں ٹرکوں کو نشانہ بناتا رہا ہے۔ پشاور میں دسمبر 2008ء کا سانحہ بھی حکیم اللہ کی ہی منصوبہ بندی کا شاخسانہ تھا جس میں درجنوں HUMVEES (ٹرک جل کر راکھ کا ڈھیر ہو گئے۔

2004ء کے شروع میں افغانستان میں واپسی کے بعد حکیم اللہ نے وانا کے علاقے کالوشہ میں پاکستانی فوج پر اپنی توجہ مرکوز کی۔ جہاں پاکستانی فوج نے (طالبان کے مقامی امیر) نیک محمد کے خلاف آپریشن شروع کیا تھا۔ حکیم اللہ 2006ء اور 2008ء میں بھی پاکستانی فوج سے لڑتا رہا۔ ان دنوں بھی فوج مقامی طالبان کے خلاف آپریشن میں مصروف تھی۔ حکیم اللہ اس وقت تک سو سے ڈیڑھ سو طالبان جنگ جوؤں کا کمانڈر بن چکا تھا۔ دو دفعہ ہی پاکستانی فوج کو امن معاہدے کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ حکیم اللہ نے القاعدہ کے جنگ جوؤں اور افغان طالبان کو علاقے میں نہ صرف پناہ دی بلکہ انھیں ٹھکانے بھی فراہم کیے اور آج بھی وہ اس قسم کی کارروائیوں میں مصروف ہے۔

حکیم اللہ جب وزیرستان طالبان میں شامل ہوا تو اس کی عمر 23 سال تھی۔ ایک ڈیڑھ سال کے عرصے میں گروپ پوری طرح منظم ہو چکا تھا۔ طالبان شوریٰ نے پہلے اسے کرم میں محسود طالبان کا امیر بنایا اور پھر اورکزئی اور خیبر ایجنسیاں بھی اس کے ماتحت کر دیں۔ حکیم اللہ بہت مستعد مہذب رہتا اور طالبان واحد شخص تھا جسے تین ایجنسیوں کا انتظام سونپا گیا۔ اس نے اپنی امارت کے

دوران TTP کو قبائلی ایجنسیوں میں انتہائی مضبوط بنا دیا۔ کچھ عرصے کے لیے وہ مہمند اور باجوڑ میں بھی محسود طالبان کا سربراہ رہا۔ لیکن اس کی زیادہ تر توجہ اورکزئی، کرم اور خیبر پر ہی مرکوز رہی۔

حکیم اللہ شیعوں کا سخت مخالف تھا اور انہیں کافر گردانتا تھا۔ طالبان کی حامی اور شیعہ مخالف ایک شدت پسند گروپ سپاہ صحابہ سے اس کے قریبی تعلقات رہے ہیں۔ کرم میں طالبان کے امیر کی حیثیت میں، اس نے شیعوں کے خلاف خاصی لڑائیاں لڑیں اور 2007ء کے شروع میں ہنگو میں بھی فرقہ وارانہ فسادات میں حصہ لیا۔

حکیم اللہ خاصا گرم مزاج آدمی تھا۔ اسے جلدی غصہ آ جاتا تھا، مخالفت برداشت نہیں کر پاتا تھا۔ وہ اپنی درندگی اور جذباتیت کے سبب مشہور تھا۔ مبینہ طور پر کئی لوگ اس کے ہاتھوں ہلاک ہوئے۔ ان میں بعض ایسے طالبان بھی شامل تھے جنہوں نے اس کے احکامات سے انحراف کیا تھا۔ البتہ بیت اللہ محسود کی نسبت صحافیوں سے وہ تعلقات زیادہ رکھتا تھا۔ اس نے کئی ویڈیو اور آڈیو ٹیپس جاری کیں۔ ان میں سے ایک ٹیپ خودکش بمبار کی تھی جس نے 30 دسمبر 2009ء کو خوست (افغانستان) میں سی آئی اے کے مرکز پر حملہ کیا تھا۔ حکیم اللہ کو تحریک طالبان پاکستان کی امارت اس وقت ملی جب فوج کے ہاتھوں بری طرح کمزور ہو کر تحریک کو جنوبی وزیرستان کے علاوہ فاٹا کے دوسرے تمام قبائل کی حمایت بھی ختم ہو گئی تھی۔ مستقبل قریب میں مشکل ہی سے تحریک طالبان پاکستانی حکومت کے خلاف مزید محاذ آرائی کر پائے گی۔ تحریک مقامی محسود طالبان پر حملوں میں بھی گھبراہٹ کا شکار ہو گی کیونکہ قبائل کے مابین خون ریزی کا خوف ان پر سوار ہو گا۔

ممکن ہے خوست کا حملہ ایک ٹرننگ پوائنٹ رہا ہو تاہم حکیم اللہ نے اس خودکش حملے کی ذمہ داری قبول کر لی جس میں سی آئی اے کے ساتھ ایک افسر اور اردن کا ایک خفیہ ایجنٹ مارے گئے تھے اور کئی لوگ زخمی ہوئے تھے۔ تحریک طالبان پاکستان نے اس کی ویڈیو ریلیز کی تھی جس میں حکیم اللہ اور خودکش بمبار (ہمام البلاوی) اکٹھے بیٹھے دکھائے گئے تھے۔ البلاوی نے کہا تھا کہ اگست 2009ء میں ڈرون حملے کے ذریعے بیت اللہ محسود کی ہلاکت کا انتقام لینے کے لیے یہ حملہ کیا گیا تھا۔ مبینہ طور پر کئی ڈرون حملے، خوست میں موجود سی آئی اے ٹیم کنٹرول کرتی ہے۔ اگلے چند ہفتوں میں شمالی وزیرستان میں اتنے ڈرون میزائل مختلف جگہوں پر برسائے گئے جن کی مثال نہیں ملتی۔ انہی میں سے ایک میزائل فائر سے حکیم اللہ محسود بھی زخمی ہوا تھا۔ امریکی حکام کا کہنا ہے کہ وہ ان زخموں سے جانبر نہیں ہو سکا ہو گا مگر تحریک کے ذرائع اس کی موت کے انکاری ہیں۔ 6 اور 17 جنوری کو حکیم اللہ محسود نے ایک ویڈیو ٹیپ جاری کی تا کہ اس کی موت کی افواہیں ختم ہو جائیں لیکن اس کے بعد اس کے بارے میں کوئی خبر نہیں ملی۔ طالبان کے مسلسل انکار کے باوجود عام خیال

بھی ہے کہ وہ مارا جا چکا ہے۔

ولی الرحمٰن محسود

40 سالہ ولی الرحمٰن عصمت اللہ کا بیٹا ہے اور جنوبی وزیرستان کے مالی خیل قبیلے (محسود قبیلے کی شاخ) کی منہ کلائی گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا گھرانہ میراں شاہ میں رہتا ہے لیکن وہ پورے وزیرستان میں گھومتا رہتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ آج کل صوبی کرم کے علاقے میں رہتا ہے اور وہ جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد میں پڑھتا رہا ہے۔ 1996ء میں گریجویشن کے بعد وہ کان گرم کے مدرسے میں پڑھانے کے لیے جنوبی وزیرستان لوٹا۔ 2004ء میں طالبان میں شامل ہونے سے پہلے، ولی الرحمٰن جمعیت علمائے اسلام (فضل الرحمٰن گروپ) سے وابستہ تھا۔ اب بھی اس کے ان سے روابط ہیں۔

ولی الرحمٰن منکسر المزاج، ذہین، متحمل اور نرم گفتار سمجھا جاتا ہے۔ تحریک طالبان پاکستان کی جانشینی کے مسئلے پر ابتدائی تنازعے کے باوجود وہ آج بھی شعلہ رو حکیم اللہ کا قریبی اتحادی جانا جاتا ہے۔ آج کل وہ جنوبی وزیرستان کی امارت کے ساتھ ساتھ، تنظیم کی فوجی حکمت عملی کا نگران بھی ہے۔ 2007ء میں اسے تحریک کے مالی معاملات دیکھنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ وہ سرحد پار افغان علاقوں میں امریکی و نیٹو افواج پر حملوں میں شریک رہا ہے اور 2008ء کے دوران پاکستانی فوج سے بھی برسرپیکار رہا ہے۔ اس کا بھائی قریب الرحمٰن، جنوبی وزیرستان کے سپن لوئی قلعے پر شدت پسندوں کے حملے کے دوران (2008ء میں) پاکستانی فوج کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔

فاٹا ریسرچ سنٹر کے مطابق، رپورٹر سیلاب محسود کا اندازہ ہے کہ ولی اور حکیم اللہ کے درمیان ان دنوں مخاصمت بہت بڑھ گئی تھی کیونکہ ولی پاکستانی فوج سے TTP کا تصادم نہیں چاہتا تھا۔ ولی کا خیال تھا کہ اس صورت حال نے محسود قبیلے کو تباہ کر ڈالا ہے۔ ولی الرحمٰن کے پاکستانی حکومت کے ساتھ، مبینہ طور پر پشاور یا خیبر میں خفیہ مذاکرات چل رہے ہیں لیکن قاری حسین اور حکیم اللہ پاکستانی فوج سے جنگ جاری رکھنا چاہتے ہیں۔

قاری حسین

بیت اللہ محسود کی موت کے بعد، TTP کا ایک اور اہم کمانڈر 36 سالہ قاری حسین ہے اور اس کا تعلق جنوبی وزیرستان کے بہلول زئی قبیلے کی شاخ اشتاگی سے ہے۔ وہ سپن کئی راغزئی کے علاقے میں رہائش پذیر تھا اور بیت اللہ محسود کا قریبی معاون سمجھا جاتا تھا۔ اس نے کراچی کے جامعہ بنوریہ سے 1994ء میں گریجویشن کی۔ وہ شیعہ مخالف (شدت پسند) گروپ سپاہ صحابہ کا

رکن بن گیا۔ 2004ء میں اس نے تحریک طالبان میں شمولیت اختیار کی۔ حسین کی شہرت ایک بے درد، سفاک، شیعہ مخالف اور شعلہ بیان مقرر کی ہے۔ اس نے 2006ء کے دوران پاکستان بھر میں خودکش حملوں کی (سفاکانہ) مہم کے لیے خود کو وقف کر دیا۔ اس نے سینکڑوں خودکش بمبار تیار کیے۔ (ان میں بعض تو گیارہ سال کے لگ بھگ تھے) تاکہ پاکستانی فوج اور حکومت کے مراکز کے ساتھ ساتھ مارکیٹوں، جنازوں، ہسپتالوں اور دوسرے "نرم" ٹارگٹس کو دہشت گردی کا نشانہ بنایا جا سکے۔ صرف 2008ء میں پورے پاکستان میں 66 خودکش حملوں کے دوران مبینہ طور پر 965 افراد مارے گئے جن میں پولیس اور فوج کے اہل کاروں کے ساتھ ساتھ بہت سے معصوم شہری بھی شامل تھے۔

2009ء میں 1200 افراد جاں بحق ہوئے اور 2800 افراد زخمی ہوئے۔ پاکستان خفیہ حکام کا کہنا ہے کہ پاکستان میں 70% خودکش بمباروں کی تربیت قاری حسین کے کیمپوں میں کی گئی تھی۔ پاکستانی حکومت نے قاری حسین کی گرفتاری یا موت پر ۹ کروڑ روپے کا انعام رکھا ہوا ہے۔ اس کا اثر صرف پاکستان تک ہی محدود نہیں۔ 2007ء کی اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ کے مطابق افغانستان میں 80% خودکش بمبار پاکستان کے کیمپوں سے آئے تھے۔

حسین کی شیعوں کے خلاف انتہائی نفرت کا ذکر بے جا نہ ہوگا۔ وہ مبینہ طور پر شیعوں کو ٹارگٹ اور ذبیحہ (مستقبل حال) سے پکڑ کر ان کی دراز تذلیل میں اپنے نمونے پر بے جا تا تھا اور انہیں تشدد کا نشانہ بنانے کے لیے جنگلی جانوروں کے ساتھ باندھ دیتا تھا۔ بعض قیدی شیعوں کے اس نے سر بھی قلم کیے۔ قاری حسین نے وزیرستان میں سپاہ صحابہ کو مضبوط بنانے کے لیے بھی خاصا کام کیا۔ اور سرحد کے علاقوں میں فرقہ وارانہ فسادات کے بیج بونے اور ورغلانے کو بھی شامل کیا۔
پاکستانی طالبان کے کرک کی کے امیر کی حیثیت سے ایک بار حسین نے موجودہ فوجی آپریشن کو اشتعال انگیز قرار دیتے ہوئے دھمکی دی تھی کہ وہ حکومت کے خلاف اور زیادہ خودکش بمباروں کا استعمال کرے گا۔ حسین کے ایک بھائی نے 2009ء (نومبر) میں پشاور میں خودکش حملہ کیا تھا۔ الیاس محمد جنگل والد کسی طالبان کمانڈر کے قریبی رشتہ دار نے کیا تھا۔ (2009ء کی خزاں میں) فوجی آپریشن کے بعد وہ جنوبی وزیرستان سے فرار ہو کر، مبینہ طور پر آج کل میر علی (شمالی وزیرستان) میں مقیم ہے۔ وہاں سے جنوبی اور شمالی وزیرستان کے علاقوں میراں شاہ، میر علی، وانا، شیل اور دوس گل میں پھیلے ہوئے اور چھپے کی زبردست حمایت حاصل ہے۔

جنوبی وزیرستان کے مقامی اور طالبان ذرائع کے مطابق قاری حسین نے حکیم اللہ کی مبینہ موت کے بعد تحریک کا امیر بننے سے انکار کر دیا ہے۔ غالباً موت کا شکار ہونے سے بچنے کے

ہے، وہ زیادہ نمایاں نہیں ہونا چاہتا۔ اسی لیے وہ زیادہ تر میرعلی میں رہتا ہے۔

اعظم طارق

جنوبی وزیرستان میں TTP کا موجودہ ترجمان 40 سالہ اعظم طارق محسود قبیلے کی شاخ کژئی خیل سے تعلق رکھتا ہے اور ڈیلے (Delay) کے علاقے کا باشندہ ہے۔ رئیس خان محسود اس کا اصلی نام ہے۔ تاہم ایک زمانے میں ٹانک شہر کا سکول ٹیچر (استاد) کے نام سے بھی خاصا مشہور ہے۔ 2008-9ء میں وہ ٹانک شہر کا امیر تھا۔ یہاں محسود قبیلے کی بھاری اکثریت ہے۔ سپاہ صحابہ سے بھی اس کا تعلق ہے۔ ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ مقامی محسود قبائل کی روایات اور سیاست کا ماہر بھی جانا جاتا ہے۔ اسی لیے مقامی لوگ پاکستانی عدالتی نظام کے بجائے اپنے تنازعات کے حل کے لیے اس کے پاس آیا کرتے تھے۔ ستمبر 2009ء میں طارق کو TTP کا ترجمان مقرر کیا گیا (وسط اگست میں مولوی عمر (باجوڑ) کی گرفتاری کے بعد)۔ حکیم اللہ اور قاری حسین سے اس کا قریبی تعلق ہے۔

نور سعید

30 سالہ نور سعید کا تعلق محسود قبیلے کی شاخ شوبی خیل سے ہے۔ وہ TTP کی شوریٰ کا رکن ہے۔ وہ محسود طالبان میں بیت اللہ محسود کا نائب اور جرگوں کی ترجمانی ہونے کے ناطے بہت مقبول ہے۔ (2004ء میں) محسود طالبان کی تحریک میں شامل ہونے سے پہلے وہ ایک کسان تھا۔ نور سعید کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بہت مذہبی شخص ہے اور لوگوں کے ساتھ میل جول میں انتہائی منکسر المزاج ہے۔

شمیم محسود

جرائم پیشہ افراد سے متعلق TTP کے نیٹ ورک کا سربراہ 35 سالہ شمیم محسود قبیلے کی شاخ شاماں خیل سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا آبائی گاؤں ناگی (لدھا) میں ہے۔ شمیم کا تعلق لدھا کے ایک انتہائی غریب گھرانے سے ہے۔ 2007ء میں TTP کا لدھا میں امیر بنائے جانے سے قبل وہ کئی سال تک درخ زئی میں بطور ویٹر کام کرتا تھا۔ آج کل وہ 30 جرائم پیشہ افراد پر مشتمل طالبان کمانڈر گروپ کا سربراہ ہے۔ یہ گروپ ڈاکہ زنی، اغوا برائے تاوان اور بینکوں میں وارداتوں کے ذریعے موجودہ شدت پسند کارروائیوں کے لیے لاکھوں کروڑوں روپے اکٹھے کرتا ہے۔ پورے پاکستان میں اس کے مخبر موجود ہیں جو انھیں کاروان کی حکمتوں اور وہاں سے متوقع فائدے کے بارے میں خفیہ معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔

وزیرستان میں چھوٹے چھوٹے محسود جنگجو گروہ

عبداللہ محسود گروپ (پاکستان کا حامی)

شدت پسندوں کے ایک چھوٹے سے گروپ کا سربراہ، عبداللہ محسود ابتدا میں جنوبی وزیرستان کے گاؤں نانو اور بعد ازاں شمالی وزیرستان میں میران شاہ میں رہا کرتا تھا۔ اس نے دو سال امریکی فوجی جیل گوانتاناموبے میں گزارے۔ مارچ 2004ء میں وہاں سے رہائی کے بعد اس نے امریکی افواج کے خلاف لڑائی کے لیے مقامی محسود طالبان کو منظم کرنا شروع کر دیا۔ اکتوبر 2004ء میں وہ دو چینی انجینئروں کے اغوا میں ملوث رہا۔ ان میں سے ایک پاکستانی فوج کے ریسکیو آپریشن کے دوران مارا گیا۔ عبداللہ نے ژوب (بلوچستان) میں دستی بم کے دھماکے کے ذریعے خود کو موت کے حوالے کر دیا۔ پاک فوج کا کہنا تھا کہ جولائی 2007ء میں وہ فوجی دستوں سے لڑتے ہوئے مارا گیا تھا۔

عبداللہ کے انتقال کے بعد، اس کے پیروکار سیف الرحمٰن محسود کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ بعد میں عبداللہ کا کزن زین الدین محسود اس گروہ کا سربراہ بن گیا۔ وہ قاری زین کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ قاری زین کے حملوں کو امریکی افواج تک محدود کرنے اور پاکستانی فوجی اداروں کو نشانہ بنانے کے مسئلے پر شدید اختلافات ہو گئے۔ تحریک طالبان پاکستان حکومت سے بھی جنگ کرنا چاہتی تھی چنانچہ 2008ء میں قتل و غارت کے واقعات کے بعد انہیں جنوبی وزیرستان سے نکال دیا گیا تھا۔ جون 2009ء میں زین الدین اپنے ہی ایک محافظ کے ہاتھوں مارا گیا۔ زین الدین کا چھوٹا بھائی مصباح الدین محسود آج کل گروپ کا لیڈر ہے اور سب سے زیادہ حکومتی حامی سمجھا جاتا ہے۔ اس کی دو وجوہ ہیں۔ ایک تو گروپ کی تحریک طالبان پاکستان سے دشمنی کے مسئلے پر علیحدگی اور دوسرے مصباح الدین کی فوجی طاقت کا TTP سے کوئی مقابلہ ہی نہیں اس لیے اسے حکومتی تحفظ چاہیے۔

عبداللہ محسود کا گروپ جس میں لگ بھگ دو ہزار جنگجو شامل ہیں سرحد کے ٹانک اور ڈی آئی خان میں مرکوز ہے اور اسے پاکستانی حکومت کی مدد حاصل ہے۔ اس کے جنگجو ترکستانی بھٹانی گروپ کے اتحادی ہیں۔ بھٹانی بھی TTP مخالف گروپ ہے اور اس کے لیے مشکلات پیدا کرتا رہتا ہے... ان دونوں گروہوں نے مل کر پاکستانی طالبان کو ٹانک اور ڈی آئی خان سے واپس جنوبی وزیرستان کی جانب دھکیل دیا ہے۔ اس کشمکش میں دونوں اطراف کے بہت سے لوگ مارے گئے۔

شہریار محسود (پاکستان مخالف) گروپ

35 سالہ شہریار کا تعلق شوبی خیل شاخ سے ہے اور وہ جنوبی وزیرستان کے گاؤں جنگرا کا باشندہ ہے۔ بیت اللہ محسود سے اس کی کبھی نہیں بنی۔ شہریار کا خیال تھا کہ اس کا خاندان زیادہ دولت مند اور شہریار کے چھوٹے سے گروپ میں 190 جنگ جو شامل ہیں جو افغانستان میں سرحد پار کارروائیاں کرتے ہیں۔ ساتھ ہی (ٹانک اور ڈی آئی خان میں) کاریں چھیننے اور اغوا برائے تاوان جیسی مجرمانہ سرگرمیوں میں بھی ملوث ہیں۔

بیت اللہ محسود والی محاذ آرائی حکیم اللہ کے زمانے میں بھی چلتی رہی۔ وہ حکومت مخالف گروپ سمجھا جاتا ہے کیونکہ وہ پاکستانی پولیس اور حکومت کے اہل کاروں کو نشانہ بناتا رہتا ہے۔

وزیر جنگ جو

ملا نذیر، وانا طالبان (حکومت کے حامی)

وانا کے احمد زئی قبیلے کا ایک اہم کمانڈر ملا نذیر ہے۔ اس نے مدرسے میں تربیت حاصل کی تھی۔ افغانستان اور پاکستان، دونوں ملکوں کی شہریت کا حامل ملا نذیر حزب اسلامی کے امیر گلبدین حکمت یار کا قریبی معاون تھا۔ 2006ء کے آخر میں اس نے جنوبی وزیرستان میں مقیم ازبک اسلامی تحریک کے (ہزاروں) جنگ جوؤں کی موجودگی کے مسئلے پر حاجی شریف اور حاجی عمر اور ان کے ساتھیوں کی قیادت کو چیلنج کر دیا اور وانا طالبان کا امیر بن گیا۔ اس نے ازبک جنگ جوؤں پر احمد زئی وزیر قبیلے کے بہت سے ملکوں کے قتل کا الزام لگایا تھا۔ اپریل 2007ء میں دس دن کی لڑائی کے بعد ملا نذیر کے ساتھیوں نے مقامی احمد زئی وزیر قبیلے کی ملیشیا اور پاکستانی حکومت کی مدد سے دو ہزار ازبک جنگ جوؤں کو وانا سے نکال باہر کیا۔ بیت اللہ محسود نے فرار ہونے والے ازبک جنگ جوؤں کو محسود علاقے (درگاہ، میرانشاہ اور باروند) میں پناہ کی پیش کش کی۔ جس سے ملا نذیر سخت بگولا ہو گیا۔ بیت اللہ محسود کو خاص طور پر سراج الدین حقانی نے ان ازبکوں کو پناہ فراہم کرنے کے لیے کہا تھا کیونکہ ازبکوں کے بیوی بچوں اور جانے پناہ بھی نہ تھی۔ ان دنوں ملا نذیر وانا طالبان کے چودہ گروہوں کا منتظم ہے۔ ان میں ایک ہزار جنگ جو شامل ہیں جو امریکی اور نیٹو افواج کے خلاف سرحد پار کارروائیوں میں مصروف رہتے ہیں۔ امریکی ڈرون حملوں کے ذریعے کم از کم دو دفعہ اسے نشانہ بنایا گیا۔ ایک حملے میں اس کی ٹانگ بری طرح زخمی ہوگئی تھی۔ اسے حکومت کے حامی طالبان سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس کی تمام تر توجہ افغانستان میں اتحادی افواج کے خلاف کارروائی پر مرکوز ہوتی ہے تاہم عرب القاعدہ تحریک سے بھی اس کے قریبی تعلقات ہیں جیسے

کہ پہلے بھی بیان کیا گیا کہ ستمبر 2009ء کے واقعے کے بعد پاکستانی طالبان سے اس کی مخاصمت چلتی رہی ہے۔ ملا نذیر نے الزام لگایا تھا کہ اس کے کیا دو درجن محسود علاقے سے سے روکا (جنوبی وزیرستان) سے وانا واپس آتے ہوئے مارے گئے تھے۔ محسود قبیلے نے پانچ افراد اور چار ازبک، جو اس حملے میں ملوث تھے، ملا نذیر کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اسی باعث محسود اور احمد زئی وزیر قبائل کے درمیان کشیدگی چل رہی ہے۔ بیت اللہ محسود، ملا نذیر اور حافظ گل بہادر کی تشکیل شدہ شوریٰ اتحاد المجاہدین (2009ء) بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئی۔ نذیر کو اب وانا طالبان کا کمانڈر سمجھا جاتا ہے۔

ملا نذیر مخالف وزیر گروپس

حاجی شریف گروپ (حکومت مخالف)

وانا کے احمد زئی وزیر قبیلے کا پچاس سالہ حاجی شریف 500 جنگجوؤں کا سربراہ ہے۔ وہ پاکستانی اور افغان، دونوں حکومت کے خلاف لڑتا رہا ہے۔ وانا سے ازبک جنگجوؤں کے نکالے جانے کے وقت اس نے ان کی بھرپور مدد کی۔ ازبکوں کے نکالے جانے کے بعد، حاجی شریف میران شاہ منتقل ہو گیا اور مرحوم بیت اللہ محسود کا حلیف بن گیا تاہم ستمبر 2007ء میں حاجی شریف نے مقامی لوگوں اور حکومت کو نشانہ بنانے کے مسئلے پر ازبکوں سے اختلافات کے بعد، ملا نذیر سے مصالحت کر لی۔ اس کے بعد حاجی شریف نے جنوبی وزیرستان میں قبائلی عمائدین اور حکومتی اہلکاروں پر حملے بند کر دیے۔ پھر وہ وانا واپس چلا گیا اور آج کل وہیں مقیم ہے۔

حاجی عمر گروپ (حکومت مخالف)

تقریباً ساٹھ سالہ حاجی عمر 80ء کی دہائی کے سوویت مخالف جہاد کے شرکاء میں سے ہے۔ احمد زئی وزیر قبیلے کی شاخ یارگل خیل سے اس کا تعلق ہے۔ 2004ء میں جب فوج نے غیر ملکی جنگجوؤں اور ان کے حامیوں کو (نیک محمد کی وفات کے بعد) جنوبی وزیرستان سے نکالنے کے لیے آپریشن شروع کیا تو حاجی عمر وانا طالبان کا امیر تھا۔ مبینہ طور پر القاعدہ جنگجوؤں سے اس کے گہرے تعلقات تھے۔ وہ وانا میں مقامی عمائدین کے قتل میں ملوث تھا اور وزیرستان میں ازبکوں کا زبردست مددگار تھا۔ ازبکوں کی خاطر اس نے ملا نذیر سے جنگ مول لی اور پھر اپنے بھائی حاجی شریف کی طرح، میران شاہ میں پناہ حاصل کرنے پر مجبور ہوا، جہاں وہ مرحوم بیت اللہ کا اتحادی بن گیا۔ دسمبر 2006ء کے ایک امریکی ڈرون حملے میں مبینہ طور پر وہ ہلاک ہو گیا چند سو افراد پر

مشتمل اس کا گروہ اب بے اثر ہو کر رہ گیا ہے۔

عباس گروپ (حکومت مخالف)

مولوی عباس وزیر حاجی شریف اور حاجی عمر کا کزن ہے۔ اپریل 2007ء میں وہ ازبکوں کے مسئلے پر ان دونوں بھائیوں کی مخالفت میں ملا نذیر اور احمدزئی قبیلے کی ملیشیا کے ساتھ مل گیا تھا۔ 42 سالہ مولوی عباس بھی احمدزئی قبیلے سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ بھی امریکی اور نیٹو افواج کے خلاف سرحد پار حملوں میں شامل رہا ہے۔ 150 سے 200 جنگجو اس کی کمانڈ میں بتائے جاتے ہیں۔

نور اسلام گروپ (حکومت مخالف)

وزیری قبیلے کا ایک اور اہم جنگجو نور اسلام سوویت مخالف جہاد میں شریک رہا تھا۔ وہ حاجی شریف اور حاجی عمر کا بھائی ہے۔ اپریل 2007ء میں وہ ازبک جنگجوؤں کی طرف سے لڑا تھا اور بعد ازاں وانا چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ وہاں سے وہ بیت اللہ محسود کی پناہ میں چلا گیا۔ وہ ملا نذیر کا شدید دشمن ہے۔ اس کے ساتھیوں نے ملا نذیر کے نائب ملک خانان کو مئی 2008ء میں جنوبی وزیرستان میں مار ڈالا تھا۔ نور اسلام کے پاس مبینہ طور پر 250 سے 300 جنگجو ہیں۔ وہ انہیں سرحد پار امریکی اور نیٹو افواج پر حملوں کے لیے استعمال کرتا ہے۔ 2004ء میں اس نے پاک فوج پر بھی حملہ کیا تھا۔

وزیرستان میں بھٹانی گروپس

ترکستان بھٹانی گروپ (حکومت حامی)

جنوبی وزیرستان میں بھٹانی گروپس کے سرگرم عمل تین اہم کمانڈروں میں سے ایک ملک ترکستان بھٹانی فرنٹیئر کور کا ریٹائرڈ کارپورل ہے۔ وہ بھٹانی قبیلے کی شاخ حمت خیل سے تعلق رکھتا ہے اور جنڈولہ کے علاقے سروگھر کا باشندہ ہے۔ وہیں وہ امن کمیٹی کا سربراہ بھی ہے جس کا مقصد ٹانک اور جنڈولہ سے تحریک طالبان پاکستان کو دور رکھنا ہے۔ وہ حکومت کا حامی سمجھا جاتا ہے اور TTP کے خلاف عبداللہ محسود کا اتحادی ہے۔ پاکستانی طالبان نے کئی دفعہ ترکستان گروپ پر حملے کیے ہیں۔ 2008ء میں پاکستانی طالبان جنگجوؤں نے جنڈولہ پر حملہ کر کے امن کمیٹی کے تیس اراکین کو مار ڈالا تھا۔ ستمبر 2009ء میں TTP نے دوسرے بھٹانی شدت پسندوں کے ساتھ مل کر ٹانک، جنڈولہ اور سروگھر پر حملہ کر کے درجنوں لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ اس حملے میں ترکستان بچ نکلا تھا۔ آج کل وہ TTP کے خطرے سے بچنے کے لیے ٹانک اور ڈیرہ اسماعیل خان

میں زیادہ سرگرم نہیں ہے، اگرچہ ترکستان قبیلہ محسود اور وزیر قبائل کے مقابلے میں عدد چھوٹا ہے تاہم ضلع ٹانک سے جنوبی وزیرستان جانے والے نہایت اہم روڈ کے ارد گرد آباد ہونے کی وجہ سے اسے خصوصی سیاسی اثر ورسوخ اور اہمیت حاصل ہے۔ ترکستان بھٹانی عبداللہ محسود کے گروپ کا نائب امیر بھی ہے کیونکہ وہ تن تنہا PTTP مقابلہ نہیں کر سکتا۔

عصمت اللہ شاہین گروپ (حکومت مخالف)

جنڈولہ کے علاقے میں دوسرا اہم بھٹانی گروپ عصمت اللہ شاہین کا ہے۔ بھٹانی قبیلے کی شاخ کمی سے اس کا تعلق ہے اور وہ کمی گاؤں کا باشندہ ہے۔ ابتداء میں عصمت اسلامی شدت پسند گروپ (مولانا فضل الرحمٰن کے) حرکت المجاہدین سے وابستہ تھا لیکن بعد میں بیت اللہ محسود کی TTP میں شامل ہو گیا۔ اغوا برائے تاوان، کاریں چھیننے اور سرحد پار امریکی اور نیٹو افواج پر حملوں کی کارروائیوں میں خاصا ملوث رہا ہے۔ آج کل عصمت اللہ ترکستان بھٹانی کے شدید خلاف ہے کیونکہ اس نے اسے جولائی 2009ء میں جنڈولہ سے نکل کر محسود علاقوں میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا تھا 200 سے 250 جنگجو عصمت اللہ کی کمان میں ہیں۔

اوّل خان بھٹانی گروپ (حکومت مخالف)

بھٹانی گروہوں میں تیسرا اہم گروپ، جنڈولہ میں ہی، اوّل خان کا ہے۔ وہ سرحد پار اتحادی افواج کے خلاف کارروائیوں میں ملوث ہے۔ عصمت اللہ کی طرح، اول خان کے بھی ترکستان بھٹانی سے اچھے تعلقات نہیں۔ تاہم جنڈولہ کے دیگر TTP کے جنگجوؤں کے ساتھ اس کے اچھے رابطے ہیں

وانا کا مقامی طالبان گروپ (حکومت حامی)

اور تحریک میں مقامی طالبان (تقریباً ایک ہی عامل) وانا کے باہر کارروائیاں کیا کرتا تھا۔ اس کی وابستگی مختلف قسم کے کالعدم فرقہ پرست اور شدت پسند گروپوں مثلاً حرکت جہاد اسلامی، لشکر جھنگوی، جمعیت الانصار، جمعیت الفرقان اور یک مقامی عبدالرحمٰن کی سپاہ صحابہ سے ہے۔ ازبکوں کے خلاف وہ ملا نذیر کے اتحادی ہیں اور ان کے تحت تقریباً ہزار لوگ ہیں۔ وہ وزیر علاقوں کے ساتھ ساتھ محسود قبیلے کے زیر نگیں علاقوں سرا روغہ، مکین، لدھا، انگور اڈہ اور منظم ورسک میں رہائش پذیر ہیں۔ وہ صرف سرحد پار امریکی اور نیٹو افواج کے خلاف کارروائیاں کرتے ہیں۔ تاہم اکثر مقامی طالبان جنوبی وزیرستان سے شمالی وزیرستان منتقل ہو گئے ہیں کیونکہ پنج رنگ گروپ

کی وجہ سے ان کے لیے مقامی لوگوں میں گھل مل جانا مشکل تھا اور نئے ہونے کی وجہ سے علاقے میں ان کے اچھے رابطے نہیں ہو پائے تھے۔ وزیرستان میں صفدر نامی ایک صحافی کے مطابق ان لوگوں کا شمالی وزیرستان میں ٹھہرنا زیادہ آسان اس لیے بھی ہے کہ سوویت مخالف جہاد کے دوران شمالی وزیرستان ہی ان کا بیس تھا اور مقامی عثمان زئی اور داوڑ قبائل سے ان کے پرانے تعلقات ہیں۔

☆☆☆

جنوبی وزیرستان میں فوجی آپریشنز اور امن معاہدوں کی مختصر تاریخ (2004-08ء)

جنوبی وزیرستان میں طالبان کے مختلف جنگجو گروہوں کے خلاف 2004ء سے اب تک چار فوجی آپریشن کیے گئے ہیں۔ جن میں سے راہ نجات آپریشن اب بھی جاری ہے۔ پہلی مہم 2004ء کے موسم بہار اور موسم گرما میں، نوجوان اور کرشمہ ساز شخصیت نیک محمد اور (بشمول حاجی شریف اور مولوی الاسلام) ان کے ہمراہ ساتھیوں کے خلاف تھی۔ وانا کے مغربی علاقے میں کیے گئے اس آپریشن میں سات ہزار فوجی جوان شریک تھے۔ دو ہفتے طویل آپریشن کے دوران 16 فوجی مارے گئے۔ چھ ماہ بعد فوج نے وانا کے شمال میں دس ہزار جوانوں کے ساتھ حملہ کیا۔ جہاں 200 سے زائد چیچن اور ازبک جنگجوؤں کے علاوہ، کچھ عرب اور چند سو مقامی شدت پسند موجود تھے۔ بھاری جانی نقصان کی وجہ سے، پاکستانی حکومت نے مقامی جنگجوؤں کے ساتھ کئی امن معاہدے کیے پہلا معاہدہ شکئی معاہدے کے نام سے موسوم ہوا۔ جس پر نیک محمد، اس کے اتحادیوں نے ایک طرف اور جنوبی وزیرستان میں پاکستانی فوجی کمانڈر جنرل صفدر حسین نے دوسری جانب سے دستخط کیے۔ یہ معاہدہ شکئی کے ایک مدرسے میں ہوا تھا۔ فوج نے نیک محمد کے علاقے سے فوج ہٹانے اور جنگجوؤں کے نقصانات کے ازالے سے اتفاق کیا جبکہ نیک محمد نے ہتھیار ڈالنے اور تمام غیر ملکیوں کو "رجسٹر" کرانے کا وعدہ کیا۔ امن معاہدہ زیادہ عرصہ نہیں چل سکا۔ نیک محمد نے (جلد ہی) معاہدے کی خلاف ورزی کی جون 2004ء میں نیک محمد (وانا کے قریب) ایک امریکی ڈرون حملے میں مارا گیا۔

دوسرا فوجی آپریشن 2005ء کے شروع میں کیا گیا محسود قبیلے کے زیر کنٹرول علاقے میں یہ آپریشن بیت اللہ محسود، اور عبداللہ محسود کے چار ہزار جنگجوؤں کے خلاف ہوا تھا۔ پچھلی فوجی مہم کی طرح، اس میں بھی فوج کو خاصا جانی نقصان ہوا اور بالآخر شدت پسندوں کے ساتھ مصالحت کر لی گئی۔ اس معاہدے میں سراروگا میں بیت اللہ محسود، تین قبائلی عمائدین اور پاکستانی حکومت

کے کمانڈروں نے دستخط کیے۔ سراج الدین حقانی نے مبینہ طور پر اس معاہدے کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ بیت اللہ محسود نے وعدہ کیا کہ وہ غیر ملکی جنگجوؤں کو پناہ نہیں دے گا۔ علاقے میں فوج پر حملہ نہیں کرے گا اور حکومتی تنصیبات کو نشانہ نہیں بنائے گا جبکہ فوج دوبارہ اپنے دستے علاقے سے باہر نکالنے اور ان کے نقصانات کے ازالے کے لیے تیار ہو گی۔ امن معاہدہ زیادہ دیر نہیں چلا۔ بیت اللہ نے پاکستانی انتظامیہ کو نشانہ بنانے کے لیے خودکش بمبار بھیجنا شروع کر دیے جو اس کی موت اگست 2009ء تک جاری رہے۔ تاہم امن معاہدے سے ان کے حوصلے بڑھا دیے اور حقیقتاً وہ جنوبی وزیرستان پر حکمرانی کرنے لگے۔ ہزاروں مقامی جنگجوؤں نے اس کی تحریک میں شمولیت اختیار کر لی اور علاقے سے پاکستانی حکومت کی رٹ کا خاتمہ ہو گیا۔

جنوبی وزیرستان میں تیسرا بڑا آپریشن جنوری 2008ء میں کیا گیا تا کہ بیت اللہ محسود کے ساتھیوں کا صفایا کیا جا سکے۔ اور اہم طالبان لیڈروں بشمول بیت اللہ محسود اور خودکش حملوں کے منتظم قاری حسین کو گرفتار یا ختم کیا جا سکے۔ اس تصادم کے دوران ہزاروں مقامی افراد بے گھر ہو گئے چھ ہفتے کی شدید لڑائی کے بعد، گزشتہ معاہدوں کی شرائط سے ملتی جلتی شرائط پر امن معاہدے کی بات ہونے لگی جس میں پاک فوج نے علاقہ خالی کرنا شروع کر دیا۔ ایک پاکستانی کمانڈر نے تبصرہ کیا۔ ہم باہر نکل رہے ہیں صرف چیک پوسٹیں چل رہی ہیں۔ امن معاہدے (2008ء کے موسم بہار) میں بیت اللہ محسود کی نقل و حرکت پر لگائی گئی پابندی کا بیت اللہ نے اسی طرح مذاق اڑایا کہ اس نے جون میں اپنی مشہور پریس کانفرنس کرائی جس میں اس نے جنوبی وزیرستان کے تمام مقامی صحافیوں کو دعوت دی اس بار بھی حکومت اور شدت پسندوں کے درمیان سراج الدین حقانی نے مذاکرات کا ڈول ڈالنے میں اہم کردار ادا کیا۔ رپورٹ کے مطابق وہ فریقین کا تصادم ختم کرانے کے لیے گیارہ گاڑیوں پر مشتمل قافلے کے جلو میں وہاں آیا تھا۔ امن معاہدہ جلد ہی ٹوٹ گیا۔ خودکش حملوں کی مہم پہلی طرح چلتی رہی۔ قاری حسین نے سپین کئی رغزئی میں خودکش بمباروں کا ایک نیا تربیتی کیمپ قائم کر لیا اور بیت اللہ محسود بدستور پاکستانی فوجوں کو ٹارگٹ بناتا رہا۔ اگست 2007ء اور جنوری 2008ء میں پاکستانی طالبان نے جنوبی وزیرستان کے دو فوجی ٹھکانوں پر حملہ کر کے اپنی طاقت کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ پہلے حملے میں انہوں نے سو فوجیوں کو یرغمال بنا لیا اور دوسرے حملے میں محسود جنگجوؤں نے سرروغہ کے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ شدت پسندوں سے براہ راست مذاکرات نے نہ صرف انتہا پسندوں کو قانونی جواز فراہم کر دیا بلکہ قبائل کو بھی شدید خطرات سے دوچار کر دیا۔ پاکستانی تجزیہ نگار شجاع نواز کے مطابق پاک فوج نے مرتکز اور پر بہت زیادہ بھروسہ کیا جو جارحانہ پٹرولنگ یا مسلح اور تربیت یافتہ شدت پسندوں سے

لڑنے کی اہلیت نہیں تھی۔ ان کے خیال میں، کارروائی کے سارے طریقہ میں تبدیلی درکار ہے۔

آپریشن راہِ نجات۔ اکتوبر 2009ء سے تاحال

مہینوں کی محنت کے بعد 17 اکتوبر 2009ء کو تیس ہزار جوانوں پر مشتمل فوج جنوبی وزیرستان بھیجی گئی تا کہ وہ دس ہزار طالبان جنگجوؤں کا صفایا کر سکے۔ کئی ہفتے گزر جانے کے بعد دونوں جانب سے ابتدائی کامیابیوں کے دعوے کیے گئے۔ محاذِ جنگ سے آنے والی اطلاعات کی تصدیق کرنا ناممکن تھا۔ کیونکہ فوج نے صحافیوں اور ان کے معاونوں کو اس علاقے میں داخلے سے روک دیا تھا۔ لاکھوں افراد آپریشن سے پہلے ہی اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے تھے جنگ کے پہلے دو ہفتوں میں طالبان نے شدید مزاحمت کی لیکن بہت سے جنگجو ادھر ادھر کے علاقوں مثلاً اورکزئی اور شمالی وزیرستان کی جانب غائب ہو گئے۔ انہوں نے گوریلا کارروائیاں بھی کیں۔ مثلاً رات کے وقت پاکستانی چیک پوسٹوں پر حملے کیے یا راستوں میں بارودی سرنگیں بچھا دیں۔

پاکستانی فوج کو لگتا ہے، کہ اس مہم میں شدت پسند تحریک کو شکست سے دوچار کر دے گی۔ نومبر 2009ء کی ابتدا میں حملے کے تین ہفتے کے بعد حکیم اللہ محسود نے کہا تھا۔ ہم دوزخ میں جائیں گے یہ الفاظ اس بات کا اشارہ ہیں کہ (پاکستانی طالبان کے دشمن) سب کچھ ٹھیک نہیں ہے عبداللہ محسود اور ترکستان بھٹانی، دونوں TTP مخالف گروپ جنوبی وزیرستان میں پاکستانی فوج کے ہمراہ مقابلے پر آ گئے۔ حکومت کو اس کا حقیقی فائدہ ہو گا کیونکہ قبائلی اپنے علاقے اور اس کے پیچ در پیچ راستوں سے بخوبی واقف ہیں۔ ان دونوں گروپوں نے تا حال اور ابھی تک کسی حال میں امن قائم رکھنے کی بھی خاصی کوششیں کی ہیں کیونکہ TTP جنگجو وزیرستان کی پہاڑیوں میں جا چھپے ہیں مزید یہاں، جنوبی وزیرستان سے نکلے ہوئے ہزاروں مہاجرین TTP کے خلاف ہو گئے ہیں اور وہ اسے موجودہ جنگ کا ذمہ دار قرار دے رہے ہیں۔

پاکستانی طالبان مخالف قبائلی ملیشیا یا لشکر کی تشکیل روز بروز مقبول ہوتی جا رہی ہے جسے پاکستانی حکومت کی مکمل حمایت حاصل ہے۔ اس نے محسود قبائل کے عمائدین پر مسلح طور پر ایک ملیشیا بنانے کے لیے دباؤ ڈالا ہے اور انہیں مکمل تحفظ اور مالی معاونت کی یقین دہانی کرائی ہے۔ ساتھ ہی انہیں بتایا گیا ہے کہ حمایت نہ کرنے کی صورت میں انہیں دی گئی تمام مراعات ختم کر دی جائیں گی۔

جنوبی وزیرستان میں معروف برطانیہ مخالف شخصیت مرحوم فضل دین محسود کا بیٹا شاہین خان ایسے کسی وزیرستانی قبائلی لشکر کا ممکنہ سربراہ ہو سکتا ہے تاہم اسے کمیونٹی کی مکمل حمایت حاصل نہیں کیونکہ

مقامی عمائدین حکومت پر اعتبار کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اگر حکومت سے قبائل نے ایک اور امن معاہدہ کر لیا (جس کی توقع بھی ہے) اور شدت پسند اپنے مضبوط گڑھ وزیرستان لوٹ آئے تو لشکر کے جنگ جوؤں کو طالبان کی جانب سے شدید انتقامی صورتحال کا سامنا ہوگا۔

جس طرح آپریشن راہ نجات نے TTP کو شمالی وزیرستان میں پناہ لینے پر مجبور کیا ہے، ویسے ہی جنگ جوؤں نے پوری ایجنسی میں اپنے ٹھکانے بنا لیے ہیں جن میں سپین گاؤں، میران شاہ، میر علی، رزمک اور دتہ خیل شامل ہیں۔ محسود طالبان شدت پسند جنوبی وزیرستان میں فوجی چیک پوسٹوں اور فوجی کیمپوں پر حملے کرنے کے لیے انہی ٹھکانوں سے متحرک ہوتے ہیں۔ TTP کے رہنما حکیم اللہ (گروہ امریکی ڈرون حملے سے بچ گیا ہے تو)، ولی الرحمن، قاری حسین اور اعظم طارق آج کل حافظ گل بہادر کی پناہ میں اپنے اہل خانہ سمیت شمالی وزیرستان میں مقیم ہیں

لدھا میں طالبان کے امیر شاہین محسود کے نائب سراج محسود کے مطابق، پاکستانی فوج کے خلاف گوریلا کارروائیوں کے لیے، وزیر اور داوڑ قبائل کے لوگ 30 سے 50 کی ٹولیوں میں یہاں آتے ہیں۔ دس بارہ دن ٹھہرتے ہیں اور پھر شمالی وزیرستان چلے جاتے ہیں، جہاں سے مزید نئے لوگوں کا گروہ اسی طرح کی کارروائیوں کے لیے بھیج دیا جاتا ہے اور یوں یہ چکر چلتا رہتا ہے۔

جنوبی وزیرستان میں امریکی ڈرون حملے

2008ء کے موسم گرما میں (شمال مغربی پاکستان میں) شروع ہونے والا امریکی ڈرون حملوں کا یہ پروگرام ڈرامائی رفتار سے آگے بڑھا ہے۔ 2008ء میں 38 ڈرون حملے ہوئے جبکہ 2009ء میں ان کی تعداد 93 تھی۔ ان حملوں میں القاعدہ، درجنوں جنگ جوؤں، اور تحریک طالبان پاکستان کے اہم رہنما بیت اللہ محسود (اگست 2009ء میں) مارے گئے۔ انہی حملوں کے نتیجے میں طالبان کمانڈروں اور ان کے ساتھیوں نے "نئی" پرسنل سیکیورٹی میں خاطر خواہ اقدامات کیے ہیں۔ وہ کھلی جگہوں پر اکٹھے ہونے اور دن کے دوران گاڑیوں کے ذریعے سفر کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ فون کا استعمال بہت کم کر دیا ہے۔ ناقابل اعتبار پیغام رسانوں کے ذریعے پیغامات بھیجے جاتے ہیں۔ طالبان لیڈر اپنی آمدورفت کو بہت خفیہ رکھتے ہیں یہاں تک کہ اپنے ساتھیوں کو بھی لاعلم رکھتے ہیں حالانکہ حملوں سے بچنے کے لیے اکثر اوقات انہیں اپنی جگہیں بدلنا پڑتی ہیں۔

جنوبی وزیرستان میں اہم قبائل کا ایک طائرانہ جائزہ

فاٹا کی دوسری قبائلی ایجنسیوں کی طرح، جنوبی وزیرستان بھی مختلف النوع قبائل کا گھر ہے۔ ان میں اہم ترین محسود، احمدزئی وزیر، بھٹانی، برکی، سلیمان خیل اور دوتانی ہیں۔

تاریخی اہمیت اور آبادی کے لحاظ سے محسود سب سے بڑا قبیلہ احمد زئی اور بھٹانی قبائل اس کے بعد آتے ہیں۔ وانا کے قبائل معاشرے میں عمائدین اجتماعی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ تاہم 1979ء میں افغانستان پر سوویت حملے اور علاقے میں مذہبی گروہوں کی اسلامی حیاء کے تصور کی بناء پر ان عمائدین کا کردار کم ہو گیا ہے۔ حالیہ سالوں میں طالبان کمانڈروں نے پورے علاقوں اور قبائل میں ان عمائدین کی جگہ لینا شروع کر دی ہے۔ تاہم ان کے کردار کی اہمیت اب بھی باقی ہے اور ان کا روایتی کردار مکمل طور پر ختم نہیں کیا جا سکتا۔

نیچے دیئے گئے چارٹ میں (جنوبی وزیرستان کے) اہم انتظامی مرکز یا تحصیلوں کے نام اور ان میں مقیم قبائلی شاخوں کی تفصیل دی گئی ہے۔

(1)	لدھا تحصیل	شاماں خیل، لاغر خیل، گری، شاگی، منگل خیل، شیری، سید، شوبی خیل، زرمر بھک، بابا خیل، بودن زئی، سلاموں، گگی شانی، ملک دینائی۔
(2)	مکین تحصیل	عبدالائی، امر خیل، ملک شی، شاگی، شوبی خیل، جند خیل، مدر خیل۔
(3)	سراروغہ تحصیل	شاماں خیل، گگی شان، شیری، لاغر خیل، بیت خیل، جلال خیل، شوبی خیل، گوائی خیل، عبدالائی، شاگی، ملک شی، فریدی، گکاری، برائے خیل، کئی خیل۔
(4)	تیارزہ تحصیل	بچی خیل، بکوان خیل، عبدالرحمن خیل، برائے خیل، لاغر خیل، داعد خیل
(5)	شوال تحصیل	جلال خیل، شوبی خیل، بیت خیل، عبدالائی۔
(6)	سروکئی تحصیل	جلاس خیل، بچی خیل، عبدالرحمن خیل، بکوان خیل، فریدی، گکاری
(7)	وانا (احمد زئی وزیر)	زلی خیل، یار گل خیل، ککا خیل، توجی خیل، گوجل خیل، سرکی خیل، گنگی خیل، زوزی خیل، مغل خیل۔

محسود قبیلہ

یہ قبیلہ جنوبی وزیرستان کے وسطی علاقے میں رہتا ہے اور اس کی زیادہ تر آبادی مکین، لدھا، سراروغہ، سپن کئی، راغزئی اور کوٹ کئی میں ہے۔ محسود قبیلے کی تین اہم شاخیں وزی ماسد ہے (جس کی ایک شاخ علی زئی ہے۔ اس کی مزید تقسیم میں شوبی خیل اور ملازئی ہیں) بہلول زئی، اس میں شابنگی زئی شامل ہیں اور تیسرا شاماں خیل ہے۔ مان زئی تعداد میں سب سے زیادہ ہیں۔ بہلول زئی اور شاماں خیل عددی طور پر اس سے کم ہیں۔ محسود قبائل کی تعداد جنوبی وزیرستان میں (اندازاً) ساڑھے چھ سے سات لاکھ تک ہے۔

تحریک طالبان پاکستان کی لیڈرشپ کی کثرت کا تعلق اسی قبیلے سے ہے۔ بیت اللہ محسود کا تعلق شوبی خیل شاخ سے تھا اسی طرح حکیم اللہ اور قاری حسین بہلول زئی شاخ کے اشنگی حصے سے تعلق رکھتے ہیں۔ تحریک میں سرگرم، قبیلے کی دوسری شاخوں میں عبدالائی، کیا خیل، لانگر خیل اور سیت خیل شامل ہیں۔

وانا کے احمد زئی وزیر قبیلہ

احمد زئی وزیر محسودوں کے کزن ہیں اور جنوبی وزیرستان مغربی اور جنوبی حصوں میں آباد ہیں۔ محسودوں کی نسبت ان کی تعداد زیادہ نہیں۔ یہ تقریباً ڈیڑھ سے دو لاکھ لوگ ہیں جن کا علاقے کا انتظامی مرکز وانا ان کے کنٹرول میں ہے۔ احمد زئی وزیر قبیلے کی دو شاخیں ہیں۔ زلی خیل جن میں سب سے بڑا ہے 2003ء سے 2007ء تک پاکستانی طالبان کی سربراہی یارگل خیل کے لوگوں کے ہاتھوں میں تھی۔ (یہ زلی خیل کی سب سے بڑی شاخ ہے) احمد زئی وزیر کا سپریم کمانڈر ملا نذیر کاکا خیل سے تعلق رکھتا ہے (کاکا خیل زلی خیل کی سب سے چھوٹی شاخ ہے) ملک حسان اور ملنگ وزیر قبیلے کے اہم کمانڈروں میں سے ہیں۔

جندولہ کا بھٹنی قبیلہ

یہ جنوبی وزیرستان کا تیسرا بڑا قبیلہ ہے اور یہ ایجنسی کے مغربی علاقے میں آباد ہیں ٹانک اور ڈیرہ اسماعیل خان کے بارڈر کے ساتھ ساتھ۔ گرچہ ان کی تعداد 70 سے 80 ہزار تک ہے تاہم سرحد سے جنوبی وزیرستان میں داخلے کا راستہ ان کے زیر تسلط ہے۔ محسود اور وزیر قبائل ایجنسی سے باہر جانے اور آنے کے لیے یہی راستہ استعمال کرتے ہیں۔ عصمت اللہ شاہین، ترکستان بھٹانی اور شیر رحمان بھٹانی قبیلے کے کمانڈر ہیں۔

کانی گروم کا ارمڑ برکی قبیلہ

یہ سات سے دس ہزار افراد پر مشتمل چھوٹا سا قبیلہ ایک تاریخی قصبے کانی گرم کا باسی ہے۔ کانی گرم سرحد کے قریب نیچے کی طرف واقع ہے اور چاروں طرف سے محسود قبیلے سے گھرا ہوا ہے۔ اورمڑ برکی قبیلے کے لوگ اپنی زبان "ارمڑ" بولتے ہیں۔

دوتانی قبیلہ

دس ہزار افراد کا یہ قبیلہ جنوبی وزیرستان کی جنوبی سرحد کے قریب (بلوچستان کی ژوب ضلع کی بالائی جانب) رہتا ہے۔

مقامی آبادی کی مشکلات و مسائل۔ طالبان کا عروج و زوال

2003ء سے پہلے جنوبی وزیرستان کے باشندوں میں نااہل اور مبینہ طور پر کرپٹ مقامی انتظامیہ کی وجہ سے بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ روزگار کے مواقع، آمدورفت کی سہولتیں، سڑکیں، سکول اور ہسپتال مقامی آبادی کے لیے نہ ہونے کے برابر تھے۔ پولیٹیکل ایجنٹ اور قبائلی لیڈر، ملکین اور عمائدین سروکاروں، سروانی اور دوسرے علاقوں میں قائم اسکولوں اور ہسپتالوں کو اپنے دوستوں کے لیے، ان گیسٹ ہاؤس کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ قبائلی عمائدین اور ان کے خاندان کے افراد کو سکولوں، اساتذہ اور ہسپتالوں کے سٹاف کی تنخواہیں بطور تحفہ یا رشوت دے دی جاتی تھیں۔ اساتذہ کو بیٹھے فرائض کی انجام دہی کے بغیر تنخواہیں ملتی تھیں۔ اسپتالوں میں سٹاف ہی نہیں ہوتا تھا۔ ڈاکٹرز اور ایڈمنسٹریٹرز ایمبولینس کو ذاتی استعمال میں رکھتے تھے۔ رشوت اور کرپشن ہر جگہ دیکھی جا سکتی تھی۔

بے چینی اور پریشانی کے اس ماحول میں، طالبان نے 2003ء میں پورے جنوبی وزیرستان پر قبضہ جما لیا۔ مقامی قبائلیوں کا خیال تھا کہ طالبان اساتذہ اور ڈاکٹرز کو اپنے فرائض انجام دینے پر مجبور کریں گے اور مقامی سیاسی سسٹم میں کرپشن کو ختم نہیں تو کم ضرور کر دیں گے۔ پہلے سال ہی کے لگ بھگ، طالبان نے چوروں، منشیات کی فراہمی پر خاص دباؤ ڈالا۔ انصاف کی فوری فراہمی کے لیے لوگوں کو مارا گیا یا انھیں علاقے سے نکال دیا گیا۔ اس سے دوسروں کو عبرت ہوئی کہ اگر وہ پکڑے گئے تو انھیں خوفناک نتائج یقینی موت کا سامنا کرنا ہوگا۔ ساتھ ہی طالبان نے جہاد کے لیے ٹیکس بھی نافذ کر دیا تا کہ اتحادی افواج اور پاکستانی فوج کے خلاف جنگ کے لیے فنڈز فراہم کیے جا سکیں۔ جنوبی وزیرستان کے کئی الحقیدہ، جہاد پرست مسلمان مغربی افواج کے خلاف جہاد کے سادہ سے نظریے سے خاصے متاثر ہوئے تاہم پاکستانی طالبان کے گروہوں نے ایک زبردست تزویراتی غلطی کی۔ انہوں نے ایجنسی کے اندر قبائلی ڈھانچے پر ہی حملہ کرنا شروع کر دیا۔ قبائلی ڈھانچے نسلوں سے اس سماج کی بنیاد بنے ہوئے تھے۔ شدت پسندوں نے 200 سے زائد قبائلی سرداروں اور عمائدین کو چپ سادھ لینے یا علاقے سے باہر جانے پر مجبور کر دیا یا قتل کر ڈالا۔ یہ عمائدین حکومت اور قبیلوں کے درمیان پل کا کام دیتے تھے۔

طالبان کو خوف تھا کہ شدت پسندوں اور حکومت کے مابین تصادم کی صورت میں قبائلی عمائدین طالبان مخالف لشکر تشکیل دے سکتے ہیں۔ وہ مقامی لوگوں کو طالبان کے خلاف جمع کر سکتے ہیں۔ چنانچہ 2000ء کے دورانیے میں جب طالبان نے علاقے میں اپنی طاقت مجتمع کی تو درحقیقت اپنی غیر مقبولیت کی بنیاد خود ہی رکھ دی۔

جوں جوں جنوبی وزیرستان میں طالبان طاقت ور ہوتے گئے، ان کے مقامی کمانڈروں

قبائلیوں کے ساتھ رویہ انتہائی ظالمانہ ہوتا گیا۔ وہ جرائم کے مرتکب طالبان کو سزا دینے سے گریز کرتے اور دوسروں کے خلاف فوراً ہی بد سلوکی پر اتر آتے۔ پھر انہوں نے محسود چوروں کو بھی تحریک میں شامل کر لیا۔ طالبان پر رشوت لینے اور مقامی حکام کو رشوت دینے کے الزامات بھی لگے۔ مزید براں تحریک کی ہی وجہ سے فوجی آپریشن کا آغاز ہوا جس کی وجہ سے ہزاروں محسود قبائلیوں کو اپنا گھر بار چھوڑنا پڑا جس سے عام آبادی طالبان کے خلاف ہو گئی اور آخر میں تحریک طالبان پاکستان کے بھیجے ہوئے خودکش حملہ آوروں کی وجہ سے کثیر معصوم شہریوں کی ہلاکتیں ہوئیں جس کی وجہ سے جنوبی وزیرستان کے لوگوں میں طالبان سے بیزاری مزید بڑھ گئی۔

منصور خان محسود اسلام آباد میں قائم تھنک ٹینک فاٹا ریسرچ سنٹر میں ریسرچ کوآرڈینیٹر ہیں وہ کئی این جی اوز کے لئے کام کرتے رہے ہیں۔

وادی سوات میں شدت پسندی اور تصادم

رزو خان خٹک۔ اپریل 2010ء

سوات ملاکنڈ ڈویژن کے سات اضلاع میں سے ایک ہے۔ ہندوکش کے سیاحوں کے لیے بھی یہ منزل انتہائی پرکشش تھی۔ یہ پشاور کے شمال مشرق میں 170 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اگرچہ اپنے خوبصورت مناظر کی وجہ سے سوات کو ایشیا کا سوئٹزرلینڈ کہا جاتا تھا تاہم 2000ء کے ابتدائی سالوں میں طالبان کے ظہور اور بعد ازاں پاکستان کے فوجی آپریشنز کی وجہ سے یہ نام دنیا میں اور بھی پہچانا جانے لگا۔ طالبان نے سوات کے پرامن علاقے میں تباہی مچا دی۔ طالبان مخالف سینکڑوں لوگوں کو گولیوں کا نشانہ بنا دیا گیا، ان کے سر قلم کیے گئے، اغوا کر لیا گیا یا انہیں علاقے سے باہر نکال دیا گیا۔ بدامنی اور خون ریزی کی انتہا ہو گئی۔ پاکستان میں ہر جگہ اس کا شدید ردعمل ہوا اور حکومت اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے انتہائی اقدام پر مجبور ہو گئی۔ چنانچہ اپریل 2009ء میں آپریشن راہ نجات شروع کیا گیا۔ اس حملے میں سوات میں موجود شدت پسند طالبان کا صفایا کر دیا گیا۔ اس جنگ میں جو طالبان اور ان کے کمانڈر مارے گئے تاہم پچیس لاکھ لوگوں کو اس آپریشن کے دوران بے گھر ہونا پڑا۔ آپریشن کے دوران بہت سے معصوم شہری بھی جنگ کا ایندھن بنے۔ فوج کی ہوائی جہازوں سے بمباری اور زمینی شیلنگ کے ذریعے لاتعداد گھر تباہ ہو گئے۔ آپریشن کے اختتام پر وسط جولائی میں لوگ اپنے گھروں کو واپس ہو گئے طالبان کا خاتمہ ہو گیا ہے تاہم اکا دکا واقعات اب بھی ہوتے رہتے ہیں۔

سوات میں بغاوت کا ڈھانچہ

ملاکنڈ اور سوات میں شدت پسندی کی جڑیں اس وقت سے ہیں جب سوات والی سوات کے تحت آزاد ریاست ہوتا تھا۔ 1969ء میں اسے پاکستان میں شامل کر دیا گیا۔ 1949ء میں والی سوات میاں گل عبدالودود نے اپنے بیٹے میاں گل جہانزیب کے حق میں دستبردار ہو گیا۔ نئے والی گل جہانزیب کا دور وادی کی تاریخ کا سنہری دور کہا جاتا ہے۔ سکول، ہسپتال، سڑکیں اور ذرائع مواصلات سب کچھ اسی دور میں تعمیر ہوا۔ پوری وادی اس کا گہوارہ تھی۔ انصاف کے اہم

معاملات کا فیصلہ اپنے درمیان اور قبائلی کونسل یا جرگے کی مدد سے، والی، چند دنوں کے اندر، حل کرتا تھا۔ تاہم 1969ء میں ریاست کے پاکستان میں ادغام کے بعد، وادی میں مزید ترقی نہیں ہوئی۔ چند ایک سکول بنائے گئے اور عدالتی نظام ایسا کہ دیوانی یا فوجداری، دونوں ہی مقدمات سالوں تک لٹکے رہنے لگے۔ اس صورت حال نے لوگوں میں بے چینی پیدا کرنی شروع کر دی۔ وادی سوات، افغان سرحد کے قریب ہونے کے باوجود 1980ء کے عشرے کی سوویت افغان جنگ سے زیادہ متاثر نہیں ہوئی۔ البتہ جب طالبان افغانستان میں برسر اقتدار آئے تو مذہبی شدت پسندوں کو روس کے خلاف جنگ آزادی کے ہیرو کی حیثیت میں ایک عمومی حمایت ضرور ملی۔ یہ تصور دوران جنگ پاکستانی میڈیا نے پیدا کیا۔ جس نے اس جدوجہد کو جہاد کا اور لڑنے والوں کو مجاہدین کا نام دیا۔ بہت سے جہادی لیڈر، بسوں، ٹرکوں اور پک اپ میں، اپنے گن مینوں کے ہمراہ سوات کے گلی کوچوں میں آزادی سے گھومتے پھرتے، روس کے خلاف اپنے کارنامے بیان کرتے۔ سوات میں، افغان طالبان کی حمایت کے اس تصور نے جزوی طور پر صوفی محمد کے عروج میں اہم رول ادا کیا۔

صوفی محمد

وادی سوات میں بدامنی کی علامت مذہبی رہنما صوفی محمد کے ابھرتے ہوئے طاقت ور تشخص کے ساتھ ہی ظاہر ہونے لگی تھیں۔ وہ ضلع لوئر دیر کے علاقے میدان میں جماعت اسلامی کے ایک مقامی لیڈر تھے۔ تحریک نفاذ شریعت محمدی کی ابتدائی تشکیل بھی انہوں نے یہیں کی۔ ان کا تعلق لوئر دیر کے علاقے تیمرگرہ سے ہے جہاں انہوں نے مذہبی تعلیم حاصل کی۔ 1985ء میں وہ جماعت اسلامی کے رکن کے طور پر، گاؤں کی مقامی کونسل کے ممبر منتخب ہوئے۔ 1980ء کے عشرے میں وہ جماعت کے خاصے سرگرم کارکن تھے تاہم کچھ عرصے بعد جماعت سے مایوس ہو گئے اور میدان واپس آ کر ایک مسجد میں امام ہو گئے اور کسی مدرسے میں پڑھانے لگے۔ تبھی سے انہوں نے نفاذ شریعت کے لیے ایجی ٹیشن شروع کر دیا۔ صوفی محمد خوش طبع انسان ہیں، دوران میں کوئی خاص کرشماتی خصوصیت نہیں۔ ان کی گفتگو میں سلاست اور روانی ہے، اور وہ دوسرے ملاؤں کی طرح فصیح بیانات نہیں دیتے۔

1990ء کی دہائی کے شروع میں، صوفی محمد نے وادی میں محدود پیمانے پر، ایک نسبتاً پر امن مہم، نفاذ شریعت کے لیے شروع کی لیکن آہستہ آہستہ تحریک میں شدت پسندی کا رنگ آتا گیا۔ مالاکنڈ میں آہستہ رو عدالتی نظام اور مقامی حکام کی کرپشن سے صوفی محمد کے ساتھیوں کو ہوئی

طرح اجڑ کا دیا۔ انھوں نے یہ نعرہ لگانا شروع کر دیا: "شریعت یا شہادت"

1994ء میں صوفی محمد کے کالی پگڑی والے ساتھیوں نے اپنے مطالبات کے سلسلے میں حکومتی بے حسی کے خلاف روڈ بلاک کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ سڑکیں بلاک کرنے کا وہی طریقہ جو جماعت اسلامی کے قاضی حسین احمد نے بھی اپنے مطالبات کے حق میں استعمال کیا۔ تاہم صوفی محمد نے 1984ء میں تحریک نفاذ شریعت (TNSM) کے قیام کے ساتھ ہی جماعت اسلامی سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ روڈ بلاک ہونے سے شدت پسندوں اور سیکورٹی اداروں کے درمیان تصادم ہوا اور اس طرح 16 مئی 1994ء کو ضلع بونیر میں کئی افراد کا مارا جانا، مالاکنڈ میں شریعت کے حامیوں کی طرف سے لاقانونیت اور بدامنی کی پہلی مثال تھا۔

اس دوران صوفی محمد کے حامیوں اور حکومتی حفاظتی اداروں کے درمیان بار بار تصادم ہوا اور اس میں طرفین کے لوگ بھی مارے گئے۔ نومبر 1994ء میں یہ بغاوت ختم ہوئی۔ طرفین سے ایک معاہدہ ہوا جس کے مطابق حکومت نے (مالاکنڈ میں) نظام عدل ریگولیشن کے نفاذ کا وعدہ کیا۔ اس معاہدے کو حکومت کی طرف سے ایک زبردست رعایت اور صوفی محمد کے حامیوں کی فتح سمجھا گیا تاہم اس کے بعد مسلح بغاوت ختم ہو گئی۔ 1990ء کی دہائی کے آخر میں سوات اور مالاکنڈ میں صوفی محمد کی مقبولیت ختم ہو کر رہ گئی کیونکہ بغاوت کے دوران بہت سے لوگ جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ خود صوفی محمد کو بھاگ کر جان بچانا پڑی اور بعد میں وہ حکومت کے ساتھ مذاکرات میں شریک ہو گئے۔ ان کے حامیوں نے سوال اٹھایا کہ پہلے انہوں نے تصادم کی کیفیت پیدا کر دی اور بعد میں خود روپوش ہو گئے۔ صوفی محمد نے اپنا امیج بحال کرنے کے لیے بہت محنت کی۔ افغانستان میں قائم طالبان حکومت کو سوات کے مختون باشندوں میں مقبول بنانے کی کوشش بھی کی۔ ان دنوں پاکستان کا واحد سرکاری ٹی وی بھی افغانستان میں طالبان کی کامیابیوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا کرتا تھا۔ گیارہ ستمبر 2001ء کو امریکہ میں دہشت انگیز حملوں نے صوفی محمد کو ایک بار پھر طاقت کا مظہر بنا دیا۔ اور وہ سوات (دیر، بونیر، شانگلہ، باجوڑ اور مہمند کے قبائلی علاقوں) سے دس ہزار رضاکاروں کا لشکر لے کر امریکی فوجوں سے جنگ کرنے افغانستان کی طرف نکل پڑے۔

تاہم سوات اور دیر کے شہری اپنے قریبی رشتہ داروں کو اس طرح افغانستان لے جانے پر صوفی محمد سے خوش نہیں تھے۔ انہوں نے ان کی موت اور گمشدگی کا صوفی محمد کو ذمہ دار ٹھہرایا۔ حکومت نے غیر قانونی طور پر سرحد پار کرنے اور امریکی فوج سے لڑنے کے جرم میں صوفی محمد کو سات سال کے لیے ڈی آئی خان کی جیل میں قید کر کے اس کی بہت بڑی مدد کی۔ اس دوران

لوگوں کا غم وغصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ ان دنوں تحریک نفاذ شریعت پر پابندی لگا دی گئی تھی۔

مولانا فضل اللہ

2001ء میں صوفی محمد کی گرفتاری سے وادی سوات کے شدت پسندوں کے لیے خلا پیدا ہو گیا۔ صوفی محمد کے داماد فضل حیات سے جو افغان جنگ میں اور وہاں سے واپسی پر سترہ ماہ تک جیل میں بھی ان کے ساتھ رہا تھا، خود کو آگے بڑھایا اور سوات کے ایک چھوٹے قصبے امام ڈھیری کی ایک چھوٹی سی مسجد میں جسے اسلامی رنگ دینے کے لیے اس کا نام "امام ڈھیری" رکھ دیا اور تبلیغ کرنے لگا تاہم خود کو زیادہ اسلامی ظاہر کرنے کے لیے اس نے اپنا نام بدل کر فضل اللہ رکھ لیا۔ کبھی وہ قصبہ کالام کے ایک Resort میں کام کیا کرتا تھا اور برملا کہتا تھا کہ وہ کوئی عالم نہیں ہے تاہم اس نے سوات میں نفاذ شریعت کی وکالت جاری رکھی۔

ہفتہ وار فضل اللہ امام ڈھیری کی مسجد میں بچوں کو قرآن پڑھایا کرتا تھا۔ 2004ء میں جب اس نے اپنی غیر قانونی FM چینل پر وعظ کرنا شروع کیا تو اس کے لہجے میں نرمی کے بجائے سختی اور درشتی آ گئی۔ لوگوں نے جانی اور مالی، ہر طرح کی امداد دینا شروع کر دی۔ اس کا نام ہی "مولانا ریڈیو" پڑ گیا۔ فضل اللہ نے اپنی پبلک ریڈیائی تقریروں میں عام سی باتیں کی تھیں مگر جلد ہی اسے قدامت پرست پختونوں اور جیل میں قید صوفی محمد کے حامیوں کی پرجوش حمایت ملنی شروع ہو گئی۔ دبئی اور سعودی عرب میں ملازم افراد بھی اس کے حامی ہو گئے، جن کے گھر سے مقامی علاقوں میں اس کے پیغامات پہنچنے لگے۔ فضل اللہ کا اثر اتنا بڑھا کہ عورتوں نے اپنے ہاتھ سے چوڑیاں اور گلے کے ہار تک اتار کر اسے چندے میں دے ڈالے۔

وہ اپنے وعظ میں لوگوں کو پانچ وقت نماز پڑھنے اور گناہوں سے بچنے کا حکم کرتا۔ اس نے امریکہ کے خلاف بھی تبلیغ شروع کی اور افغان طالبان کے خلاف امریکی مداخلت اور افغانستان پر فوجی حملے پر لوگوں کی خصوصی توجہ دلائی۔

جونہی اس کے سامعین کی تعداد بڑھی، اس نے والدین کو بچیوں کو سکول بھیجنے ٹی وی دیکھنے اور موسیقی سننے سے منع کرنا شروع کر دیا۔ وہ ان زمینداروں پر کڑی تنقید کرتا جو اس کے مدرسے کو چندہ دینے سے انکار کرتے تھے۔ مقامی ذرائع کے مطابق پاکستانی تجزیہ نگار امتیاز علی کا خیال ہے "تحریک نفاذ شریعت اور اس کے تحت مذہبی تصورات کے سائے میں ایک پوری نسل پل کر جوان ہوئی ہے جس سے فضل اللہ کو لڑاکوں کا ایک بنا بنایا گروہ دستیاب ہو گیا"۔ 2007ء میں جب فضل اللہ نے ٹی وی پر تنقید کی تو جواب میں سوات کے مقامیوں نے اپنے ہزاروں ٹی وی سیٹ جلا کر راکھ

کر دیے۔

فضل اللہ کی شعلہ بیانی سے ہر کسی کو متاثر کیا جا سکتا ہے وہ گھریلو خواتین ہوں، مزدور ہوں یا زمیندار، ایک کثیر تعداد تھی جو گندم کا آٹا، کھانے کا تیل اور چینی بطور عطیہ دینے گھروں سے نکل پڑی۔ بہت سے لوگوں نے تعمیراتی کام کے لیے سیمنٹ اور اینٹیں فراہم کرنا شروع کر دیں۔

فضل اللہ نے سوات کے لوگوں کو سماجی انصاف کی فراہمی کے ساتھ ساتھ، آخرت میں جنت کی نوید بھی دی۔ سوات کے لوگ، جو پاکستانی عدالتی نظام سے بری طرح بدظن ہو چکے تھے اور اپنے والی کا سنہری دور یاد کرتے تھے، فضل اللہ کی تقریروں میں انھیں اچھے مستقبل کی جھلک دکھائی دی۔

فضل اللہ نے اور اس سے پہلے صوفی محمد نے اہل سوات کی اس ذہنیت کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ بقول ایک تجزیہ نگار مختار خان کے "وہ جمہوریت پالیسی اور طرز حکومت کی سمت شخصی حکمرانی کے زیادہ عادی تھے۔" انھوں نے پہلے گروہ یا ایک دلکش شخص، بھاری اور کامیاب رہے۔ مثلاً فضل اللہ نے ایک (دو منزلہ) مدرسہ تعمیر کرنے کے لیے 3.5 ملین روپے اپنے حامیوں سے اکٹھے کیے۔ اس مدرسے کو پاکستانی فوج نے 2009ء کے موسم بہار میں تباہ کر دیا۔

پولیو ویکسی نیشن کے خلاف فضل اللہ کی مہم کو پورے پاکستان میں 'وارننگ' کی علامت کے طور پر لیا گیا۔ ویکسی نیشن کو اس نے مسلمانوں کی آبادی میں اضافے کو روکنے کے لیے یہودیوں اور عیسائیوں کی سازش قرار دیا۔ ستمبر 2007ء میں فضل اللہ کے حامیوں نے سوات میں مہاتما بدھ کے صدیوں پرانے مجسموں اور قبل از تاریخ، چٹانوں پر بنائے گئے نقش و نگار کو ختم کرنے کی کوشش کی کیونکہ ان کے خیال میں یہ سب غیر اسلامی تھی... (طالبان نے بین الاقوامی احتجاج کے باوجود 2001ء میں بامیان میں موجود مہاتما بدھ کے دیو ہیکل مجسموں کو بموں سے اڑا دیا تھا) فضل اللہ کے کہنے کے مطابق، اس نے ٹی وی سیٹ، ویڈیو آلات، کمپیوٹرز اور کیمرے (جن کی مالیت 20 ملین روپے تھی) صرف اس لیے جلا کر راکھ کر دیے کہ یہ گناہ کا بنیادی ذریعہ ہیں۔ انھوں نے جامع انداز میں کہا "ہر طرح کے گناہ بشمول موسیقی، رقص، شراب نوشی میں ڈوبے ہوئے معاشرے کو ٹھیک کرنے کے لیے ہمیں اپنی تحریک اور اپنے کام کو دوبارہ منظم کرنا ہوگا۔ اس کے علاوہ کوئی اور چارہ ہے ہی نہیں۔"

صوفی محمد کی طرح، فضل اللہ نے بھی معاشی برابری، فوری انصاف، شہری سہولتوں کی فراہمی، سہولتوں کے لیے زیادہ روزگار اور جائیداد کی دوبارہ تقسیم کی بات کی۔ سوات میں زمین کی تقسیم کے وعدے نے بہت سے لوگوں کو فضل اللہ کی تحریک کا حامی بنا دیا۔ انھوں نے (مقامی خانوں اور سماؤں اور زمینداروں) باغات، کھیتوں اور زمینوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ ان کے

مالکان 2007ء اور 2008ء کے درمیان فضل اللہ کے حامیوں کے ہاتھوں ٹارگٹ کلنگ کے خوف سے علاقہ چھوڑ چکے تھے۔

زیادہ تر لوگوں نے فضل اللہ کی خاموش حمایت کی مگر کچھ لوگوں نے ان کی ایف ایم ریڈیو کی دھواں دھار تقریروں سے متاثر ہو کر ہتھیار اٹھائے۔ ان میں سے اکثر انتہائی غریب، جاہل اور بے روزگار نوجوان تھے طالبان لیڈروں نے یہ کہہ کر بھی عام سواتیوں کے مذہبی جذبات کو ابھارنے کی کہ افغانستان میں غیر ملکی فوجیں موجود ہیں اور یہ جنگ اسلام اور کفر کے درمیان جنگ ہے۔ فضل اللہ نے اپنے بھائی کی موت کو (وہ باجوڑ میں ایک ڈرون حملے کا نشانہ بنا تھا۔ جنوری 2006ء) بھی اپنی حمایت بڑھانے کے لیے استعمال کیا۔ 2007ء میں اسلام آباد کی لال مسجد میں حفاظتی اداروں کی کارروائی کو بھی اس نے مقامی لوگوں میں اشتعال پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا۔ اہلِ سوات کی ابتدائی حمایت کے بعد فضل اللہ کی تحریک کی مقبولیت کم ہونے لگی۔ فضل اللہ کے اسلحہ بردار لوگ سوات کی مارکیٹوں میں دندناتے پھرتے۔ مقامیوں کو انتہائی درشتی سے اپنی بچیوں کو سکول جانے سے روکنے کا کہتے اور اپنے مخالفوں کے سر قلم کر دیتے تھے۔ عوام ظاہر ہے کھل کر ان کی مخالفت نہیں کر سکتے تھے کیونکہ 2007ء کے آخر تک فضل اللہ بہت طاقتور ہو چکا تھا۔

بہت سے طالبان رنگروٹ جرائم پیشہ تھے اور وہ تحریک میں شامل ہو کر اپنی ذاتی کمائی کا ذریعہ بنا رہے تھے۔ کچھ لوگ سوات کے طالبان کے ساتھ اس لیے آ ملے تا کہ اپنے مخالفین سے بدلے چکا سکیں۔ طالبان نے جرائم پیشہ افراد کا خیر مقدم کیا تا کہ ریاست کے خلاف اپنی طاقت بڑھا سکیں اور سوات کے ان لوگوں سے، جن کے پاس اپنے مسلح محافظ تھے، بھی نمٹا جا سکے۔ یہ نظام تعاون ایک دوسرے کو تقویت دینے کے لیے تھا۔ طالبان کو طاقت ور جرائم پیشہ گروہوں کی ضرورت تھی تا کہ لوگوں کو دہشت زدہ کیا جا سکے اور پیسہ اکٹھا کیا جا سکے اور مجرموں کو اپنی جان بچانے اور مجرمانہ سرگرمیاں جاری رکھنے کے لیے ایک چہرے کی ضرورت تھی۔

فضل اللہ کے جنگجو اپنے عروج کے زمانے میں بھی پانچ ہزار سے زیادہ نہیں تھے۔
اس کا نائب شاہ دوران: مذہبی ہونے کے ساتھ ساتھ جرائم میں بھی ملوث تھا۔ تحریک میں شامل ہونے سے پہلے وہ سوات کے مرکزی شہر منگورہ میں بچوں کے کھانے پینے کی چیزیں بیچا کرتا تھا۔ وہ مبینہ طور پر 2009ء کے آخر میں گردے فیل ہونے کے باعث باجوڑ میں فوت ہو گیا۔ بعد میں چونکہ سوات میں طالبان کا تنظیمی ڈھانچہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا اس لیے اس کی جگہ لینے کے لیے کوئی بھی آگے نہیں آیا۔ سوات طالبان میں مسلم خان ایک دوسرا اہم آدمی تھا وہ تحریک کا ترجمان تھا

اور آج کل فوج کی تحویل میں ہے۔ 2009ء کے فوجی آپریشن کے فوراً بعد فضل اللہ روپوش ہو گیا اور کہا جاتا ہے کہ وہ (باجوڑ میں) TTP کے نائب امیر مولوی فقیر محمد کے پاس چھپا ہوا ہے۔ فقیر محمد کے بارے میں سنا گیا کہ وہ 2009ء میں پاکستانی فوج کے ایک ہوائی حملے میں مارا گیا تھا لیکن مصدقہ اطلاعات کے مطابق وہ زندہ ہے۔

تنظیمی ڈھانچہ

سوات میں طالبان کا تنظیمی ڈھانچہ جنوبی وزیرستان کی طرح منظم نہیں تھا کیونکہ ان کا مشن صرف علاقے میں اسلامی قوانین کا نفاذ تھا اور مغربی افواج کے ٹارگٹس پر حملے ان کا مقصد نہیں تھا۔ 2000ء کی دہائی کے وسط میں اقتدار لینے کے بعد، گروپ کے لیڈر نے ایک شوریٰ تشکیل دی جس میں ارکین بدلتے رہتے تھے۔ سوات کے طالبان کا پہلا ترجمان سراج الدین تھا۔ ایک کشمیری جہادی گروپ جیش محمد سے اس کا تعلق رہا تھا۔ 2007ء میں اسے نامعلوم وجوہ کی بنا پر ہٹا دیا گیا۔ مسلم خان اس کا ترجمان بنا جو آج کل فوج کی تحویل میں ہے۔ مسلم خان پچپن سال کا مقامی باشندہ ہے۔ پشتو، اردو، انگلش اور جاپانی روانی سے بول سکتا ہے۔ 970ء میں طالب علمی کے دور میں پیپلز پارٹی کے سٹوڈنٹس ونگ پیپلز سٹوڈنٹس فیڈریشن سے وابستہ رہا۔ 990ء کے ابتدائی سالوں میں صوفی محمد کی تحریک نفاذ شریعت میں سرگرم کردار کیا۔ بعد ازاں کئی سال تک ایک برٹش جہاز راں کمپنی میں کام کرتا رہا۔ نوکری کی تلاش میں وہ کویت بھی گیا۔ بعد میں امریکہ اور جاپان میں وقت گزارا۔ 1999ء میں وہ امریکہ میں کسی رنگ بنانے والے ادارے میں کام کرتا رہا۔ ایک دفعہ بی بی سی (اردو سروس) کو اس نے بتایا کہ "امریکی حکومت ایک لعنت ہے لیکن امریکی باشندے مہذب ہیں۔" اس نے یہ بھی کہا کہ وہ جاپانیوں کو سب سے زیادہ پسند کرتا ہے کیونکہ وہ محنت کش ہیں۔ ستمبر 11، 200ء کے بعد وہ پاکستان واپس آیا اور اس نے میڈیکل سٹور کھول لیا۔ ساتھ ہی وہ فضل اللہ کی مقتدر قوت کا حامی ہو گیا۔ مقامی ذرائع کا کہنا ہے کہ ایف ایم ریڈیو اسٹیشن خریدنے کے لیے مسلم خان نے بھی کچھ فنڈز فراہم کیے تھے۔

فضل اللہ مجلس شوریٰ کا سربراہ تھا۔ شوریٰ کے ارکین کسی خاص وقت میں 30 سے 50 تک ہوتے تھے اور وہ تحریک کے کمانڈر کی حیثیت میں کام کرتے تھے۔ ہر رکن ایک خاص علاقے کے ذمہ دار تھے اور جنگجوؤں کے انفرادی یونٹوں کو کنٹرول کرتے تھے۔ ان جنگجوؤں کی بطور سپاہی، خودکش بمبار، تربیت کار اور سپیشل کمانڈوز کے طور پر تخصیص بھی کی گئی۔ 2007ء میں فضل اللہ نے اپنی شاہین کمانڈو فورس کا اعلان کیا جس میں چار سے پانچ ہزار لڑکے

شامل تھے۔ اس سے بے پردہ عورتوں کے مارکیٹ میں جانے، گاڑیوں میں آلات موسیقی کی تلاش، موسیقی کی دکانوں کو بند کرنے، حجاموں اور خواتین کے کپڑے فروخت کرنے والے سٹور کو بند کرنے کے لیے اخلاقی پولیس کے دستے بھی بنائے۔

سوات کے طالبان کا تنظیمی ڈھانچہ درج ذیل ہے

1) امیر ملا فضل اللہ۔ (2) نائب امیر شاہ دوران (مرحوم)، (3) ترجمان مسلم خان (فوج کی تحویل میں) (4) ارکین شوریٰ سراج الدین (فضل اللہ کا سابقہ ترجمان)، مسلم خان، محمود خان (فوج کی تحویل میں)، قاری مشتاق نثار خان (کورہ بندائی) بن امین (لشکر طوفان کا ایک رہنما، پتہ نہیں کہ وہ زندہ ہے یا نہیں) مولانا محمد عالم بنوری (ایف ایم چینل کا منتظم مارچ 2010ء میں مارا گیا)

کوئٹہ شوریٰ طالبان

ملا عمر کی کوئٹہ شوریٰ طالبان کے سوات کے طالبان کے ساتھ کوئی معلوم رابطے نہیں ہیں۔ کوئٹہ شوریٰ وزیرستان اور فاٹا کے دوسرے قبائلی علاقوں میں طالبان سے حقانی نیٹ ورک کے ذریعے رابطے رکھتی ہے۔ اس نیٹ ورک کے کرتا دھرتا عمر رسیدہ افغانی رہنما جلال الدین حقانی اور ان کا بیٹا سراج الدین ہیں۔ سراج الدین ہی تحریک کا آپریشنل کمانڈر بھی ہے۔ تاہم صوفی محمد اور فضل اللہ کی ان کے ایف ایم ریڈیو پر ملا عمر اور کوئٹہ شوریٰ کے لیے (2000ء کی دہائی میں) تعریفیں ڈھکی چھپی نہیں تھیں۔ بہرحال اب دونوں گروپوں کے درمیان کسی طرح کے آپریشنل رابطے موجود نہیں۔ صوفی محمد نے 2001ء میں امریکی اور نیٹو افواج سے براہ راست لڑنے کے لیے سرحد پار دس ہزار زبردست جنگجو جوانوں کا لشکر لے جا کر ملا عمر کی عملی مدد کا مظاہرہ بھی کیا تھا۔ تاہم صوفی محمد کا شوریٰ طالبان کے ساتھ (کبھی بھی) براہ راست تعلق کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔

2009ء کے موسم گرما میں، طالبان کا افغانستان میں شائع کیا گیا "ضابطہ اخلاق" کا سوات کے جنگجوؤں پر کوئی اثر نہیں ہوا یہ ضابطہ خاص طور سے افغانستان میں سرگرم طالبان کے لیے تھا یا کسی حد تک وزیرستان کے لیے تھا جہاں سے سرحد پار افغانستان میں اتحادی افواج کے خلاف حملے منظم کیے جاتے تھے یا شاید سوات کے لڑاکا طالبان (TNSM) سے یہ لاتعلقی تھی کوئٹہ شوریٰ طالبان کے ایک ترجمان نے مذاق میں کہا۔ "کس قسم کے لوگ ہیں یہ؟" وہ سوات میں سکول تباہ کرنے اور دشمنوں کے سر قلم کیے جانے کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

القاعدہ، طالبان پاکستان اور غیر ملکی جنگجو

2000ء کی دہائی میں، طالبان نے فضل اللہ کی سربراہی میں زور پکڑا اور پھر یہ تحریک پورے سوات میں پھیل گئی۔ مالاکنڈ میں القاعدہ کی کوئی موجودگی نہیں تھی تاہم (2009ء میں) پاکستانی فوج (کے دعووں کے مطابق) آپریشن کے دوران بہت سے غاروں میں جمع شدہ اسلحہ اور گولہ بارود برآمد کیا گیا۔ بہر حال کہیں بھی القاعدہ کا کوئی تعلق نہیں ملا۔

صوفی محمد کی تحریک نفاذ شریعت محمدی دو عشرے قبل تشکیل پائی تھی اور اس کے کبھی بھی تحریک طالبان پاکستان سے کسی قسم کے تعلقات نہیں رہے۔ TTP بیت اللہ محسود کی زیر قیادت 2007ء میں طالبان کے مختلف گروہوں کو (ایک چھتری تلے) متحد کرنے کے لیے بنائی گئی۔ تاہم فضل اللہ کے تحت سواتی طالبان کے TTP کے ساتھ قریبی رابطے موجود تھے کیونکہ فضل اللہ نے بیت اللہ محسود اور ملا عمر کے ساتھ یکجہتی کا اظہار 2007ء کے موسم گرما میں کر دیا تھا۔ یاد رہے یہ واقعہ اسلام آباد میں لال مسجد کے خلاف حکومتی ایکشن کے بعد پیش آیا تھا۔ جون 2009ء میں پاکستانی فوج نے مسلم خان کی بیت اللہ محسود کے کسی قریبی ساتھی سے گفتگو Intercept کی جس میں اس نے سوات میں ہونے والے حالیہ فوجی آپریشن کے متعلق بتایا اور بیت اللہ محسود سے مدد چاہی تھی۔ بیت اللہ کے ساتھی نے وعدہ کیا کہ TTP پورے پاکستان میں خودکش حملے اور زیادہ کر دے گی اور حکومتی اور فوجی ٹھکانوں کو نشانہ بنائے گی تاکہ سوات کے فوجی آپریشن سے ان کی توجہ ہٹائی جا سکے۔ اس گفتگو کے بعد خودکش حملوں کی تعداد کہیں زیادہ بڑھ گئی۔ تاہم وزیرستان کے رہنماؤں کے تحت طالبان جنگجوؤں کے بالائی دیر، بونیر اور ان کی لیویز سے ہٹنے کے عمل میں فضل اللہ کا کوئی کردار معلوم نہیں ہوتا۔

بعض ازبک اور عرب جنگجو جن کی تعداد چند درجن ہوگی وزیرستان سے 2009ء کے موسم گرما میں سوات کے جنگجوؤں کی مدد کے لیے یہاں آئے تھے۔ شاید یہ محض اتفاق تھا کہ ان کے آنے کے بعد سوات میں ٹارگٹ کلنگ اور سر قلم کیے جانے کے واقعات اور زیادہ ہونے لگے تاہم مئی 2009ء میں جب فوجی آپریشن میں تیزی آگئی تو یہ غیر ملکی جنگجو سوات سے غائب ہو گئے۔ ان کے سوات کے صرف ان جنگجوؤں سے رابطے تھے جو باجوڑ اور مہمند کے قریبی علاقوں میں آپریشنل سرگرمیوں میں مصروف تھے۔

مالی معاونت

سوات کے طالبان کو مختلف ذرائع سے مالی مدد ملتی رہی ہے۔ فضل اللہ، ابتدائی زمانے میں، جب وہ ایف ایم ریڈیو پر قرآن کا درس دیا کرتا تھا، کا انحصار سوات کے لوگوں سے جمع اعانتوں

چندوں پر تھا، تاہم طاقت ور ہونے کے بعد اس کے ریڈیو کے سامعین میں بھی اضافہ ہو گیا اور وہ امیروں سے بھی خطیر رقم اکٹھے کرنے لگا۔ کاروباری لوگوں پر ٹیکس لگایا گیا۔ مقامی خانوں کی چھوڑی ہوئی دوکانوں اور مارکیٹوں کو کرائے پر چڑھا دیا گیا۔ مزید براں، طالبان نے مقامی اور قریبی علاقوں کے ٹھیکیداروں اور تاجروں کو قیمتی درختوں کو کاٹنے اور اس لکڑی کو مارکیٹ میں بیچنے کی اجازت دے دی۔

2008ء میں منگورہ پر قبضہ کرنے کے بعد، قیمتی پتھروں اور موتیوں کی تین کانوں کا کنٹرول بھی سنبھال لیا۔ ان میں سے دو کانیں آپریشنل تھیں، انھیں ٹھیکیداروں کو ٹھیکے پر دے دیا۔ "میں تمام مشینری اور سرمایہ وہاں کی اسی طرح چھوڑ آیا۔ کروڑوں کا نقصان ہوا۔ انھوں نے کان پر قبضہ کر لیا اور لوگوں سے کہا کہ کھدائی کر کے قیمتی پتھر باہر نکالیں۔" یہ ایک ماہر ارضیات حکمت اللہ شنواری کے الفاظ ہیں جسے 2007ء میں پتھروں کی کان بیچ دینی پڑی تھی۔

اغوا برائے تاوان بھی سوات کے طالبان کی آمدنی کا ایک اہم ذریعہ تھا کیونکہ تحریک میں عام جرائم پیشہ افراد شامل ہو گئے تھے۔ 2008ء کے دوران وزیرستان کے طالبان کی طرف سے بھی سوات کے جنگجوؤں کو مدد ملتی رہی۔

سوات میں حالیہ فوجی آپریشنز

سوات میں فوجی آپریشنز کے نتائج کبھی کچھ رہے اور کبھی کچھ۔ 2000ء کی دہائی کے کئی آپریشنز ناکامی سے دوچار ہوئے اور پاکستانی فوج کو مجبوراً سوات کے طالبان کو خاصی رعائتیں دینا پڑیں۔ موسم بہار 2009ء کے حالیہ آپریشنز کے ذریعے فوج نے شدت پسندوں کی تحریک پر قابو پایا۔

آپریشن راہ نجات

وادی میں طالبان کی شدت پسند قوت میں اضافے کے باوجود 2006-7ء میں صوبائی اور وفاقی حکومت نے ان کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ وہ وی ڈی اور موسیقی کی دکانیں بند کرتے رہے، عورتوں کو گھروں سے باہر نہیں نکلنے دیتے تھے، مہاتما بدھ کے مجسمے کو تباہ کرنے کی کوشش کر ڈالی۔ 7 جولائی 2007ء کو اسلام آباد میں لال مسجد کے آپریشن کے بعد فضل اللہ کو بڑی اہمیت مل گئی۔ اسے ایک ایسا پلیٹ فارم مل گیا جس کے ذریعے وہ پاکستانی حفاظتی اداروں کے خلاف سوات میں لڑ سکتا تھا۔ اگلے چند ماہ میں، فضل اللہ کے حامیوں نے وادی میں فوجی ٹھکانوں پر خودکش حملوں کا سلسلہ شروع کر دیا اور سوات کے طالبان نے منگورہ میں عورتوں پر باہر نکلنے اور مارکیٹ جانے کی پابندیاں لگا دیں۔

24 اکتوبر 2007ء کو صوبائی حکومت نے فضل اللہ اور اس کے ساتھیوں کے خلاف پہلا آپریشن کرنے کا اعلان کیا تاکہ سوات کی تحصیل مٹہ کے 59 دیہات سے انھیں بے دخل کیا جا سکے جہاں انھوں نے متوازی حکومت قائم کر لی تھی۔ پولیس سٹیشنوں پر قبضہ کر کے ان پر طالبان پولیس سٹیشن کی علامات بھی لکھوا دی تھیں۔ 31 اکتوبر تک حفاظتی فوج کے دعوے کے مطابق، ایک محدود آپریشن میں 130 شدت پسند مارے گئے تھے۔ لیکن اگلے ہی دن طالبان ایک فوجی چوکی پر چڑھ دوڑے اور تقریباً 90 سپاہی گرفتار کر لیے۔ بعد میں انھیں غیر مسلح کر کے رہا کر دیا گیا۔ طالبان جنگجوؤں کے ساتھ سختی سے نمٹنے کے ساتھ ساتھ پولیس نے نومبر کے شروع میں مٹہ اور خوازہ خیلہ کے شہروں میں موجود سارے پولیس سٹیشن طالبان سے خالی کرا لیے۔

پاکستانی فوج نے ان دیہات کا پہلا محاصرہ نومبر 2007ء میں شروع کیا۔ نومبر کے دوران جنگجوؤں سے اور فوج کے درمیان زبردست جنگ ہوئی۔ فوج نے جس میں بھاری آرٹلری استعمال کی شدت پسندوں سے تمام حکومتی عمارات، پولیس سٹیشن اور دوسری پبلک جگہیں بشمول امام ڈھیری میں فضل اللہ کے ہیڈکوارٹر کے، خالی کرا لیں۔ اور دسمبر کے آخر تک وہ پیچھے ہٹ کر پہاڑوں میں چلے گئے۔

پسپائی کے باوجود طالبان نے 2008ء کے موسم بہار تک، پہاڑوں سے ہی حملہ کرو اور بھاگ جاؤ جیسی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ تبھی عوامی نیشنل پارٹی نے اقتدار سنبھالا۔ اس وقت لاقانونیت بے پناہ بڑھ چکی تھی۔ سرحد حکومت کی فروری 2008ء کی ایک رپورٹ کے مطابق ایک سال کے اندر 400 افراد بشمول فوجی سپاہیوں کے اس تصادم کی بھینٹ چڑھ چکے تھے۔ اور عام نقل مکانی اور ملٹری آپریشن سے براہ راست اور بالواسطہ طور پر چھ لاکھ افراد متاثر ہوئے تھے۔

سیکولر، پختون قوم پرست جماعت عوامی نیشنل پارٹی نے حکومت سنبھالتے ہی شدت پسندوں کے ساتھ مذاکرات شروع کیے اور خیر سگالی ظاہر کرنے کے لیے اپریل میں صوفی محمد کو جیل سے رہا کر دیا۔ 21 مئی 2008ء کو طرفین نے 16 نکاتی معاہدے پر دستخط کر دیے۔ معاہدے کا حاصل یہ تھا کہ سوات میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے بدلے طالبان پولیس، فوج اور فرنٹیئر کور پر حملے بند کر دیں گے اور جائیداد کو تباہ کرنا بند کر دیں گے۔ معاہدے میں یہ بھی ذکر تھا کہ اگر طالبان نے معاہدے کا احترام کیا تو حکومت بعض طالبان قیدیوں کو رہا کر دے گی۔ مذاکرات کے کئی راؤنڈ ہوئے جن میں مسلم خان، علی بخت (ایک کمانڈر جو بعد میں مارا گیا) اور محمود خان (جو ستمبر 2009ء میں مسلم خان کے ساتھ گرفتار ہوا) فضل اللہ کی نمائندگی کر رہے تھے جبکہ سرحد کی

دوبارہ سے حکومت کی نمائندگی کی۔ اگرچہ دونوں اطراف سے فتح کے دعوے کیے، طالبان سے شریعت کے نفاذ کے حوالے سے اور حکومت نے سوات میں دوبارہ امن کے قیام کے حصول پر۔ تاہم دونوں ہی نہ جیت سکے کیونکہ سوات میں نہ شریعت نافذ ہوئی اور نہ ہی امن آیا۔

آپریشن راہ نجات

معاہدے کی بعض شرائط پر عمل درآمد میں اختلافات کی بنا پر فضل اللہ سوات سے فوج کی واپسی پر اصرار کر رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ شدت پسند فوج کے واپس جانے کے بعد ہتھیار ڈالیں گے جبکہ حکومت چاہتی تھی کہ پہلے طالبان ہتھیار ڈالیں اور پھر فوج سوات سے نکلے۔ فضل اللہ نے 27 جون 2008ء کو معاہدہ ختم کر دیا اور طالبان شدت پسندوں کو اپنے لڑاکوں کے خلاف عوام کی جاسوسی کے شبہ میں، پاکستانی فوج پر حملوں کا حکم دے دیا۔ شدت پسندوں نے بالائی سوات میں آئی ایس آئی کے دو جونیئر افسروں کو مار ڈالا۔ اس پر فوج نے 29 جون کو پھر آپریشن شروع کر دیا۔ کبل، مٹہ اور خوازہ خیلہ، بارہ بنڈی، کوزہ بنڈی اور سوات کے دوسرے اہم شہروں میں شدید لڑائیاں ہوئیں۔ طور مٹہ اور علی بخت سمیت کئی اہم طالبان لیڈر دوسرے مرحلے میں مارے گئے لیکن جون کے آخر میں جنگجوؤں نے مالم جبہ میں پاکستان کے سب سے بلند تفریحی مرکز پی ٹی ڈی سی موٹیل کو نذر آتش کر دیا اور فوج پر ٹارگٹ کلنگ اور باقاعدہ حملے تیز کر دیئے۔

2008ء کے اواخر اور 2009ء کے ابتدائی مہینوں میں سوات کی تاریخ کے بدترین دن گزرے۔ بہت سے سکولوں کو جلا دیا گیا، ان پر بمباری کی گئی یا فوجی آپریشن کے ذریعے تباہ ہو گئے، موسیقی پر پابندی لگا دی گئی۔ نائیوں کو ایک بار پھر مردوں کی داڑھی مونڈنے سے منع کر دیا گیا۔ تقریباً 20 لاکھ افراد سوات سے نکل کر پشاور، اسلام آباد اور دوسرے شہروں کی طرف پناہ کے لیے بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ آٹھ ہزار فوجیوں (بعد ازاں یہ تعداد 20 ہزار تک جا پہنچی) نے 3 سے چھ ہزار طالبان جنگجوؤں سے باقاعدہ جنگ کی۔ پاکستانی پولیس صرف منگورہ میں ہی موجود تھی باقی سارا سوات طالبان کے قبضے میں تھا جہاں وہ اپنی عدالتیں چلاتے تھے اور لوگوں کو غلط کاموں پر سزائیں دیتے رہتے تھے۔

صوفی محمد کے مطالبے کے مطابق، سرحد حکومت ایک بار پھر نظام عدل ریگولیشن لانے پر رضامند ہو گئی۔ اس ایکٹ کے ذریعے مالاکنڈ ڈویژن میں شرعی قوانین نافذ ہونا تھے۔ اس طرح ایک اور امن معاہدہ 15 فروری 2009ء کو کیا گیا۔ یہ قدم سیکولر عوامی نیشنل پارٹی کے لیے بڑا مشکل تھا تاہم پارٹی شدت پسندوں کا یہ دباؤ برداشت کر گئی اور دوسری جماعتوں مثلاً پختونخوا ملی عوامی

پارلی اور میڈیا کے دباؤ کے باوجود، شرعی قوانین کے نفاذ کا وعدہ کر لیا۔ نیٹو افواج طالبان کی از سر نو تقویت (اس معاہدے کے ذریعے) نہیں چاہتی تھیں کیونکہ اس طرح طالبان کے افغانستان میں ان کے دستوں پر حملے میں اضافہ ہو جاتا۔

صوفی محمد نے 8 فروری کو منگورہ کی جلسہ گاہ گراسی گراونڈ میں ایک بڑی ریلی منعقد کی، جہاں متنازعہ معاہدے کے فوراً بعد اس نے سوات میں دائمی امن کا وعدہ کیا۔ امن کوشش کی حمایت میں ہزار ہا افراد نے اس ریلی میں شرکت کی اور اسی روز فضل اللہ نے فوج پر حملے روک دینے کا حکم دے دیا لیکن فوراً ہی فضل اللہ اور اس کے کمانڈروں نے شکایت شروع کر دی کہ ان کے آدمیوں کو بلا وجہ روک کر تلاشی لی جا رہی ہے۔ وہ معاہدے کی شرائط پوری کرنے میں بھی ناکام رہے۔۔۔ انہوں نے ہتھیار ڈالے اور نہ ہی چوکیاں ختم کیں۔ جب فوج نے بزور طاقت ان سے معاہدے کی پابندی کرانے کی کوشش کی تو انہوں نے سوات اور مالاکنڈ کے علاقوں میں افراتفری پھیلاتے ہوئے سرکاری حکام کو مارنا شروع کر دیا۔ شدت پسندوں نے لوئر دیر میں ایک ضلعی پولیس افسر کو مار ڈالا جبکہ ایک اور حملے میں ایف سی میں پانچ پولیس اہلکاروں کو گنوا دیا۔ امن معاہدے کے دو ماہ کے اندر اندر طالبان بونیر تک پھیل گئے۔ بونیر، اسلام آباد سے صرف 70 میل کے فاصلے پر ہے۔ انہوں نے ڈگر کا قصبہ اور اس کے ارد گرد کے دیہات قبضے میں لے لیے اور وہاں پٹرولنگ شروع کر دی۔ ان علاقوں کے بارے میں عمومی خیال یہ ہے کہ تحریک نفاذ شریعت کی یہاں تک رسائی دلیری کی انتہا تھی۔

بونیر، دیر اور سوات (ان علاقوں میں طالبان نے 2009ء کے ابتدائی مہینوں میں اپنا کنٹرول مستحکم کر لیا تھا) سے طالبان کے انخلا کی جب تمام کوششیں ناکام ہو گئیں، تو اپریل کے آخر میں فوج نے بھرپور آپریشن شروع کر دیا۔ مقامی لوگوں کو پہلے سے یہ علاقہ خالی کرنے کے لیے کہہ دیا گیا۔ مئی اور وسط جولائی کے درمیان 25 لاکھ لوگ گھروں سے نکل کر پشاور، مردان، صوابی، چارسدہ، نوشہرہ اور دوسرے پاکستانی شہروں میں موجود کیمپوں میں یا اپنے رشتہ داروں کے پاس یا کرائے کے گھروں میں جا پہنچے۔ طالبان جنگجوؤں کے بعض حصوں نے سوات میں منگورہ اور ڈاگر (بونیر) کے اہم شہروں پر مکمل قبضہ جما لیا تھا۔ 2007ء اور 2008ء میں فوجی اور پولیس کی کارروائیوں کے باوجود یہ سب کچھ غیر متوقع نہیں تھا۔ وہ طالبان کا مالاکنڈ میں کنٹرول ختم کرنے میں ہی ناکام نہیں ہوئے تھے بلکہ شدت پسندوں کی تحریک اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی اور اب بھی وقت آیا کہ وہ اسلام آباد سے صرف 70 میل کے فاصلے پر تھے۔ یہ صرف پاکستان کے لیے بلکہ دنیا بھر کے لیے خطرے کی گھنٹی تھی۔

2009ء میں لڑائی کے دوران بہت سے طالبان کمانڈر مارے گئے اور سوات کے طالبان کا ترجمان مسلم خان گرفتار ہو گیا۔ (ستمبر میں) فوج کے اعداد و شمار کے مطابق سوات میں 2009ء کے آپریشن میں (سوات، دیر، بونیر اور شانگلہ کے اضلاع میں) 300 جنگجو مارے گئے اور کئی سو لوگ گرفتار ہوئے۔ جولائی میں فوج طالبان کے گڑھ پیوچار پہنچی، جہاں ان کے کہنے کے مطابق غاروں میں اسلحہ اور بارود کے انبار لگے ہوئے تھے۔

پاکستانی فوج کے دعوے کے مطابق جولائی 2009ء میں وادی سوات پر ان کا مکمل کنٹرول ہو گیا۔ شدت پسند مارے گئے یا بھاگ گئے یا روپوش ہو گئے۔ اس کے بعد مینگورہ، خوازہ خیلہ، کانجو، مٹہ، کالام اور سنگل دار کے علاقوں میں طالبان جنگجوؤں کی گولیوں سے چھلنی لاشیں لوگوں کو نظر آنے لگیں۔ طالبان ان لوگوں کو حکومت کے حمایت یافتہ لشکروں یا قبائلی شدت پسندوں سے شکار کیا تھا تاکہ مستقبل میں طالبان میں شمولیت کے خواہاں افراد کو واضح پیغام دیا جا سکے۔

تاہم خوف و ہراس کی فضا آج بھی سوات میں طاری ہے۔ نومبر 2009ء میں اے این پی کے مقامی لیڈر اور سرحد اسمبلی کے رکن شمشیر خان کو خودکش حملے کے ذریعے، ان کے اپنے گھر مینگورہ میں قتل کر دیا گیا۔ ان کے بھائی رحمت علی نے وہی نشست ضمنی الیکشن کے ذریعے جیت لی۔ یہ ضمنی انتخاب پرامن اور قواعد و ضوابط کے مطابق تھا۔

فوجی آپریشنز کے بعد سوات کی صورت حال

سوات کے لوگ اپنے گھروں کو واپس آ گئے مگر حکومت انہیں کوئی خاص سہولتیں فراہم نہیں کر پائی۔ سکول ابھی تک کھنڈر بنے ہوئے ہیں اور بچوں کو کھلے آسمان تلے تعلیم دی جا رہی ہے۔ اگرچہ حکومت نے نئی بھرتیاں کر کے پولیس کا محکمہ منظم کرنے کی کوشش کی ہے تاہم لوگ یہ سارا انتظام فوج کے بجائے شہری انتظامیہ کے ہاتھوں میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور سیاسی معاملات میں اپنی شراکت چاہتے ہیں۔ برسوں پر محیط جنگ کے نتیجے میں تباہ شدہ معیشت کی وجہ سے مقامی باشندوں کو روزگار کی شدید ضرورت ہے۔ وہ کاروبار کی بحالی خصوصاً ایک زمانے کی مانی ہوئی سیاحت کی انڈسٹری کو فروغ دینے کے لیے حکومتی معاونت کے خواہاں ہیں۔ 2009ء کی فوجی مہم گزشتہ آپریشنز کے مقابلے میں کئی عوامل کی وجہ سے ممتاز ہو گئی اور سب سے اہم بات پورے پاکستان میں عوامی رائے طالبان کے خلاف ہو گئی۔ خصوصاً سوات کے معصوم عوام پر طالبان کے وحشیانہ طرز عمل نے جلتی پر آگ کا کام کیا۔ لوگوں کا سر قلم کیا جانا اور بم بلاسٹ کے ذریعے عوام میں

دہشت پھیلانا اور لاقانونیت کو عروج پر پہنچا دینا سب کچھ لوگوں کے سامنے آ گیا۔ چنانچہ وادی کے عوام نے 2009ء کے فوجی آپریشن کی بھرپور حمایت کی۔ مئی 2009ء میں سرحد میں کیے گئے ایک سروے کے مطابق 86% لوگ حکومتی اقدامات کے بارے میں مثبت جذبات رکھتے تھے جبکہ صرف 6% لوگوں نے پاکستانی طالبان کی حمایت کی۔

دوسرے گزشتہ فوجی اور پولیس آپریشنز بے دلی کے ساتھ کیے گئے تھے۔ پھر انھیں روک دیا گیا۔ فوج سوات کے بعض علاقوں میں طالبان کے پیچھے تھی جبکہ بعض دوسرے علاقوں میں انھیں پوچھنے والا کوئی بھی نہ تھا۔ فوج آپریشن شروع کرتی تو جنگجو پہاڑوں میں جا چھپتے 2009ء کا آپریشن اس کے برعکس، پوری وادی میں کیا گیا اور اس سے پہلے مقامی آبادی کو اس علاقے سے نکال دیا گیا۔ اس سے پاکستانی فوج کی سنجیدگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

تیسرے عوامی نیشنل پارٹی 2009ء میں صوبے میں برسرِاقتدار آ گئی۔ اس نے صوبے میں امن لانے کا وعدہ کیا تھا اس لیے اس نے دو دفعہ سوات کے طالبان کے ساتھ مسائل حل کرنے کی کوشش کی لیکن دونوں دفعہ کوشش ناکام رہی۔ شدت پسند اس صورت حال میں زیادہ طاقتور ہو گئے اور انھوں نے پولیس اور حکومتی اداروں پر (فرنٹیئر کے افسران اور معصوم شہریوں پر) حملے تیز کر دیئے۔ اس وقت اے این پی کی حکومت نے چاہا کہ فوجی آپریشن سنجیدگی سے کیا جائے۔ درحقیقت صوبائی حکومت نے وفاقی حکومت کی حمایت سے فوج کو حتمی آپریشن کرنے کا الٹی میٹم دے دیا، دوسری صورت میں اس نے صوبائی حکومت چھوڑ دینے کی دھمکی دی۔

2009ء کا آپریشن بظاہر تو کامیاب ہو گیا مگر مسائل موجود ہیں۔ دین امین اور ابن عقیل جیسے خطرناک کمانڈر بھی تک آزاد ہیں۔ اسی طرح طالبان کا امیر فضل اللہ بھی روپوش ہے۔ سنے میں آیا ہے کہ وہ افغانستان میں کسی جگہ سے کہا کہ وہ سوات میں دوبارہ گوریلا وار شروع کرے گا تاہم موسم بہار 2009ء کے فوجی آپریشن نے اہل سوات کا اعتماد بحال کرنے میں مدد دی ہے، وادی میں سکون آ گیا۔ لڑکیوں کے سکول اڑائے جاتے، اسپتال اور پولیس سٹیشن تباہ کرنے اور (سرکاری اہلکاروں اور) مخالفین کے سر قلم کرنے، اغوا کی وارداتیں اور خودکش حملوں کے واقعات ختم ہو گئے۔ سوات کے کثیر باشندے اب پرامید ہیں کہ فوج اب مزید کسی بغاوت کی اجازت نہیں دے گی۔ اور اگر ایسا ہوا بھی تو وہ اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوں گے۔ بعض لوگ اب بھی نفاذ شریعت کی بات کرتے ہیں جیسے صوفی محمد، جو اب جیل میں ہے۔ اور فضل اللہ اور اس کے کمانڈر جن میں سے کچھ مارے گئے اور کچھ روپوش ہو گئے۔

سوات کا قبائلی ڈھانچہ

وادی میں پختون نسل کے یوسف زئی قبیلے کی اکثریت ہے۔ تاہم دور دراز علاقوں اور پہاڑوں میں کئی اور نسلی گروہ بھی آباد ہیں۔ ذیل میں تین بڑے نسلی گروہوں اور ان کے علاقوں کی تفصیل دی گئی ہے۔

نسلی گروہ	علاقہ	زبان
پختون	تمام وادی سوات اور مالاکنڈ ڈویژن	پشتو
گجر	بکھرے ہوئے ہیں مگر زیادہ تر ضلع سوات میں آباد ہیں	گجری
کوہستان	زیادہ تر کوہستان، بحرین اور کالام میں آباد ہیں	کوہستانی

گجر اور کوہستانی آبادی کا 5% ہیں۔ سوات کے اہم پختون عمائدین میں افضل خان لالہ (جس کے پاس خوازہ خیلہ کا کنٹرول ہے) شجاعت علی خان اور بخت بیدار خان (جو 2008ء میں مارے گئے) کا خاندان وادی میں آج بھی طاقتور ہے۔ شجاعت علی خان شدت پسندوں کے خوف سے سب سے پہلے علاقہ چھوڑ گیا اور پشاور، اسلام آباد میں جا بسا تھا۔ طالبان نے اس کی زمینوں پر قبضہ کر کے اس میں سے کچھ حصہ دوبارہ تقسیم کر دیا تھا۔ افضل خان لالہ پر سوات میں طالبان نے کئی حملے کیے۔ وہ زخمی ہوا، اس کے کئی رشتہ دار بھی مارے گئے لیکن وہ وادی میں مقیم رہا۔ بہت سے مقامی باشندوں کے نزدیک وہ (طالبان کے خلاف) مزاحمت کی علامت بن گیا ہے۔ گرچہ صوفی محمد کی زیادہ تر حمایت پختون علاقوں میں تھی تاہم فضل اللہ نے ایف ایم ریڈیو پر تقریروں کے ذریعے گجر برادری میں بھی اپنی جگہ بنائی تھی۔ اس کے حامی زیادہ تر غریب پختون اور گجر تھے۔ جو ایف ایم چینل پر سوشل انصاف اور پختون سرداروں اور زمینداروں کے خلاف فضل اللہ کی شعلہ بار تقاریر سن کر اس کے ساتھ ہو گئے۔ زمینوں پر کام کرنے والے کسان، جو مساوات چاہتے تھے، بھی فضل اللہ کے حامی ہو گئے۔ پھر وہ پختونوں میں اپنی بنیاد مضبوط کرنے کے لیے روایت کا سہارا لینے لگا۔ انتقام پختون زندگی کا اہم حصہ ہے۔ وہ لوگ، جو طاقتور دشمنوں سے انتقام نہیں لے سکتے تھے، بھی فضل اللہ کی تحریک میں اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے شامل ہو گئے۔

آبادی کے مسائل اور مشکلات

سوات میں طالبان کے عروج میں اہم ترین رول آہستہ رو، کرپٹ اور غیر مستعد عدالتی نظام کا تھا۔ چالیس سال پاکستانی قانون کے تحت گزارنے کے باوجود اہل سوات اپنے آخری والی کا دور یاد کرتے تھے۔ اس کا دور "سستا، فوری اور یقینی انصاف، سب کے لیے" کی وجہ سے

پاتا ہے۔ (سابقہ شاہی خاندان کے رکن اور سرحد اور بلوچستان کے سابق گورنر میاں گل جہاں زیب کے مطابق) والی کے دور میں اہم ترین معاملہ بھی ایک یا دو ہفتے میں حل کر لیا جاتا تھا لیکن پاکستانی عدالتی نظام میں معاملہ سالوں تک لٹکا رہتا تھا۔ اسی صورت حال نے صوفی محمد اور بعد ازاں فضل اللہ کے فوری انصاف کے وعدوں کے لیے قبول عام پیدا کر دی۔

"طویل تر قانونی طریقہ کار بد دیانتی، تاخیر، اخراجات کی طوالت، رشوت اور بہت سی دوسری خرابیاں تھیں جن سے اہل سوات پہلے ہی بہت پریشان تھے (ان سب نے مل کر) سوات میں تحریک نفاذ شریعت محمدی کو مہمیز دی۔" نئی دہلی کے ایک آزاد تجزیاتی ادارے کے لیے سلطان روم نے اپنے اہم تجزیے میں یہ رائے دی ہے۔ "عوامی جذبات و مطالبات کی پذیرائی، آسانی اور فوری انصاف یقینی بنانے اور روزگار وغیرہ کی سہولتیں فراہم کرنے کی بجائے تحریک کے مطالبات کا مذاق اڑا کر، حکومت نے صورت حال کو اور بھی پیچیدہ کر دیا۔ اگر حکومت شہریوں کو سہولتیں مہیا کر دیتی تو تحریک نفاذ شریعت خود بخود ختم ہو جاتی۔" سوات کی ایک مقامی NGO کے سربراہ شوکت شرار نے طالبان کے ساتھ پیچیدہ امن معاہدوں اور ان کی ناکامی کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے رائے دی۔

وادی میں یہی نہیں کہ عدالتی نظام کرپٹ اور سست رو تھا بلکہ بہت سے لوگ شہری، انتظامی کی حاجتوں سے بھی حالت نالاں تھے۔ اسی بے اطمینانی کی بدولت لوگ کوئی دوسرا راستہ یعنی طالبان ڈھونڈنے لگے۔ والی کی اقتدار سے علیحدگی کے بعد حکومت نے مقامی باشندوں کے لیے سماجی اور تعلیمی سہولتوں کی فراہمی میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ 1969ء میں یہاں دو لاکھ کی آبادی کے لیے پانچ ہائر سیکنڈری سکول تھے۔ اس کے بعد ایک بھی سکول قائم نہیں کیا گیا جبکہ اب آبادی 20 لاکھ سے تجاوز کر چکی ہے۔ غیر معمولی بے روزگاری اور زمین کی زرخیزی میں کمی، لوگوں کی پریشانی کی بڑی وجہ تھیں۔ فضل اللہ کے اکثر مسلح حامی غریب اور جاہل نوجوان اور بے زمین کسان تھے۔ ان میں سے کچھ حجاموں کے طور پر گزارا کرتے تھے اور کچھ نوکریاں تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ خفیہ اداروں کی ناکامی، حکومتی بے حسی اور متحدہ مجلس عمل کی اس وقت صوبائی حکومت کے قیام نے سوات میں مقامی طالبان کو مزید تقویت بخشی۔ اہل سوات کے مسلسل احتجاج کے باوجود، شدت پسندوں کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ اور سرگرمیوں کو 2006ء سے پہلے تک نظر انداز کیا جاتا رہا۔

> حکومت نے بارہا تسلیم کیا کہ وادی کے لوگوں کی شکایات، بالخصوص عدالتی نظام، روزگار، انتظامی خرابیوں اور شہری سہولتوں سے متعلق، انتہائی جائز ہیں۔
> سرحد کے وزیر اطلاعات میاں افتخار حسین نے جولائی 2009ء کے فوجی

آپریشن کے دوران کہا: "لوگوں کی تکالیف بجا تھیں لیکن انہیں حل کرنے کے لیے ہتھیار نہیں اٹھانے چاہئیں۔"

وادیِ سوات میں شدت پسندوں کے صفایا سے متعلق حکومتی یقین دہانیوں کے باوجود مولانا فضل اللہ اور اس کے اہم ساتھیوں کے بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کی جا سکتی۔ اور منگورہ میں حالیہ خودکش حملوں سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ آگ اب بھی سلگ رہی ہے۔ وادی میں سکوت ہے لیکن امن نہیں۔

داؤد خان خٹک پشتو اخبار روشن میں ہیں۔ آج کل ریڈیو مشعل کے لیے کام کر رہے ہیں۔ وہ کئی انگریزی اخباروں میں بھی کام کرتے رہے ہیں وہ امریکہ کے اخبار کرسچین سائنس مونیٹر اور برطانیہ کے سنڈے ٹائمز میں بھی لکھتے رہے ہیں۔

عسکریت اور اورکزئی کا تنازعہ

راحیل خان۔ ستمبر 2010ء

اورکزئی پاکستان کی سات قبائلی ایجنسیوں میں سے واحد ایجنسی ہے جس کی افغانستان کے ساتھ سرحد نہیں لگتی۔ یہ کبھی تحریک طالبان پاکستان کے سربراہ حکیم اللہ محسود کا علاقہ تھا جو افغانستان میں عسکری کارروائیوں کی قیادت کرنے کے علاوہ خیبر اور پشاور کے علاقے میں 2008-2009 میں جنوبی سپلائی کے ٹرکوں کو نشانہ بناتا رہا تھا۔ اورکزئی کا علاقہ کرغ گھر کی پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے جو چودہ سو میٹر سے لیکر چھبیس سو میٹر تک بلند ہیں۔ ایجنسی کسی زمانے میں کوہاٹ کا حصہ تھی لیکن اورکزئی قبائل کے مسلسل مطالبات کے نتیجے میں نومبر 1973ء میں پاکستان کے صدر فضل الٰہی چودھری نے ایک اعلان کے تحت اسے ایک علیحدہ قبائلی ایجنسی بنا دیا تھا۔

اورکزئی ایجنسی کا کل رقبہ پندرہ سو مربع کلومیٹر ہے اور یہ دو انتظامی علاقوں میں منقسم ہے جو بالائی اورکزئی اور زیریں اورکزئی کہلاتے ہیں جن کی کل آبادی سوا دو لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ بالائی اورکزئی مزید دو حصوں بالائی تحصیل اور سماگل زئی تحصیل میں منقسم ہے جبکہ زیریں اورکزئی کو زیریں تحصیل اور وسطی تحصیل میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایجنسی کے مرکزی شہروں یا قصبوں میں ڈبوری، غلجو، کلایہ، مشتی میلہ اور کوریز شامل ہیں۔ اورکزئی کا انتظامی ہیڈکوارٹر ہنگو ڈسٹرکٹ میں کوہاٹ ٹل روڈ پر واقع ہے۔ اورکزئی میں شرح خواندگی کم ہے اور یہاں بسنے والے زیادہ تر لوگ زراعت سے وابستہ ہیں۔ پڑھے لکھے قبائلی افراد حکومت میں شامل ہو جاتے ہیں جبکہ بہت سے روزگار کے لیے بیرون ملک مشرق وسطیٰ وغیرہ چلے جاتے ہیں جہاں وہ زیادہ تر تعمیراتی مزدوری اور ٹیکسی ڈرائیوری وغیرہ کرتے ہیں۔

اورکزئی میں عسکریت کا ڈھانچہ

اس علاقے میں عسکریت کے جو تین اجزاء ہیں وہ بظاہر الگ الگ لیکن آپس میں مربوط ہیں۔ پہلا جز فرقہ وارانہ تنازعہ ہے کیونکہ ایجنسی میں دس فیصد آبادی شیعہ فرقے سے تعلق رکھتی ہے جبکہ اکثریت سنی مسلمانوں کی ہے۔ دوسرا جز مذہبی نوعیت کی تحریک ہے جو سوات میں اٹھنے والی تحریک نفاذ شریعت محمدی جیسی ہے جبکہ تیسرا جز تحریک طالبان پاکستان سے تحریک پا کر اٹھنے والی عسکریت ہے۔

اورکزئی میں فرقہ واریت

ایجنسی میں اکثریت کے ساتھ موجود سنی مسلمانوں کی منفرد تقسیم اور پڑوسی کرم ایجنسی میں موجود چالیس فیصد شیعہ آبادی کی وجہ سے اس علاقے میں فرقہ واریت کو فروغ ملتا ہے۔ ایجنسی کے اٹھارہ قبیلوں میں سے تین مکمل طور پر اور دو جزوی طور پر شیعہ مسلک سے تعلق رکھتے ہیں۔ اورکزئی میں فرقہ وارانہ تنازعے کی بنیادی وجہ کلایہ میں واقع میر انور شاہ کی درگاہ کی ملکیت کا تنازعہ ہے۔ یہ درگاہ تین سو سال پرانی ہے اور شیعہ مسلمانوں میں صاحب درگاہ کے حوالے سے بہت عقیدت پائی جاتی ہے۔ اورکزئی کے شیعہ مسلمان طویل عرصے سے اس درگاہ اور اس کے آس پاس موجود پہاڑی پر دعویٰ کرتے آرہے ہیں۔ تاہم 936ء میں انگریزوں نے اس کا کنٹرول سنیوں کو دے دیا تھا اور علاقے کو فرقہ واریت سے بچانے کے لیے سنی اور شیعہ مسلمانوں کو الگ الگ علاقوں میں منقسم کر دیا تھا۔ اس کی وجہ سے کئی عشروں تک ، ماسوائے چھوٹے چھوٹے جھگڑوں کے، اس علاقے میں امن وامان رہا۔ اگست 988ء میں جب شیعہ فرقے سے تعلق رکھنے والے کچھ افراد نے سنیوں کے حامی جرنیل ضیاء الحق کی موت پر جشن منایا تو ایک بار پھر علاقے میں لڑائی چھڑ گئی۔ ایک ماہ بعد ان فرقوں اور اورکزئی انتظامیہ کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کے تحت شیعہ مسلمانوں کو درگاہ کی زیارت اور اس کی دیکھ بھال کی اجازت دے دی گئی۔ جون 999ء میں درگاہ کی تزئین و آرائش کے کام کا افتتاح ہوا تو اس موقع پر ایک تقریب منعقد کی گئی جس میں دونوں فرقوں کے لوگوں نے شرکت کی لیکن چند روز بعد اورکزئی کے علاقے ڈابوری کے مقامی طالبان نے کلایہ پر حملہ کر دیا اور تزئین و آرائش کے کام کو روک دیا ۔ علاقے کے بزرگوں کے مطابق اس سے علاقے کا پرامن ماحول برباد ہو گیا۔ مقامی طالبان نے اس سلسلے میں 1988ء کے معاہدے کی مذمت کی اور درگاہ میں ہونے والی موسیقی کو خلاف اسلام قرار دینے کے علاوہ شیعوں کا درگاہ میں داخلہ بند کرا دیا۔ شیعہ بزرگوں کا کہنا تھا کہ درگاہ کے اندر

موسیقی وغیرہ شرک ہیں۔ انہوں نے الزام لگایا کہ طالبان نے آس پاس کی پہاڑیوں پر قبضہ کر رکھا ہے جہاں سے وہ مارٹروں اور گرینیڈوں سے دیہاتوں پر بمباری کر رہے ہیں جس سے بڑی تعداد میں لوگ زخمی ہو رہے ہیں اور گھر تباہ ہو رہے ہیں۔ طالبان نے علی خیل کے علاقے میں چالیس شیعہ خاندانوں پر جرمانے عائد کیے اور انہیں گھر چھوڑنے پر مجبور کیا۔ اورکزئی سے تعلق رکھنے والے اسلم فاروقی گروپ جس کا تعلق سپاہ صحابہ پاکستان سے تھا اور ازبک اور عرب جنگجوؤں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس علاقے کا امن تباہ کرنے میں ان کا بنیادی کردار تھا۔ طالبان نے اس فرقہ وارانہ لڑائی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مقامی سنی گروپوں کا ساتھ دیا تاکہ وہ علاقے میں اپنی اسلامی ریاست قائم کر سکیں۔

فرقہ وارانہ جھڑپوں میں اموات کے بعد اکتوبر 2006ء میں اورکزئی کی پولیٹیکل انتظامیہ نے دونوں فرقوں کی درگاہ میں داخلے پر پابندی عائد کر دی۔ ان جھڑپوں میں ایک شیعہ گروپ نے سنی مسلمانوں کے گھروں کو نذر آتش کر دیا اور درگاہ کے آس پاس کے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ درگاہ کو مسمار کر دیا گیا اور کلایہ میں فرقہ وارانہ جھڑپیں جاری رہیں۔ 1999ء سے لیکر 2009ء تک کے دس سال کے عرصے میں اورکزئی میں اور اورکزئی کے پڑوسی ضلع ہنگو میں بیس ہزار سے زائد افراد فرقہ واریت کی بھینٹ چڑھ کر جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

اورکزئی میں جاری فرقہ وارانہ تنازعہ کے کچھ معاشی پہلو بھی تھے۔ اورکزئی میں آباد شیعہ، سنی مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ خوشحال اور پڑھے لکھے ہیں۔ ان میں سے کئی کے پاس بڑی بڑی جائیدادیں، جنگلات اور باغات ہیں۔ اس کے علاوہ شیعہ قبائلی پاکستان کی پولیٹیکل انتظامیہ سے لوگوں کی کانوں کے ٹھیکے بھی حاصل کرتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں سنی نسبتاً غریب اور کم پڑھے لکھے ہیں اور کم زرخیز علاقوں میں آباد ہیں۔

تحریک طلبہ موومنٹ (ٹی ٹی ایم)

جیسا کہ پہلے بتایا گیا کہ اورکزئی واحد قبائلی ایجنسی ہے جس کی افغانستان کے ساتھ سرحد نہیں ملتی لیکن سوویت یونین کے افغانستان پر حملے کے بعد اس کے نتیجے میں وہاں پر قائم ہونے والی طالبان کی حکومت کے اس پر زبردست اثرات ہیں۔ 990ء کی دہائی کے اواخر میں محمد رحمان نامی ایک مقامی مولوی نے یہاں طالبان جیسی تحریک کا آغاز کیا جس کا نام تحریک طلبہ موومنٹ (ٹی ٹی ایم) تھا اور جو ایجنسی میں شریعت کے نفاذ کی حامی تھی۔ ٹی ٹی ایم پر ملاکنڈ کی

تحریک نفاذ شریعت محمدی کے گہرے اثرات تھے جس کا سربراہ صوفی محمد تھا۔ افغانستان میں طالبان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے 1998ء میں اورکزئی کے طالبان نے ایک نوجوان کو سرعام سزا دینے کا حکم دیا جو تحریک طلبہ سوموست کی جانب سے قائم کردہ مقامی علاء کی ایک عدالت نے سنائی تھی۔ اس نوجوان کو دو ہزار افراد کے مجمع میں سزائے موت دی گئی جو اسے مقتول کے بھائی اور چچا نے اپنے ہاتھوں سے دی۔ محمد رحمان نے اس عمل کی تعریف کی اور اسے نفاذ شریعت کی جانب ایک بڑا قدم قرار دیا۔ یہ ٹی ٹی ایم کے انصاف کی پہلی مثال تھی جس کی بعد ازاں طالبان تحریک نے بھی پیروی کی۔ اورکزئی کی ٹی ٹی ایم نے دیگر قبائلی علاقوں میں کیے جانے والے اپنے فیصلوں میں مقامی بزرگوں کو بھی شامل کیا اور یوں ایجنسی میں مکمل طور پر اسلامی نظام قائم کرنے کی کوشش کی۔ ٹی ٹی ایم نے موسیقی، ٹی وی سیٹس، وی سی آر کو غیر قانونی قرار دے دیا اور خلاف ورزی کرنے والوں کو جرمانے اور ان کی جائیدادیں تباہ کرنے جیسی سزائیں دیں۔

گیارہ ستمبر 2001ء میں دہشت گردوں کے امریکہ پر حملے کے بعد امریکہ نے افغانستان پر حملہ کر دیا جس پر صوفی رحمان نے ایک فتویٰ جاری [illegible] کیا جس میں افغانستان پر حملہ آور دشمن کے خلاف جہادی حمایت کی گئی اور سینکڑوں جنگجوؤں نے تحریک نفاذ شریعت محمدی کے لڑکوں کے ساتھ افغان طالبان کے شانہ بشانہ لڑائی کی قیادت کی۔ مالاکنڈ میں ٹی این ایس ایم سے متاثر ہو کر مقامی مذہبی قبائلی بزرگوں نے پاکستان کے دیگر قبائلی علاقے تک نام میں ٹی این ایس ایم اور دیگر عسکریت پسند گروہوں کے ساتھ اتحاد بنانے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں کئی جلاس منعقد کیے گئے۔ تاہم ٹی این ایس ایم اور صوفی محمد کی شکست [illegible] کے نتیجے میں ان کی امیدیں خاک میں مل گئیں۔ تحریک طلبہ سوموست بھی منظر سے غائب ہو گئی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے بیشتر لڑکے مارے گئے اور کچھ دیگر گروہوں میں شمولیت اختیار کر لی جبکہ مولوی رحمان کا کچھ پتہ نہ چلا۔

2004 کے بعد سے اورکزئی ایجنسی [illegible] وزیرستان میں پاکستانی فوج کی کارروائی سے بچ نکلنے والے عسکریت پسندوں کا ٹھکانہ بنی ہوئی ہے جہاں سے نہ صرف وہ پاکستانی فوج بلکہ افغانستان کے اندر بھی حملے کرتے ہیں۔ 2005ء شروع ہوتے ہی اورکزئی سے ملحق خیبر ایجنسی میں منگل باغ کے لشکر اسلام نے بھی کارروائیاں شروع کر دیں۔ لشکر اسلام اور تحریک طلبہ سوموست کے گروپ پاکستانی حکومت کے خلاف خیبر اور اورکزئی میں ایک دوسرے کی پشت پناہی کرنے لگے۔

تحریک طالبان پاکستان

تحریک طالبان پاکستان نامی اس عسکریت پسند تنظیم کا قیام دسمبر 2007ء میں بیت اللہ محسود کی زیر قیادت عمل میں آیا۔ اس کے قیام کے بعد طالبان نے کرم اور اورکزئی میں اپنی کاروائیاں تیز کر دیں۔ انہوں نے مقامی قبائل پر سخت گیر قسم کی شریعت کا نفاذ کر دیا۔ باغی طالبان نے مقامی سرداروں کو تاوان کے لیے اغوا یا قتل کیا جانے لگا تاکہ مقامی لوگ طالبان کی حکومت کو تسلیم کر لیں۔ تحریک طالبان پاکستان کو زیادہ تر مدد وحمایت وزیرستان، خیبر اور کرم کے درمیان واقع جنوبی وادی تیراہ اور پاکستان کے شمال مغرب کے دیگر قبائلی علاقوں سے ملتی ہے۔ اسی طرح سپاہ صحابہ پاکستان اور کوہاٹ کے علاقے درہ آدم خیل سے لشکر جھنگوی کے افراد بھی ان سے آ ملتے ہیں۔ اورکزئی علی خیل اور ماموزئی کے بعض عسکریت پسند گروپ بھی طالبان کی مدد کرتے ہیں۔

جنوری 2008ء میں کچھ مقامی قبائل نے طالبان کے جنگجوؤں کے خلاف متحد ہونے کی کوشش کی تاہم طالبان نے ان کے خلاف سخت مہم چلائی اور حکومت کی مدد نہ ملنے پر ان قبائل نے بھی گھٹنے ٹیک دیے۔ 2008ء کے اواخر میں اورکزئی میں سنی اکثریت کے علاقوں پر مکمل طور پر طالبان کا کنٹرول تھا۔ دوران پر پاکستانی حکومت کا بہت کم اثر و رسوخ تھا۔ عوام کا دل جیتنے کے لیے طالبان نے جرائم پیشہ عناصر کے خلاف کریک ڈاؤن شروع کیا۔ اس علاقے کے لوگ نااہل اور کرپٹ مرکزی حکومت سے پہلے ہی طویل عرصے سے تنگ تھے۔ اپریل 2008ء میں طالبان نے اورکزئی سے تین اغوا کاروں کو گرفتار کیا اور ان کے خلاف مقدمے چلانے کے لیے انہیں وزیرستان لے گئے۔ اپنی طاقت کو مزید منوانے کے لیے نو مئی 2008ء کو مقامی علماء اور قبائلی رہنماؤں کی شرکت کے ساتھ منعقد کیے گئے جرگے میں ہونے والے فیصلے کے تحت اورکزئی میں لڑکیوں کی تعلیم اور این جی اوز کے کام کرنے پر پابندی عائد کر دی۔ مقامی طالبان نے اغوا کاروں اور ڈاکوؤں کو بھی خبردار کیا کہ وہ طالبان کی شوریٰ کے سامنے پیش ہوں اور اپنے جرائم سے توبہ کریں یا پھر شریعت کے مطابق سخت سزا کے لیے تیار رہیں۔ سرکاری ملازمین کو بھی خبردار کیا گیا کہ وہ ٹھیک ہو جائیں یا سخت سزا کے لیے تیار رہیں۔

اورکزئی میں طالبان کی متوازی حکومت بھرپور طریقے سے کام کر رہی تھی جہاں اس کی اپنی سیکورٹی فورسز علاقے میں گشت کرتی تھیں اور ان کی شرعی عدالتیں انصاف فراہم کرتی تھیں

طالبان کی تحت حکمرانی کی ایک مثال یہاں پر پیش کی جاتی ہے جب ان کی شرعی عدالتوں کی جانب سے سماج دشمن کارروائیوں پر چھ مبینہ اغواکاروں کو سرعام سزائیں سنائی گئیں۔ جولائی 2008ء میں اورکزئی کے دبوری نامی علاقے میں پاکستانی حکومت نے قبائلی عمائدین کے ساتھ ایک امن معاہدہ کیا۔ معاہدے کے تحت طے پایا کہ کسی بھی دہشت گردوں، مجرموں اور پاکستانی حکومت کے خلاف کام کرنے والے دیگر عناصر کو پناہ نہیں دی جائے گی اور بدلے میں پاکستانی حکومت اس علاقے میں فوجی کارروائی نہیں کرے گی۔ تاہم جنوبی وزیرستان میں کیے جانے والے معاہدے کی طرح یہ امن معاہدہ بھی ناکام ہو گیا۔ اکتوبر 2008ء میں علی خیل قبائل کی جانب سے طالبان عسکریت پسندوں کو علاقے سے نکالنے کی حکمت عملی طے کرنے کے لیے پانچ سو افراد پر مشتمل گرینڈ جرگہ ہو رہا تھا کہ ایک خودکش بمبار نے جرگے میں داخل ہو کر خود کو اڑا دیا جس سے 82 افراد ہلاک ہو گئے۔

حکیم اللہ محسود کا ابھرنا

تحریک طالبان پاکستان کے سابق سربراہ حکیم اللہ محسود کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ شمالی وزیرستان میں جنوری 2010ء میں امریکہ کی جانب سے کیے جانے والے ایک مشتبہ ڈرون حملے میں بچ نکلا تھا جبکہ اس کے بارے میں یقین کیا جا رہا تھا کہ وہ مارا گیا ہے لیکن وہ دوبارہ منظر عام پر آ گیا۔ اس نے پشاور سے تعلق رکھنے والے صحافیوں کے ایک گروپ کو اورکزئی میں واقع سینے (؟) الائے پر مدعو کیا اور اعلان کیا کہ وہ اس کے پیش رو بیت اللہ محسود کا جانشین سمجھا جائے۔ اس موقع پر حکیم اللہ محسود نے بتایا کہ بیت اللہ محسود نے اسے اورکزئی، کرم اور خیبر میں تحریک طالبان پاکستان کا سربراہ مقرر کیا ہے اور اس کے پاس آٹھ ہزار لڑاکوں کی فوج ہے۔

حکیم اللہ محسود جنوبی وزیرستان میں کوٹ کئی کے مقام پر 1980ء میں پیدا ہوا اور اس کا تعلق محسود قبائل کی شاخ سے ہے۔ اس نے ہنگو میں دیوبندی مدرسے سے تعلیم حاصل کی تاہم اس نے طالب علم کی حیثیت سے گریجویشن نہیں کی تھی۔ ابتداء میں وہ بیت اللہ محسود کے محافظ اور ڈرائیور کے طور پر کام کرتا رہا تھا۔ تاہم اپنی کرشماتی نوجوان شخصیت کے پیش نظر وہ جلد ہی تحریک طالبان پاکستان کی اوپری صفوں میں شامل ہو گیا۔ پاکستانی سیکورٹی فورسز اور نیٹو کے سپلائی ٹرکوں پر حملوں کی وجہ سے وہ خاص بدنام تھا۔ اگست 2007ء میں حکیم اللہ محسود کے لشکر نے جنوبی وزیرستان سے تین سو پاکستانی فوجیوں کو اغوا کر لیا اور اس وقت تک رہا نہیں کیا جب تک اس وقت

کے پاکستانی صدر نے ان کے بدلے پچیس طالبان لڑاکوں کو رہا کر دیے۔

دسمبر 2008ء میں حکیم اللہ محسود کے لشکر نے بالائی اورکزئی اور زیریں اورکزئی میں شریعت نافذ کر دی اور صرف عورتوں کے بازاروں میں داخلے پر پابندی عائد کر دی۔ ٹی وی اور ڈی وی ڈی کو بھی غیر قانونی قرار دے دیا اور پوری ایجنسی میں شرعی عدالتیں قائم کر دیں۔ اورکزئی کو اپنی اسلامی امارت قرار دیے جانے کے بعد حکیم اللہ محسود نے لگ بھگ ایک صدی سے آباد 63 سکھ خاندانوں پر جزیہ عائد کر دیا۔ اس سلسلے میں ان سے 34 لاکھ کی رقم ادا کی گئی جبکہ جزیہ ادا کرنے میں ناکامی کی وجہ سے کئی سکھ خاندان علاقے سے فرار ہونے پر مجبور ہو گئے۔ تحریک طالبان پاکستان نے کوئلے کی کانوں کی تجارت کرنے والے تاجروں سے بھی بھاری مالیت میں کمیشن لیا۔

حکیم اللہ محسود منگل باغ پر دباؤ ڈال کر آسانی کے ساتھ خیبر ایجنسی میں بھی داخل ہو گیا۔ منگل باغ لشکر اسلام نامی عسکری گروپ کا سربراہ تھا اور تحریک طالبان پاکستان یا ٹی ٹی پی کا مخالف تھا کیونکہ وہ علاقے میں آزادانہ اثر و رسوخ چاہتا تھا۔ اس نے منگل باغ کو خیبر پر کنٹرول رکھنے کی اجازت دی تاہم اس کے بدلے اس نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ ٹی ٹی پی کو نیٹو سپلائی ٹرکوں کو نشانہ بنانے کی اجازت دے جو طورخم کے راستے افغانستان میں نیٹو افواج کو سپلائی پہنچاتے تھے۔ حکیم اللہ محسود نے 2008-2009 کے دوران نیٹو کے چھ سو سے زائد ٹرکوں کو تباہ کرنے اور پشاور کے نواح میں ان کے گوداموں کو نشانہ بنانے کا دعویٰ کیا۔ ان حملوں کی وجہ سے 2008 میں پاکستان نے چھ مرتبہ خیبر میں واقع اس روٹ کو بند کیا جو نیٹو کی ٹریفک کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ پھر حکیم اللہ محسود نے خیبر اور درہ آدم خیل کی طرف سے پشاور شہر پر دباؤ بڑھا دیا اور حملوں کو تیز کرتے ہوئے 2009 میں شہر کا محاصرہ کر لیا۔ تحریک طالبان پاکستان ہنگو میں فرقہ وارانہ تشدد میں بھی ملوث رہی اور کرم ایجنسی کو باقی پاکستان سے کاٹ دیا۔ اورکزئی میں طالبانائزیشن کے عمل کے نتیجے میں علاقے میں فرقہ واریت کو اور بھی فروغ ملا کیونکہ اینٹی شیعہ گروپ جیسے سپاہ صحابہ اور لشکر جھنگوی بھی تحریک طالبان پاکستان میں ضم ہو گئے۔

اورکزئی میں تحریک طالبان پاکستان کا ڈھانچہ کسی حد تک غیر واضح ہے تاہم یقین کیا جاتا ہے کہ مولوی سعید خان اس کا مرکزی سربراہ اور حافظ سعید گروپ کا ترجمان ہے۔ مولوی سعید وزیرستان کے عسکری کمانڈروں میں خاصی عزت رکھتا ہے اور اسے خاصا صاحب علم اور ذہین سمجھا

جاتا ہے۔ مولوی نور جمال جسے مولوی طوفان بھی کہا جاتا ہے وہ بالائی اورکزئی کے علاقے ماموزئی سے ٹی ٹی پی کا لیڈر ہے۔ وہ چالیس کے پیٹے میں بتایا جاتا ہے اور اس کی شہرت ایک ظالم اور بدمزاج انسان کی ہے جو کسی زمانے میں ہنگو کے ایک مدرسے میں استاد تھا۔ اورکزئی ایجنسی کے علاقے فیروز خیل میں تحریک طالبان پاکستان کا کمانڈر اسلم فاروقی ہے۔ اسلم فاروقی جس نے 1999ء میں طالبان لشکر تشکیل دیا اس کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ سپاہ صحابہ سے منسلک ہے جو کہ ایک اینٹی شیعہ گروپ ہے۔ اسلم فاروقی گروپ افغانستان میں طالبان کی کامیابیوں سے متاثر تھا اور چھوٹی چھوٹی کارروائیاں کرتا تھا جو 2001ء تک متحرک رہا لیکن پھر گیارہ ستمبر کے حملوں کے بعد امریکہ کے افغانستان پر حملے کے بعد یہ بھی رفتار کھو بیٹھا۔ تحریک طالبان پاکستان کے زیادہ تر آپریشنل کمانڈروں کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ 2009ء کے اواخر میں پاکستان فوج کے جنوبی وزیرستان میں آپریشن کے بعد انہوں نے اورکزئی میں ہی پناہ لی۔

بتایا جاتا ہے کہ اس علاقے میں جو دیگر گروپ آپریٹ کر رہے ہیں ان میں ایک اور اینٹی شیعہ گروپ لشکر جھنگوی، قاری حسین کی سربراہی میں کام کرنے والا فدائین اسلام (خودکش بمبار پیدا کرنے والا گروپ) اور ملکی و غیر ملکی جنگجوؤں پر مشتمل عبداللہ عظام بریگیڈ شامل ہیں۔

اورکزئی میں القاعدہ اور دیگر غیر ملکی جنگجو

اورکزئی میں زیادہ تر جنگجو باہر سے آئے دکھائی دیتے ہیں اور ان میں بھی زیادہ تر وزیرستان اور درہ آدم خیل سے تعلق رکھتے ہیں تاہم ان میں چھوٹی سی تعداد مقامی جنگجوؤں کی بھی ہے جن کے پاس اس کے علاوہ کوئی آپشن نہیں کہ وہ عسکریت پسندوں کے ساتھ مل کر کام کریں۔ طالبان کو ماموزئی، علی خیل اور فیروز خیل قبائل سے بھاری حمایت حاصل ہے۔ ابتدا میں یہ مقامی قبائل عسکری اسلام میں اپنے یقین سے زیادہ محض فرقہ وارانہ بنیادوں پر طالبان کا ساتھ دے رہے تھے۔

القاعدہ اور ان کے اتحادی غیر ملکی جنگجو جن میں عرب، چیچن اور ازبک اورکزئی کو بالخصوص جنوبی وزیرستان میں پاکستانی فوج کے آپریشن کے بعد، اپنی پناہ گاہ اور لانچنگ گراؤنڈ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ان کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ تحریک طالبان پاکستان ساتھ وہ جنوبی وزیرستان کو چھوڑ کر اورکزئی اور شمالی وزیرستان آ جائیں جہاں وہ علاقائی لشکروں کے سے بڑی شدت کے ساتھ لڑ رہے ہیں۔

پاکستانی فوجی آپریشن

2010 سے پہلے پاکستانی فوج نے اورکزئی میں طالبان کے ٹھکانوں کے خلاف محض دکھاوے کی کارروائیاں کیں جن میں زیادہ تر فضائی حملوں پر انحصار کیا گیا جبکہ بہت کم تعداد میں زمینی دستے استعمال کیے گئے۔ جولائی 2009ء میں گن شپ ہیلی کاپٹروں کے ذریعے اورکزئی کے علاقوں اوبلان اور طور سمچر میں بمباری کی گئی جس میں سات عسکریت پسند مارے گئے۔ نومبر 2009ء میں جنگی طیاروں کے ذریعے زیریں اورکزئی میں طالبان کے ٹھکانوں پر دوبارہ بمباری کی گئی جس میں بارہ عسکری ہلاک جبکہ ان کے زیر زمین اسلحے کے ڈپو تباہ ہو گئے۔ دسمبر 2009ء میں پاکستانی وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی نے اعلان کیا کہ پاکستانی حکومت اورکزئی میں بھرپور فوجی آپریشن کی تیاری کر رہی ہے تاکہ علاقے سے عسکریت پسندوں کا صفایا کیا جا سکے جو خود کو دوبارہ منظم کر رہے ہیں اور پاکستان بھر میں خودکش حملے اور دیگر حملے کر رہے ہیں۔ عسکریت پسندوں پر فضائی اور جزوی زمینی حملوں کے نتیجے میں اورکزئی سے چالیس ہزار سے زائد افراد اپنے گھروں سے بے گھر ہو گئے۔ عسکری کمانڈروں اسلم فاروقی اور رؤف ذم خیل سے طارق آفریدی گروپ سے سیکیورٹی فورسز اور مقامی قبائلی ملیشیاز کے خلاف حملے کیے۔ 30 دسمبر 2009ء میں ایک زمینی اور فضائی حملے میں سیکیورٹی فورسز نے 37 عسکریت پسندوں کو ہلاک کرنے کا دعویٰ کیا جبکہ زیریں اورکزئی کے انجانی نامی علاقے میں بمبی کے چار سپاہی جاں بحق ہو گئے۔

جنوری 2010ء کے اوائل میں طالبان نے زیریں اورکزئی کے علاقے فیروز خیل میں ایک پورا گاؤں نذر آتش کر دیا اور یہ ظالمانہ فعل حکومت کے خلاف طالبان کی حمایت نہ کرنے پر انہیں سزا دینے کے سبب کیا گیا۔ دسمبر 2009ء میں طالبان جنگجوؤں نے متعدد قبائلی عمائدین کو اغوا کر لیا تھا اور مقامی لوگوں کو بے ساختہ علاقے کے لیے مبینہ جاسوسوں کو قتل کیا گیا

وسط جنوری میں جوابی رد عمل کے طور پر پاکستانی سیکیورٹی فورسز نے اورکزئی کو جانے والا مرکزی راستہ بند کر دیا گیا تاکہ علاقے میں ایک بڑی کارروائی کی تیاری کی جائے جس کے بعد فوج نے ایجنسی کے مختلف حصوں میں اضافی چوکیاں قائم کر دیں۔ پاکستانی حکومت کو یہ بھی پتہ چلا کہ ملک کے مختلف شہروں اور علاقوں میں خودکش حملوں کے لیے جو بمبار بھیجے جاتے ہیں ان میں نوے فیصد اورکزئی میں ہی تیار کیے جاتے ہیں جس کے نتیجے میں یہاں پوری طور پر ایکشن لینا پڑا۔ پاکستانی سیکیورٹی فورسز کلایہ کا کنٹرول حاصل کر چکی ہیں جو صف سے زائد زیریں ایجنسی کا

ہیڈکوارٹر ہے تاہم ہزاروں کی تعداد میں عسکریت پسند ہنگو، کرم، خیبر کی سرحدوں پر پوزیشنیں لے چکے ہیں تاکہ اپنے مضبوط ٹھکانے اورکزئی کا دفاع کر سکیں۔ 23 مارچ 2010ء سے ایف سی کے دستے زیریں اورکزئی کے انجانی، ستوری خیل، رابیا خیل، فیروز خیل اور استان خیل میں داخل ہو گئے جہاں انھوں نے اٹھائیس اپریل کو علاقے کو کلیئر قرار دے دیا۔

اب تک سات سو خاندانوں کو علاقے میں واپس بھجوایا جا چکا ہے اور پاکستانی فورسز بالائی اورکزئی کے علاقے ڈبوری میں داخل ہونے کی کوشش کر رہی ہیں جو تاحال تحریک طالبان پاکستان کے کنٹرول میں ہے۔ پاکستانی فوج کا دعویٰ ہے کہ فوجی آپریشن میں اب تک ساڑھے پانچ سو طالبان جنگجو ہلاک ہو چکے ہیں۔ تاہم طالبان ذرائع کا کہنا ہے کہ ان کے صرف سو افراد ہلاک ہوئے۔ کارروائی میں 37 پاکستانی فوجی بھی جاں بحق ہوئے۔ اگست میں ہی کو آرمی چیف اشفاق پرویز کیانی نے اورکزئی کا دورہ کیا اور فوج کی فتح کا اعلان کر دیا۔ تاہم ایجنسی سے دربدر ہونے والے دو لاکھ افراد کو تاحال وہاں پر واپس بھیجا نہیں جا سکا اور ایجنسی میں لڑائی جاری رہی۔ ستمبر کے اوائل میں پاکستانی فوج نے اورکزئی کو ایک بار پھر عسکریت پسندوں سے کلیئر قرار دے دیا اور دعویٰ کیا کہ آپریشن کے دوران چھ سو طالبان مارے گئے ہیں۔

اورکزئی کے لوگوں کی شکایت

اورکزئی کے لوگوں کی شکایات فاٹا کی دیگر آبادی جیسی ہی ہیں جن میں سیاسی اور انتظامی کرپشن، انصاف میں تاخیر اور معاشی پسماندگی وغیرہ شامل ہیں۔ انتظامی سسٹم کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ اس سے قبائلی عمائدین اور سردار ہی فائدہ اٹھاتے ہیں جو سیاسی حمایت فراہم کرنے کے بدلے سرکاری حکام سے رشوت لیتے ہیں۔ مزید برآں یہاں کے لوگ عسکریت پسندوں اور اس کے نتیجے میں پاکستان کے فوجی آپریشن کے حوالے سے بھی تشویش کا شکار ہیں۔ جو افراد 2010ء کے موسم بہار میں کیے جانے والے آپریشن کے نتیجے میں بے گھر ہوئے تھے وہ تاحال علاقے میں واپس آنے پر تیار نہیں۔

راحیل خان امریکی فری لانس صحافی ہیں اور پاکستان میں عسکریت پسندی کے امور پر مہارت رکھتے ہیں۔ وہ مختلف ٹی وی چینلوں پر بطور پروڈیوسر اور فاٹا کے چار سرکاری ریڈیو سٹیشنوں کے ہیڈ ایڈیٹر کی حیثیت میں بھی کام کرتے رہے ہیں۔

غیر ملکی جنگجو

ٹاس ریک ہیمر

1980ء کے بعد اسلامی دنیا میں جاری مسلح تنازعات کی ایک خصوصیت ان میں غیر ملکی جنگجوؤں کا ملوث ہونا ہے جو بغیر معاوضے کے لڑنے والے سپاہی ہیں جن کا تنازعے سے بظاہر اس کے سوا کوئی تعلق نہیں کہ وہ اپنے ہم مذہب مسلمانوں کی مدد کے لیے ایسا کرتے ہیں۔ 1980ء سے کوئی دس ہزار سے تیس ہزار کے درمیان اس قسم کے جنگجو مغرب میں بوسنیا اور مشرق میں فلپائن تک کے علاقوں میں اپنے آپ کو لڑائیوں میں شامل کرتے رہے ہیں۔ غیر ملکی جنگجو اس لحاظ سے اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ وہ اس لڑائی کو متاثر کرتے ہیں جس میں وہ شریک ہوتے ہیں جیسا کہ انہوں نے 2003ء کے بعد عراق میں فرقہ وارانہ تشدد اور دیگر ہتھکنڈوں کے ذریعے کیا۔(1) شاید زیادہ اہم بات یہ ہے کہ غیر ملکی جنگجوؤں کی سرگرمی سے القاعدہ جیسے بین الاقوامی دہشت گرد گروہوں کو طاقت ملتی ہے کیونکہ جب کوئی شخص انفرادی طور پر جنگ میں شامل ہو جاتا ہے تو اس سے آگے چل کر عسکریت پسندی کی مزید انتہائی صورتیں سامنے آتی ہیں۔ مثال کے طور پر جب مغرب میں آباد مسلمان بنیاد پرستی کی طرف جاتے ہیں تو وہ عام طور پر ایک دم اپنے ہی ملک میں دہشت گردی کی منصوبہ بندی نہیں کرتے بلکہ اس کے بجائے پہلے جنگ سے متاثرہ علاقوں جیسے افغانستان اور عراق جاتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ القاعدہ کے لوگوں کی اکثریت نے اپنے عسکری کیریئر کا آغاز رضاکار جنگجوؤں کی حیثیت سے کیا اور اس وقت زیادہ تر بین الاقوامی جہادی گروپ غیر ملکی جنگجوؤں کی سرگرمی کی ہی پیداوار ہیں۔(2) چنانچہ بین الاقوامی اسلامی عسکریت پسندی کو سمجھنے کے لیے غیر ملکی جنگجو بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

غیر ملکی جنگجوؤں کا رجحان کیوں اور کب سامنے آیا؟ آج کل غیر ملکی جنگجوؤں کی موجودگی کو اسلامی دنیا میں جاری لڑائیوں کی پیداوار سمجھ کر صرف نظر کر دیا جاتا ہے تاہم 1980ء سے پہلے طویل عرصے تک غیر ملکی جنگجوؤں کی سرگرمی شاذونادر تھی۔(3) لیکن جب یہ دیکھا جائے کہ جدید اسلام ازم نے انیسویں صدی کے اواخر میں جنم لیا اور یہ کہ اسلامی گروپوں نے 1940ء کی

رہانی میں ہی تشدد کو استعمال کرنا شروع کر دیا تھا اور یہ کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان مسلح تنازعات بیسویں صدی کے پورے عرصے میں پھٹتے رہے ہیں تو یہ بات ایک پہیلی لگتی ہے کہ 1980ء سے پہلے طویل فاصلے کی غیر ملکی جنگجوؤں کی حرکت پذیری یا سرگرمی شاذ و نادر تھی۔ غیر ملکی جنگجوؤں کے ابھرنے کے معاملے کے حوالے سے موجودہ علم ہمیں بہت کم سوالوں کے جواب دے پاتا ہے کیونکہ اس قسم کی حرکت پذیری یا فعالیت پسندی کے بارے میں بہت کم مطالعہ کیا گیا ہے۔ غیر ملکی جنگجوؤں کے انفرادی تنازعات میں ملوث ہونے کے حوالے سے مواد موجود ہے لیکن ان کی موجودگی کے حوالے سے وضاحت کرنے کے لیے کسی قسم کا کراس کیس تجزیہ یا نظری کاوش تقریباً وجود ہی نہیں رکھتی۔(4) ایک نایاب جنگی اپو ڈیمیٹ کی تحقیق کی صورت میں موجود ہے جو کہتے ہیں کہ اس رجحان کے لیے پولیٹیکل سائنس کے لٹریچر میں کوئی ٹھوس اصطلاح موجود ہی نہیں۔ (5)

اس اصطلاح کی عدم موجودگی کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ غیر ملکی جنگجو درمیانے ایکٹرز کے ایک درجے میں آتے ہیں جو کہ ایک ایسا درجہ ہے جو ایک جانب تو مقامی باغیوں اور دوسری جانب بین الاقوامی دہشت گردوں میں مدغم ہو چکا ہے۔ ٹرانس نیشنلزم کے حوالے سے عام خانہ جنگی کا ابھرتا ہوا لٹریچر جلاوطن باغیوں کے بارے میں ہے یا باغیوں کی مدد کرنے والی غیر ملکی ریاستوں کے بارے میں ہے، آزاد عالمی کارکنوں کے بارے میں نہیں۔(6) سوشل موومنٹ لٹریچر نے زیادہ توجہ موتمر الدولی کی جانب دی تاہم اس نے اب تک غیر متشدد دوائی کی طرف توجہ نہیں دی۔(7) اس کا نتیجہ یہ ہے کہ غیر ملکی جنگجوؤں کی متذکرہ دہشت گردی کی جزوی شعبہ جاتی منتقلی تک محدود ہو کر رہ گئی ہے جس اور پہلو اور ترا الفاظ و ہ سے منسلک کر دیا جاتا ہے۔(8) (اگرچہ کئی غیر ملکی جنگجو جہاز جاہ نہیں کرتے لیکن جنگ کے ایک محدود میدان میں سیم فوجی حربے استعمال کرتے ہیں) یہ دو بیرونی فاصلے سے دور ممالک اور شوق کے ہوتے ہیں۔ (9)

اس مضمون کا مقصد سہ جہتی ہے۔ اول، غیر ملکی جنگجوؤں کو دوسرے عسکریت پسندوں اور دہشت گردوں سے ایک مختلف درجے میں ثابت کرنا۔ دوئم مسلم غیر ملکی جنگجوؤں کے بارے میں نئی معلومات فراہم کرنا، اور سوئم اس صورت حال کے اصل کے بارے میں ایک قابل قبول مفروضہ پیش کرنا۔ اس تجزیہ کی بنیاد غیر ملکی جنگجوؤں کی سرگرمی کے حوالے سے ایک نیا ڈیٹا سیٹ، عرب کے ان مجموعے جہادی اور ثانوی ذرائع کا ایک وسیع مجموعہ اور سعودی عرب، اردن، پاکستان، فلسطین

اور سعودی عرب سے تعلق رکھنے والے سابق غیر ملکی جنگجوؤں سے کیے گئے انٹرویو پر ہے۔

مضمون کا سکوپ دو اہم محدودات کا حامل ہے۔ اول، اس کا تصور جاتی فوکس غیر ملکی جنگجوؤں کی سرگرمی کے عمومی میکنزم پر نہیں بلکہ حرکیاتی تشکیل پر ہے۔ میں غیر ملکی جنگجوؤں کے حوالے سے ایک عالمی نظریے کو فارمولیٹ نہیں کرتا اور نہ ہی ان کی بھرتی کی شرح کے حوالے سے کوئی پیش گوئی یا انفرادی بھرتی کے حوالے سے کوئی وضاحت کرتا ہوں۔ دوسرا فوکس مسلم دیوپر ہے۔ مسلم غیر ملکی جنگجوؤں کے حوالے سے سٹڈی ایک خاص اہمیت کی حامل ہے کیونکہ دوسرے مذہب اور نظریات کے غیر ملکی جنگجوؤں کے مقابلے میں مسلمان غیر ملکی جنگجوؤں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور وہ دیگر مذاہب کے غیر ملکی جنگجوؤں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تنازعات کو متاثر کر رہے ہیں۔ مزید یہ کہ ان کی دنیا کے بڑے بڑے تنازعات جیسے افغانستان اور عراق میں ملوث ہونے اور اس کے ساتھ القاعدہ کی بھرتی میں کردار ادا کرنے کے باعث یہ موجودہ دور کی عالمی سلامتی کے حوالے سے خاص طور پر چیلنج کا درجہ رکھتے ہیں۔

میں یہ بھی واضح کر دوں کہ یہ مضمون عمومی طور پر اسلام ازم کے بارے میں نہیں بلکہ ایک مخصوص قسم کی اسلامی حمایت پسندی کے بارے میں ہے۔ اسلام ازم سیاسی طور پر اس حق میں متنوع ہے کہ مختلف اسلامی عمل کار مختلف معیاراتی سیاسی سرگرمیوں میں تخصیصی صلاحیت رکھتے ہیں۔ کچھ مقامی حکومتوں کی پرامن طریقے سے مخالفت کرتے ہیں اور کچھ دہشت گردی کے ذریعے ان کا تختہ الٹنا چاہتے ہیں اور دیگر ایسے ہیں جو غیر مسلم طاقتوں کے قبضے کے خلاف مزاحمت کرتے ہیں۔[10] تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف اقسام کی اسلامی حمایت پسندی برافعال رہی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ شاید ان کا کاز بھی کسی حد تک مختلف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنے تجزیے میں ایسے کئی فیکٹرز کو نظر انداز کیا ہے جن پر کہ اسلامی دینی احیا (Islamic resurgence) کے ابھرنے کے حوالے سے زور دیا جاتا ہے جیسے 1967ء کی جنگ میں عربوں کی شکست، عرب قوم پرستی کا زوال یا ایرانی انقلاب وغیرہ۔ ایسے کئی عوامل جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اسلامی تحریک کے لیے مددگار بنے وہ مسلم غیر ملکی جنگجوؤں کے کی صورت حال کی وضاحت کرنے کے لیے ناکافی دکھائی دیتے ہیں۔[11]

میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ غیر ملکی جنگجوؤں کا کی صورت حال اسلام ازم کی مقبول عام شکل پان اسلام ازم کی ایک نئی ریڈیکل قسم کا پھیلاؤ ہے جو 1970ء کی دہائی میں ابھرا جس کا سبب

حکمران اقلیتی اشرافیہ کی جانب غیر منقسم بین الاقوامی اسلامی تنظیموں میں اٹھائے جانے والے ان کے سٹریٹجک اقدامات تھے۔ سیاسی طور پر منتقل ہوئے اور زیادہ بجٹ کے ساتھ ان کے کارکنوں جن کی بنیادیں زیادہ تر سعودی عرب کے حجاز خطے میں تھیں انہوں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ مسلمان اقوام کو بیرونی خطرات لاحق ہو گئے ہیں۔ انہوں نے خیراتی اداروں کا ایک بین الاقوامی نیٹ ورک قائم کیا تاکہ مسلمانوں کی مدد کی جا سکے۔ حجاز کے پان اسلامسٹوں نے جو اصول اور نیٹ ورک وضع کیے تھے انہوں نے عرب کارکنوں کو اس قابل بنا دیا کہ وہ 1980ء کی دہائی کے افغانستان کے لیے مسلمانوں کی آپسی یکجہتی کے نام پر غیر ملکی جنگجوؤں کو بھرتی کر سکیں۔ عرب افغان سرگرمی سے جنوب میں غیر ملکی جنگجوؤں کی ایک ایسی تحریک تیار کی جو اس وقت بھی موجود ہے جو ایک ایسا رجحان ہے جو القاعدہ سے جزوی طور پر ممتاز ہے۔

حجازی پان اسلامسٹ کمیونٹی اپنے وجود کی وجہ 1960ء کی دہائی میں ہونے والی ایسی تبدیلیوں کو بتاتی ہے جن میں مصر، عراق اور شام میں اخوان المسلمون کے کارکنوں کو دباؤ کا نشانہ بنانا اور جلا وطن کرنا اور بین الاقوامی اسلامی اداروں کا قیام اور سعودی عرب میں متعدد یونیورسٹیوں کا ظہور شامل ہے۔ لوگوں کو جلاوطن کیے جانے کے باعث پڑھی لکھی افرادی قوت کی طلب پوری ہوگئی جس کے نتیجے میں مغربی سعودی عرب کے خطہ حجاز میں وسیع پیمانے پر بین الاقوامی کارکنوں کی کمیونٹی نے سر ابھارا۔ مقامی سیاسی اثر و رسوخ کے محدود امکانات اور بین الاقوامی پیمانے پر کام کے مواقع کے نتیجے میں ان کارکنوں نے پوری لگن کے ساتھ بین الاقوامی یکجہتی اور مخصوص عام پان اسلامازم کے لیے کام کیا۔ 1970ء کی دہائی میں تیل کی دولت، نئی ٹیکنالوجی اور حکومتی نگرانی نہ ہونے نے انہیں نظریاتی طور پر بہت بااثر بنا دیا۔ اس وقت کی حکمران اشرافیہ نے انہیں چھوٹ دے دی اور کسی حد تک ان کی مدد بھی کی کیونکہ انہیں خوف تھا کہ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ان کے بارے میں سمجھا جائے گا کہ انہیں بیرونی دنیا کے پسے ہوئے مسلمانوں سے ہمدردی نہیں ہے۔ قصہ مختصر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جہاد کا بین الاقوامی شکل اختیار کرنا اشرافیہ کی مسابقت کا ایک عمل ہے۔

مضمون چار مراحل میں آگے بڑھتا ہے۔ اس میں "غیر ملکی جنگجوؤں" کی اصطلاح کی وضاحت کرتا ہوں جس کے لیے میں ان کی سرگرمی کے تاریخی ریکارڈ کو پیش کرتا ہوں اور غیر ملکی جنگجوؤں کی حمایت کی کیٹیگری کو وسیع کرتا ہوں۔ پھر اگلے مرحلے میں میں اپنے معاملاتی استدلالات کے سلسلے میں پانچ وضاحتوں کا جائزہ پیش کروں گا جس میں میں تنازعاتی ڈھانچے اور غداری کے

خانے، حکومتی رکاوٹوں، کیمونیکیشن ٹیکنالوجی اور اسلام ازم کے ارتقاء پر روشنی ڈالوں گا۔ اس کے بعد میں غیر ملکی جنگجوؤں کے لشکروں کے درمیان ادارہ جاتی اور نظریاتی تعلق کا جائزہ لیتا ہوں، جس سے پتہ چلتا ہے کہ زیادہ تر سرگرمیاں ایک ہی نظریاتی تحریک کا حصہ ہیں جو کہ 1980ء میں ابھری تھی۔ چہارم اور سب سے آخری مرحلے میں میں 1980ء کی دہائی میں افغانستان میں غیر ملکی جنگجوؤں کی تحریک کی تشکیل کا جائزہ لیتا ہوں۔

غیر ملکی جنگجوؤں کی صورت حال

تین حصوں پر مشتمل یہ حصہ غیر ملکی جنگجوؤں کے تصور کی وضاحت کرتا ہے اور ان کی سرگرمی کے اعداد و شمار پیش کرتے ہوئے اس پہیلی کو واضح کرتا ہے جو اس مضمون میں پیش کی گئی ہے۔

تعریف

ڈیوڈ میلیٹ غیر ملکی جنگجوؤں کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے۔ "لڑائی میں شریک ریاستوں کے غیر شہری افراد جو کہ سول تنازعات کے دوران دراندازی میں شامل ہوتے ہیں (2)"۔ میں اس فارمولیشن کی بنیاد پر جنگجوؤں کی تعریف ان الفاظ میں کروں گا

اول۔ یہ افراد جو لڑائی میں شامل ہو جاتے ہیں اور خود کو ایک مخصوص حد کے اندر رکھتے ہیں۔

دوئم۔ جو لڑائی میں شریک ریاست کے شہری نہیں ہوتے اور نہ ہی ان کا لڑائی میں شریک گروہوں سے کوئی رشتہ داری تعلق ہوتا ہے۔

سوئم۔ ان کا سرکاری فوجی اداروں سے تعلق نہیں ہوتا۔

چہارم۔ انہیں کسی قسم کی تنخواہ نہیں دی جاتی۔

یہ چاروں چیزیں غیر ملکی جنگجوؤں کو دیگر اقسام کے متشدد گروہوں سے ممتاز کرتی ہیں جو کہ سرحد پار کر کے آتے ہیں۔ چوتھا نکتہ انہیں کرائے کے فوجیوں سے جدا کرتا ہے جنہیں تنخواہ دی جاتی ہے اور جو اس کے ساتھ جاتے ہیں جو سب سے زیادہ پیسے دے۔ تیسرا نکتہ انہیں فوجیوں سے الگ کرتا ہے جنہیں تنخواہ دی جاتی ہے اور جو سرکار کے حکم پر لڑائی میں جاتے ہیں۔ تیسرا نکتہ انہیں بیرون ملک میں مقیم شہریوں اور جلاوطن باغیوں سے الگ کرتا ہے جن کا ریاستوں کے درمیان لڑائی میں مشترک ہوتا ہے۔ یہ فرق بہت اہمیت کا حامل ہے کیونکہ لڑائی سے کسی قسم کا نسلی یا رشتہ داری تعلق سرگرمی کو قابل ذکر حد تک بڑھا دیتا ہے (3)۔ اب پہلا نکتہ ہے جو غیر ملکی جنگجوؤں کو

بین الاقوامی دہشت گردوں سے منسلک کرتا ہے جو کہ آؤٹ آف ایریا جا کر ان افراد کو بھی نقصان پہنچانے میں مہارت رکھتے ہیں جو کہ لڑائی میں شریک نہیں ہوتے۔ اس امتیاز کا بہت کم خیال رکھا جاتا ہے اور عسکری اسلام ازم پر اکثر تحقیقات میں بین الاقوامی عسکریت پسندوں کو بیان کرنے کے لیے عام اصطلاح جیسے کہ جہادی یا سلفی جہادی استعمال کی جاتی ہے چاہے وہ کسی مغربی دارالحکومت میں خودکش حملہ ہو یا کسی جنگ زدہ علاقے میں مارا گیا ہو۔(14) حقیقت میں، اکثر غیر ملکی جنگجو آؤٹ آف ایریا کارروائیوں میں کبھی ملوث نہیں ہوتے اور صرف جنگ زدہ علاقے تک ہی محدود رہتے ہیں۔

غیر ملکی جنگجو ایک دوسرے سے دو طرح سے مختلف ہوتے ہیں جن میں ایک ان کے ریاستی سرپرستی کی سطح اور دوسری بین الاقوامی بھرتی میں ان کی رسائی ہوتا ہے۔ اگرچہ غیر ملکی جنگجو ریاستی نہیں ہوتے تاہم انہیں کسی نہ کسی شکل میں ریاست کی مدد حاصل ہوتی ہے۔ بہت سی تاریخی رضاکار فورسز مؤثر قسم کی بے قاعدہ فوجیں ہوتی ہیں جنہیں ریاستوں کی جانب سے تشکیل کیا جاتا ہے تاکہ ان کے ذریعے کارروائیوں میں لچک حاصل کی جا سکے یا ان سے انکار کا حق بھی حاصل رہے۔ مثال کے طور پر 1948ء کی عرب اسرائیل جنگ میں شریک پانچ ہزار ارکان پر مشتمل آرمی آف سالویشن جسے عرب لیگ نے تیار کیا تھا اور وہی اس کو پیسے دیتی تھی اور جسے تربیت اور قیادت عراقی اور شامی فوجی افسران فراہم کرتے تھے اور اس کو جزوی طور پر تنخواہوں کی ادائیگی کی جاتی تھی۔(15)

اسی طرح ہسپانوی خانہ جنگی میں شریک انٹرنیشنل بریگیڈز شاید رضاکار فورسز تھیں تاہم انہیں کسی نہ کسی طور پر براہ راست سوویت یونین کی مدد حاصل تھی۔ 16 اگرچہ ریاستی پشت پناہی کا تعلق اس کے درجے سے ہے تاہم ملکی اور ریاستی امدادی سرگرمی کے درمیان امتیاز آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ میں ایک ایسی سرگرمی کو ریاستی امداد کی حامل قرار دوں گا جس میں کسی حکومتی ادارے کی جانب سے غیر ملکی جنگجوؤں کو مادی امداد دی جا رہی ہو۔

مزید برآں کچھ غیر ملکی جنگجو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ غیر ملکی ہوتے ہیں۔ کسی تنازعے میں کتنی اقوام کے لوگ شریک ہیں اور اس کے لوگ کہاں کہاں سے کتنا فاصلہ طے کر کے آئے ہیں اس میں خاص فرق ہوتا ہے۔ کچھ تنازعات میں دنیا بھر سے لوگ شریک ہو جاتے ہیں جبکہ دیگر تنازعات میں آس پاس کی ریاستوں کے ہی کچھ لوگ شریک ہوتے ہیں۔ 1948ء کی

عرب اسرائیل جنگ میں یہودی رضاکاروں کی شرکت بین الاقوامی لشکر کی ایک مثال ہے جس میں شریک یہودیوں کا تعلق چاروں براعظموں سے تھا۔[17] اس کے برعکس شمالی افریقہ میں 1950ء کی دہائی کی سامراج مخالف جنگ میں صرف آس پاس کے اسلامی ملکوں کے لوگ شریک ہوتے تھے۔ اس طرح جغرافیائی رسائی کا تعلق بھی اس کے درجے سے ہے تاہم اس میں سادگی پیدا کرنے کے لیے میں ان کے درمیان بین الاقوامی اور علاقائی غیر ملکی جنگجوؤں کی سرگرمی کا امتیاز قائم کروں گا۔ علاقائی غیر ملکی جنگجو میرے مطابق وہ ہوں گے جو کہ جنگ زدہ علاقے سے ملحق ممالک سے تعلق رکھتے ہوں گے۔ یہ مضمون بین الاقوامی اور نجی غیر ملکی جنگجوؤں کی حرکت پذیری پر فوکس کرتا ہے کیونکہ یہ آپ کو زیادہ محدود رکھتے ہیں اور یوں اپنی صورت حال کے اعتبار سے زیادہ بڑی پہیلی کا درجہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ میں ان معاملات کے حوالے سے زیادہ تشویش کا شکار ہوں جن میں مختلف ملکوں سے تعلق رکھنے والے مسلمان براہ راست ریاستی امداد کے بغیر طویل فاصلے طے کر کے دیگر مسلمانوں کے شانہ بشانہ جنگ میں شریک ہوتے ہیں۔

اعداد و شمار

غیر ملکی جنگجوؤں کی صورت حال کے تشکیل اور پھیلاؤ کا جائزہ لینے کے لیے میں نے مسلم دنیا میں 1945ء سے 2009ء کے درمیان ہونے والی بڑی بڑی اندرونی لڑائیوں اور بین الریاستی جنگوں کی فہرست کو جمع کیا اور ان میں غیر ملکی جنگجوؤں کی شرکت کے بارے میں متعلقہ ثانوی اور بنیادی ذرائع سے معلومات حاصل کیں۔[18] بڑے بڑے تنازعات کے بارے میں مکمل فہرست کو جمع مجموعوں اور ڈیٹا بیسز کی فہرست کو ضم کر کے تیار کیا گیا۔[19] اوپر پیش کیے گئے ڈیٹا سیٹ بالترتیب 2003 اور 1996ء میں ختم ہوتا ہے جبکہ بعد کے سالوں کے لیے میں نے ایسے تنازعات کو شامل کیا ہے جن کی خصوصیت جیسا کہ میڈیا میں ان کے بارے میں رپورٹ ہوا انہی شرائط سے ملتے تھے جو کہ دو تشکیل شدہ سیٹوں میں تھے۔ حتمی فہرست میں 1945ء کے بعد مسلم دنیا کے تمام تنازعات کو شامل نہیں کیا گیا لیکن یہ میری جانب سے غیر ملکی جنگجوؤں کی تعریف سے مطابقت رکھتے ہیں کہ جنہوں نے بڑی بڑی تعداد میں شرکت کی۔[20] عالمی سطح پر غیر ملکی جنگجوؤں کی حرکت پذیری کے حوالے سے بہت کم مشہور کیسز ہوں گے جو کہ اس فہرست میں شامل نہیں۔[21]

1945ء کے بعد سے مسلم دنیا میں 70 مسلح تنازعات میں سے اٹھارہ تنازعات ایسے

تھے جن میں عالمی سطح پر غیر ملکی جنگجوؤں کے لشکروں نے شرکت کی۔ جغرافیائی طور پر یہ واقعات تین براعظموں میں پیش آئے اور زیادہ تر مسلم دنیا کی حدود میں وقوع پذیر ہوئے۔ سولہ لشکر 1980ء کے بعد حرکت میں آئے جن میں ایک 980 ء کی دہائی میں، دس 1990ء کی دہائی میں اور پانچ 2000ء کی دہائی میں حرکت میں آئے۔ اس کے برعکس صرف دو لشکر 1980ء سے پہلے حرکت میں آئے جبکہ 960 ء سے پہلے کوئی بھی حرکت میں نہیں آیا۔ ان لشکروں میں شامل ہونے والوں کے بارے میں کوئی قابل بھروسہ اعداد و شمار موجود نہیں تاہم اعداد کی تقسیم کاری دو مثالیں ہے جن میں پانچ واقعات میں ایک ہزار لڑاکوں جبکہ تیرہ واقعات میں تین سو سے بھی کم لڑاکوں نے شرکت کی۔ دو واقعات میں چار ہزار جنگجوؤں نے شرکت کی جو کہ افغانستان اور عراق کے میدان جنگ میں گئے۔(22) تمام واقعات میں ایک چیز مشترک ہے کہ ان میں جنگجوؤں کی کل تعداد میں غیر ملکی جنگجوؤں کا تناسب بہت کم تھا۔ جس لڑائی میں سب سے زیادہ غیر ملکی جنگجوؤں نے شرکت کی وہ غالباً عراق کی لڑائی تھی جہاں پانچ فیصد جنگجو غیر ملکی تھے۔ (23) عرب دنیا خصوصی طور پر سعودی عرب عمومی طور پر ان حملوں میں شامل تھا جن کے جنگجو غالب ترین تعداد میں تھے ماسوائے 980ء کی افغانستان کی لڑائی کے جس میں بڑی تعداد میں ایشیائیوں نے بھی شرکت کی۔ عرب ذرائع سے رپورٹ کی جانے والی رپورٹوں میں ممکنہ طور پر جانبداری ہو سکتی ہے لیکن مسلم غیر ملکی جنگجوؤں کی صورت حال کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ یہ غالب حد تک عرب ہے۔(24)

محل وقوع میں دو نکات کے بارے میں مزید وضاحت کی ضرورت ہے کیونکہ یہ روایتی دانش سے متضاد ہیں۔ اول، میں نہیں سمجھتا کہ 1948ء کی عرب اسرائیل جنگ کے سلسلے میں عرب حرکت پذیری عالمی پائی تھی کیونکہ زیادہ تر جنگجو ریاستی حمایت یافتہ "دی آف سالویشن" کے جنگجو اور مصر تھے جبکہ جو ممبر نہیں تھے جیسے مصری اخوان المسلمون ان کا تعلق واحد ہمسایہ ملک سے تھا۔ دوم 1980ء کی افغان لڑائی کی حرکت پذیری کو میں نئی سمجھتا ہوں۔ غیر ملکی جنگجوؤں کو فعال ریاستی حمایت کی بجائے خفیہ حمایت حاصل تھی۔ یہ امتیاز زبردست اہمیت کا حامل تھا کیونکہ موخر الذکر کیس حرکت پذیری کے لیے کافی جواز رکھتا تھا جبکہ اول الذکر کیس میں بھی کسی حد تک حرکت پذیری ضروری تھی۔ 1980ء کی دہائی میں عربوں افغانوں کی فعال ریاستی پشت پناہی کا تصور وسیع پیمانے پر فضا میں پائی تھی جس نے متعلقہ عام "جو بیک تھیوری" کو ابھارا تھا جس کے مطابق عرب افغان

حرکت پذیری (اور بعد میں القاعدہ کی شکل میں اس کی توسیع) امریکہ اور سعودی عرب کی تخلیق تھی جو بعد ازاں اپنے آقاؤں پر ہی پلٹ پڑی۔[25] یہ غلط تھی ایک جانب افغان مجاہدین اور دوسری جانب غیر ملکی جنگجوؤں کی اصطلاح سے پھوٹی تھی اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ چونکہ ریاست افغانوں کو مسلح کر رہی تھی اس لیے وہ عربوں کو بھی مسلح کر رہی تھی۔[26] امریکہ اور سعودی عرب نے افغان مجاہدین کو قابل ذکر حد تک مالی، لاجسٹک اور فوجی امداد فراہم کی تھی۔[27] اس بات کے کسی قسم کے شواہد موجود نہیں کہ عرب افغانوں کو منظم اور براہ راست ریاستی مدد حاصل تھی۔[28] خلیجی ریاستوں اور مغربی حکومتوں نے اگرچہ غیر ملکی جنگجوؤں کی بھرتی پر چپ سادھے رکھی لیکن انہوں نے نہ تو ان کو منظم کیا اور نہ ہی ان کے لیے کوئی پیسہ دیا۔ غیر ملکی جنگجوؤں کو نجی عطیات دہندگان اور غیر حکومتی اسلامی عطیاتی اداروں کی طرف سے پیسہ دیا گیا۔ سب سے فعال ریاستی امداد سعودی عرب کی جانب سے اس شکل میں دیکھنے میں آئی کہ ریاست کی جانب سے سعودی عرب سے پاکستان کی طرف سفر کے لیے رعایتی ٹکٹ میں سب سڈی دی گئی لیکن ایسا صرف 1980ء کی دہائی کے اواخر میں کیا گیا جس کا فائدہ امدادی کارکنوں اور ساتھ ہی رضاکار جنگجوؤں کو بھی ہوا۔[29] اس کے علاوہ یہ بات بھی خلاف عقل دکھائی دیتی ہے کہ کہا جائے کہ کسی تیسری ریاست نے بین الاقوامی بے قاعدہ جنگجوؤں کی تشکیل دی کیونکہ افغان مجاہدین سوائے افرادی قوت کے ہر چیز میں کمزور تھے جبکہ زیادہ عرب جنگجو بھی غیر تجربہ کار جنگجو تھے۔

معمہ

مسلم غیر ملکی جنگجوؤں کا معاملہ دو معمے پیش کرتا ہے: افرادی شرکت اور تاثیر۔ در حقیقت میں اول الذکر کے بارے میں مختصر بات کرتے ہوئے موخر الذکر پر توجہ مرکوز کروں گا۔

یہ مضمون بھرتی کی سپلائی سائیڈ کی طرف فوکس نہیں کرتا لیکن انفرادی شرکت کی اصطلاح کے بارے میں مختصر جائزہ غیر ملکی جنگجوؤں کی فعالیت کی خصوصیت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ کوئی کسی دوسرے کی جنگ لڑنا کیوں چاہے گا؟ کوئی کہہ سکتا ہے کہ جنگ میں شرکت کا نقصان اس قدر زیادہ نہیں جتنا سمجھا جاتا ہے۔ 1980ء کی دہائی کی افغان جنگ میں غیر ملکی جنگجوؤں کی موت کی شرح بہت کم (دو سے چھ فیصد کے درمیان) تھی[30] اور اوسطاً ایک دورہ اس قدر مختصر ہوتا تھا کہ جہاد کے رضاکاروں کو "سیاح" قرار دیا جاتا تھا۔[31] اس کے بعد کی بعض لڑائیوں میں اموات

کی شرح زیادہ تھی۔ مثال کے طور پر 1990ء کے اواخر میں لڑائی کے لیے بھیجے جانے والوں میں سے بہت کم زندہ واپس آ سکے۔(32) جنگ زدہ تمام علاقوں میں زخمی ہونا بھی عام تھا۔

ان تنازعات کے سیاسی یا مادی نتائج سے متعلق معروضی شکایات اس رویے کے حوالے سے ایک غیر مکمل وضاحت ہے۔ زیادہ تر غیر ملکی جنگجو جن ملکوں میں لڑائی کے لیے جاتے تھے وہاں کے واقعات سے وہ زیادہ متاثر نہیں ہوتے اور مقامی دراندازوں کو عوامی طور پر جو سہولیات دی جاتی تھیں وہ غیر ملکیوں کے لیے نہیں ہوتی تھیں۔ علاقائی حرکت پذیری (پاکستانیوں کا افغانستان جانا) میں معروضی شکایات کا کوئی کردار رہو لیکن عالمی حرکت پذیری میں نہیں (سعودی عرب کے لوگوں کا بھیجا جانا)۔ دیگر وطنوں کے اپنے ممالک میں پائی جانے والی شکایات بھی ایک غیر مکمل وضاحت ہے کیونکہ دیگر رضاکار مختلف ممالک سے آئے اور انہوں نے مختلف اوقات میں جنگ میں شرکت کی۔ غیر ملکی جنگجوؤں کے حوالے سے تحقیقات بھرتیوں کے حوالے سے معاشی عوامل کو شناخت کرنے میں ناکام رہی ہیں۔(33)

مادی چندہ و مراعات بھی کوئی ایسی قابل اطمینان صورت حال پیش نہیں کر سکیں۔ اس بات کے کسی قسم کے شواہد موجود نہیں کہ رضاکاروں کو ان کی خدمات کا کوئی معاوضہ دیا جاتا ہے۔(34) مال غنیمت ہاتھ آنے کے امکانات بھی بہت کم ہوتے ہیں کیونکہ زیادہ تر جنگیں عرب ملکوں میں ہوتی ہیں جہاں غیر ملکی جنگجوؤں کے مقابلے میں مقامی جنگجوؤں بھاری تعداد میں ہوتے ہیں۔ فتح کی صورت میں غیر ملکیوں کو اقتدار میں حصہ ملنے کی بھی کوئی امید نہیں ہوتی۔ عرب ملکوں سے تعلق رکھنے والے بہت تھوڑی تعداد میں جنگجوؤں کو تحفظ کی سہولت دستیاب ہوتی ہے، اکثریت کو نہیں، جو اس سے پہلے غیر متحرک تھے اور پرامن ملکوں سے آئے تھے۔ مہم جوئی کا شوق بھی ممکنہ طور پر ایک فیکٹر ہو سکتا ہے لیکن یہ بات غیر واضح ہے کہ اس قسم کی سرگرمی میں ہی مہم جوئی کا شوق کیونکر پورا کیا جا سکتا تھا۔

مسلم غیر ملکی جنگجوؤں کے معاملے کو سمجھنے کے لیے کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ قومیت کے وسیع تر تصور کے حوالے سے کوئی عنصر یا غیر مادی مراعات کا کوئی عنصر ہو سکتا ہے (جیسے سماجی رتبہ یا آخرت میں انعام) یا یہ دونوں بھی ہو سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کوئی اعتقاد یا کوئی نظریہ۔(35) نظریاتی حوالے سے بات کی جائے تو اس میں ایک دوسرا مسئلہ سر اٹھاتا ہے جو کہ ایک مرکزی مسئلہ ہے۔ اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ غیر ملکی جنگجوؤں کی حمایت کا تعلق مسلمانوں کے درمیان

جنگجوئی کے حوالے سے کسی قسم کے منفرد یا عقیدے سے تعلق رکھتا ہے تو اس سوال کا جواب کون دے گا کہ 1980ء کی دہائی سے پہلے طویل 6 عشرے کی مسلم غیر ملکی جنگجوؤں کی تعداد لگ بھگ وجود کیوں نہیں رکھتی تھی؟ حیرت ہے کہ کسی سکالر نے اس سوال پر اس سے پہلے گہرائی کے ساتھ غور نہیں کیا۔ بہت سی تحقیقات اور مطالعات میں مسلم غیر ملکی جنگجوؤں کے معاملے کو 1980ء کی دہائی کی افغان جنگ کی پیداوار سمجھا جاتا ہے اور یہ سوال کوئی نہیں پوچھتا تھا کہ آخر یہ لوگ سیدھے افغانستان ہی کیوں جاتے تھے۔

غیر ملکی جنگجوؤں کے حوالے سے ہیگ ہیمر کی تھیوری جو کہ اب تک سامنے آنے والی واحد تھیوری ہے اس میں اس مسئلے کا کوئی جواب نہیں۔ ہیگ ہیمر کا کہنا ہے کہ جنگجوؤں کی بین الاقوامی بھرتی اس وقت عمل میں آتی ہے جب مقامی جنگجو جنگ کے دائرے کو وسیع کرنا چاہتے ہیں تاکہ وسائل میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی فتح کے امکانات کو بھی بڑھا سکیں۔[36] تاہم وہ اس بات کی وضاحت نہیں کرتا کہ کچھ مقامی جنگجو غیر ملکیوں کی توجہ حاصل کرنے میں کس طرح کامیاب ہو جاتے ہیں اور کچھ کیوں اس میں کامیاب نہیں ہوتے۔ مزید یہ کہ اس کا بنیادی مفروضہ کہ مقامی جنگجو حرکت پذیری کو شروع کرتے ہیں مسلم غیر ملکی جنگجوؤں کی حرکت پذیری کے حوالے سے شواہد کے ساتھ اس کو پیش نہیں کرتا جن میں زیادہ تر مقامی بغاوت یا لڑائی سے غیر متعلق ہوتے ہیں کیونکہ غیر ملکی جنگجوؤں کی بھرتی اور اس کا انتظام بھی اکثر غیر ملکیوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے مقامیوں کے ہاتھ میں نہیں۔ دوردراز اکثر بین الاقوامی مسلم برادری سے مالی اور سیاسی مدد کی اپیل کرتے ہیں اور بہت کم ہی جنگجوؤں کا مطالبہ کرتے ہیں۔[37] غیر ملکی جنگجو لگ بھگ مدعو کیے بغیر ہی جنگ کے میدانوں میں جاتے ہیں۔

توجیہات

اس حصے میں، میں کیسز کی تاریخ وار تقسیم کاری کے لیے پانچ وضاحتوں پر غور کروں گا۔ پہلی چار میں برداشت میں تبدیلیوں پر فوکس کیا جائے گا۔ پانچویں میں محرکات میں ایک تبدیلی پر فوکس ہوگا۔ کثیر کیسز میں زیادہ وضاحت کے ساتھ بات کرنے کے لیے اعداد و شمار دستیاب نہیں۔

تنازعاتی ڈھانچہ

پہلا مفروضہ یہ ہے کہ غیر ملکی جنگجو صرف کچھ اقسام کی لڑائیوں میں شریک ہوتے ہیں

مثال کے طور پر یمن اور جیسی لڑائیاں، بہت زیادہ خونریز لڑائیاں اور کئی غیر ملکی جارحیت والے واقعات۔۔۔۔اور اس قسم کی جنگیں 1980ء کے بعد سے زیادہ عام ہو گئی ہیں۔

مشہور واقعات اور ان میں شریک رضاکاروں کے گروہوں پر ایک مختصر نگاہ ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ لڑنے والے فریقین میں مذہبی اختلاف بہت زیادہ اہم ہے۔ اسی طرح کی ایک مختصر نگاہ اگر 1945ء کے بعد مسلم دنیا پر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ 1980ء سے پہلے مذہبی اختلاف والی بہت سی لڑائیاں موجود تھیں بالخصوص انڈونیشیا، فلسطین، کشمیر، ملائشیا، قبرص، مراکش، الجزائر، فلپائن، اوگادن، سوڈان اور قبرص وغیرہ۔ مزید براں چند ایسے مواقع بھی تھے جب مذہبی اختلاف کے باوجود غیر ملکی جنگجوؤں نے تنازعات میں شرکت کی جیسے تاجکستان، الجزائر اور 1990ء کے بعد افغانستان میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مذہبی فرق غیر ملکی جنگجوؤں کی حرکت پذیری کے امکانات اور اس کی شدت پر یقینی طور پر بہت اثر انداز ہوتا ہے تاہم یہ غیر ملکی جنگجوؤں کی حرکت پذیری کی نہ تو ضروری اور نہ ہی کافی وجہ ہے۔

اس مفروضے کی ایک دوسری قسم کے مطابق تنازعے کی شدت بھی اہمیت کی حامل ہے۔ تاہم اس کی تصدیق مشکل ہے۔ جنگوں میں اموات کے اعداد و شمار بہت پیچیدہ اور جزوی حد تک متنازعہ ہوتے ہیں اور جنگ کی اموات سے شہریوں کی تکلیف کی عکاسی بھی نہیں ہوتی۔ دستیاب اعداد و شمار سے جنگی اموات اور غیر ملکی جنگجوؤں کی شرکت کے درمیان واضح باہمی تعلق کا پتہ نہیں چلتا۔ الجزائر کی جنگ آزادی (جس میں غیر ملکی جنگجوؤں کی حرکت پذیری نہیں تھی) ان تنازعات سے کہیں زیادہ خونریز تھی جو 1990ء اور 2000ء کی دہائی کے بعد ہوئے اور جن میں غیر ملکی جنگجوؤں نے شرکت کی۔ 980ء کی دہائی کی افغان جنگ بھی پہلے کے کئی تنازعات سے زیادہ خونریز تھی تاہم ایران عراق جنگ سے کم مہلک تھی جس میں کسی قسم کی غیر ملکی جنگجوؤں کی سرگرمی نہیں ہوتی تھی۔ کوئی بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ افغانستان، ایران عراق اور عمان کے تنازعات میں کل جو اموات ہوئیں وہ غیر ملکی جنگجوؤں کی حرکت پذیری کی وجہ نہیں کیونکہ اندازوں کے مطابق 980ء کی دہائی میں ہونے والے ان تنازعات میں کل جنگی اموات ہوئیں (صرف 1982ء میں 165000) وہ گذشتہ عشروں میں ہونے والی لڑائیوں سے زیادہ تھیں۔ یہ خاصی حد تک غیر ملکی جنگجوؤں کی صورت حال کی ایک بڑی وجہ ہے۔

تنازعاتی ڈھانچے کے اس مفروضے کی تیسری قسم اس علاقے کا سیاسی مرتبہ ہے جہاں

لڑائی ختم ہو چکی ہے۔ 950، اور 1960ء کی دہائی میں مسلم دنیا میں ہونے والے زیادہ تر تنازعات غیر ملکی سامراج سے آزادی کی جنگ تھے جبکہ اس کے بعد جو کئی تنازعات ہوئے وہ ان ملکوں میں ہوئے جو پہلے ہی آزاد تھے۔ ہو سکتا ہے کہ آزاد ملکوں کی جانب سے آزاد ملکوں کے خلاف جارحیت کو وسیع تر مسلمان برادری نے جارحیت کے زیادہ ڈرامائی انداز میں دیکھا ہو اور غیر ملکی جنگجوؤں نے اس میں زیادہ کشش محسوس کی ہو۔ اس نکتے کے حوالے سے ایک اور بات کی جا سکتی ہے کہ چونکہ 1980ء کی دہائی کا افغانستان پہلا مسلمان ملک تھا جسے غیر مسلم ملک کی جانب سے جارحیت کا نشانہ بنایا گیا تھا اور یہ کہ اس کے بعد دو مزید بڑے حملوں یعنی 2001ء میں افغانستان اور 2003ء میں عراق پر قبضے کے بعد بالترتیب چوتھی اور دوسری سب سے بڑی غیر ملکی جنگجوؤں کی حرکت پذیری کو جواز بخشا۔ 990 اور 2000ء کے بعد تحریک پذیریوں کی اکثریت ایسی جنگوں کے حوالے سے تھی جس کو کسی ملک کا قبضہ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے برعکس بوسنیا، تاجکستان، چیچنیا اور کوسوو کے تنازعات کو خالص تجزیاتی طور پر دیکھا جائے تو وہ افغانستان اور عراق کے مقابلے میں سامراج کے خلاف جنگ سے زیادہ مطابقت رکھتے تھے۔ آخر میں یہ کہ یہ بات بھی واضح نہیں کہ سامراج مخالف جدوجہد میں غیر ملکی جنگجوؤں نے کشش کیوں محسوس نہیں کی تھی جبکہ دیکھا جائے تو یہ جدوجہد بھی بنیادی طور پر کسی مسلم ملک کے علاقے کو آزادی دلانے کی جدوجہد ہی تھی، سوائے اس بات کہ ابتدائی قبضہ اس وقت سے بہت پہلے کیا گیا تھا۔ اس کے برعکس یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ 1950ء کی دہائی کے بعد آزاد مسلمان ملکوں کی تعداد میں اضافے کے نتیجے میں بین الاقوامی حمایت کے مقابلے میں مقامی قوم پرستی کی تحریکوں میں زیادہ وسعت ہوا۔

جنگجوؤں کا خاکہ

دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ غیر ملکی جنگجو صرف ان تنازعات میں شریک ہوتے ہیں جہاں مقامی جنگجو مخصوص خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں (جیسے سلفی نظریہ) یا ان کے پاس موجود وسائل (دیگر ممالک سے پہلے سے موجود تعلقات)۔ اسلام سے تعلق رکھنے والے بہت سے تنازعات کو دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے انہوں نے غیر ملکی جنگجوؤں میں کشش پیدا کی اور یہ قیاس کرنا مناسب ہوگا کہ خانہ جنگیوں میں مذہب کا بڑھتا ہوا کردار یا قوم پرست جدوجہد کی اسلامائزیشن نے بھی غیر ملکی جنگجوؤں سے تنازعات میں اضافہ کیا۔[79] تاہم بہت سے واقعات (اواخر 960ء کی دہائی میں فلسطین، اواخر 970ء کی دہائی میں لبنان، 990ء کی دہائی میں صومالیہ، بوسنیا، چیچنیا

اور کوسووو) غیر ملکی جنگجو بہت سی لڑائیوں میں شرکت کرتے رہے ہیں جو خالص اسلامی نوعیت کی نہیں تھیں۔ مزید اہم یہ ہے کہ یہ سوچ لینا بھی غیر مناسب نہیں کہ بعض لڑائیوں سے ایک ایسا اسلامی لبادہ اوڑھ لیا تاکہ غیر ملکی مسلم دنیا کی حمایت حاصل کی جا سکے۔(40) آخر میں یہ کہ تنازعات کی اسلامائزیشن اور غیر ملکی جنگجوؤں کے ابھرنے دونوں کے پیچھے ایک کو فنڈ کر دینے والی صورت حال بھی ہو سکتی ہے۔

جنگجوؤں کے خاکے کے حوالے سے ایک اور متاثر کر دینے والا مفروضہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جنگجوؤں کے عرب دنیا میں اسلامی برادری سے پہلے سے موجود تعلقات بھی غیر ملکی جنگجوؤں کی شرکت کی بڑی وجہ ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر اکثر افغان مجاہدین لیڈر 1960ء کی دہائی میں مصر کی اسلامی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کر چکے تھے جس سے ممکنہ طور پر افغانستان میں عربوں کے ملوث ہونے کی بنیاد پڑی۔(41) اعداد و شمار کی قلت کے باعث اس مفروضے کو ثابت کرنا بہت مشکل دکھائی دیتا ہے تاہم بہت سی واقعاتی شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ 1980ء کی دہائی کے کئی مشہور تنازعات جیسے [illegible] وغیرہ میں جنگجوؤں کے عرب دنیا میں پہلے سے ہی بڑے پیمانے پر تعلقات موجود تھے جبکہ بہت سے واقعات جیسے صومالیہ، تاجکستان، چیچنیا، اریٹیریا اور کوسووو میں اس قسم کے تعلقات موجود نہیں تھے۔(42)

حکومتی رکاوٹیں

ایک تیسرا مفروضہ یہ کہتا ہے کہ لوگ غیر ملکی تنازعوں میں اس وقت ہی شریک ہوتے ہیں جب حکومتیں انہیں اس کی اجازت دیتی ہیں۔ 1980ء کی دہائی غیر ملکی جنگجوؤں کی حمایت کے حوالے سے اس صورت حال کو دیکھ چکی ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا کہ عرب افغان گروہ کو حکومت کی طرف سے فعال طریقے سے حمایت نہیں دی جا رہی تھی تاہم انہیں خلیجی اور مغربی ممالک میں کسی رکاوٹ کے بغیر بھرتی پروگرام کی اجازت دی گئی تھی۔ بلاشبہ حکومتیں غیر ملکی جنگجوؤں کی حرکت پذیری پر اثر انداز ہو سکتی ہیں۔ اس حوالے سے بھی کوئی سوال نہیں کہ اگر اسرائیل اور اس کے ہمسایہ ممالک شدید قسم کی رکاوٹیں اور مشکلات پیدا نہ کرتے تو فلسطین میں 1990ء اور 2000ء کی دہائی میں بہت بڑی تعداد میں غیر ملکی جنگجوؤں کی شرکت ہوتی۔ حکومتوں کے لئے چھوٹے درجے کی حرکت پذیری کو روکنا ممکن نہیں ہوتا تاہم اگر ارادے مضبوط ہوں تو یہ کام مشکل نہیں ہے۔ زیادہ تر عرب حکومتوں کی جانب سے کھلی بھرتی کا سلسلہ 1990ء کی دہائی میں ختم ہو گیا تاہم

یہ رجحان پھر بھی پھلتا پھولتا رہا اور بڑی تعداد میں سعودی باشندے فلسطین جانے میں کامیاب ہو گئے۔ اگر افغانستان میں 1980ء کی دہائی کے افغان جہاد کو دیکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ غیر ملکی جنگجوؤں کے حوالے سے یہ ایک اہم موقع تھا جو بہت کام کا حامل ہے۔ وقت کے حوالے سے وضاحت کرنے کے لیے اگر کوئی بات کرتا ہے تو یہ ثابت کرنا ہوگا کہ 1980ء سے پہلے حکومتی رکاوٹیں واقعی بہت زیادہ تھیں مگر فلسطین کے سوا دوسری اطراف میں حکومتی رکاوٹوں کے حوالے سے شواہد کی کمی کی وجہ سے ایسا کرنا بہت مشکل ہوگا۔ دلائل کو متوازن کرنے کے لیے کہا جا سکتا ہے کہ ممکنہ طور پر یہ دکھائی دیتا ہے کہ 1980ء کے بعد غیر ملکی جنگجوؤں کے پھیلاؤ کے حوالے سے عرب افغانوں کو ریاستی امداد کو ایک ضروری وجہ قرار دیا جا سکتا ہے تاہم یہ کافی نہیں۔

اطلاعاتی ٹیکنالوجی

ایک چوتھا امکان یہ ہو سکتا ہے کہ غیر ملکی جنگجوؤں کے حوالے سے عالمی حرکت پذیری کے لیے اطلاعاتی ٹیکنالوجی کی ضرورت ہے جو کہ 1980ء سے پہلے دستیاب نہیں تھی یا بہت مہنگی تھی۔ اس مفروضے کے ایک پہلو میں ذرائع آمدورفت پر زور دیا گیا ہے۔ یہ ایک پرکشش آئیڈیا ہے کیونکہ سفری اخراجات کسی فرد کے لیے کسی دور دراز کی جنگ میں شریک ہونے کی براہ راست صلاحیت کو متاثر کرتے ہیں۔ بحری نقل و حمل، فضائی اخراجات اور ٹیلی فون کالز کے اخراجات 1940 اور 1980 کے درمیان بہت کم ہو گئے ہیں۔[43] سکالروں کے مطابق یہی ایک وجہ ہے کہ اس عرصے کے دوران حج کے لیے مکہ مکرمہ جانے والے افراد کی سالانہ تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے۔[44] یہ چیز بہت امکانی دکھائی دیتی ہے کہ سستے ذرائع آمدورفت سے بھی عالمی غیر ملکی جنگجوؤں کی حرکت پذیری میں مدد ملی۔ البتہ یہ بات واضح نہیں ہو سکی کہ ان کی کون سی قیمت رکھی گئی، وہ کون سی مخصوص ٹیکنالوجی تھی جس سے یہ حرکت پذیری ممکن ہوئی۔ حالانکہ واقعاتی اعتبار سے بات کی جائے تو کوئی شاید یہ کہہ دے کہ طویل فاصلے کی غیر ملکی جنگجوؤں کی سرگرمی دسویں صدی عیسوی میں شروع ہو چکی تھی جب بازنطینی عیسائیت کے خلاف عباسی خلافت کی مدد کے لیے جنگجو موجودہ ایران سے جنوبی ترکی کی طرف سفر کرتے تھے۔[45]

ٹیکنالوجی کے مفروضے کے حوالے سے دوسری قسم جس پر زور دیا جاتا ہے وہ میڈیا ہے۔ اطلاعاتی اور شائعاتی ٹیکنالوجی بھرتی کے حوالے سے پروپیگنڈا کی رسائی، رفتار اور وسعت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس عرصے کے دوران عرب دنیا میں ٹیلی ویژن اور دیگر عوامی میڈیا تک

عوامی رسائی میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے جس سے بیرونی اسلامی دنیا میں رونما ہونے والے واقعات کے حوالے سے لوگوں کی آگاہی میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے۔[46] غیر ملکی جنگجوؤں کی سرگرمی کے حوالے سے یوں میڈیا کا کردار بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اگر میڈیا کو ہی کافی سمجھا جائے تو پھر یہ امید کی جانی چاہیے کہ اس سے غیر مسلموں میں بھی کثیر القومی جنگجو کی تعداد اور حمایت پسندی کے رجحانات میں بھی اضافہ ہوگا تاہم ایسا نہیں ہے۔ معمولی سے اس عرصے کے دوران غیر مسلموں میں بھی غیر ملکی جنگجو حرکت پذیری کے چند واقعات کا پتہ چلایا ہے اور سماجی تحریکوں کے حوالے سے سکالرز 1990ء کی دہائی میں کثیر القومی حمایت پسندی کے قابل ذکر اضافے کا پتہ چلاتے ہیں۔[47]

اسلام کا ارتقاء

پانچویں وضاحت کے سلسلے میں جس چیز پر فوکس کیا جاتا ہے وہ اسلامی تحریکوں کے ارتقاء کے محرکات اور غیر ملکی جنگجوؤں کے اس سے تعلق کے بارے میں ہے۔ غیر ملکی جنگجوؤں کے رجحان میں اضافہ اس لیے ہوا کہ اسلامی تحریکوں میں تیزی دیکھنے میں آئی۔ یہاں پر مشکل دوہری نوعیت کی ہے وہ اسلام ازم کے ابھرنے اور عالمی غیر ملکی جنگجوؤں کے ابھرنے کے درمیان تاریخ وار عدم تعلق ہے۔ نظریے کے طور پر اسلام ازم انیسویں صدی کے اواخر میں ابھرا اور ایک منظم سیاسی رجحان کے طور پر یہ 1920ء کی دہائی کے اواخر میں سامنے آیا۔[48] 1940ء کی دہائی کے اواخر میں مصر میں اخوان المسلمون کے کارکنوں کی تعداد کئی ہزار تک پہنچ چکی تھی۔[49] اس کے بعد کے عشروں میں افغان جہاد کے آغاز تک دیگر مسلمانوں کی جنگوں میں شرکت کرنے والے اسلام پسندوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ دوسرے یہ کہ اس عرصے کے دوران 1980ء سے پہلے کے اسلام پسندوں کے سیاسی منصوبوں اور غیر ملکی جنگجوؤں کی سرگرمیوں کے درمیان قابل ذکر حد تک عدم تعلق پیدا ہو گیا تھا۔[50] 1980ء سے پہلے کے بہت سے اسلام پسند گروپ مقامی حکومتوں کے خلاف لڑ رہے تھے 1980ء سے پہلے اس بات کی بہت کم پیش گوئی کی جاتی تھی کہ غیر ملکی جنگجوؤں کی کوئی سرگرمی دیکھنے میں آئے گی۔ 1979ء کے ایرانی انقلاب کے حوالے سے بھی مسئلہ دیکھنے میں آیا تھا۔ امام خمینی کے انقلاب کا بنیادی تجزیہ تھا کہ دیگر مسلم مقبوضہ علاقوں کو آزاد کرانے کے بجائے صرف اپنے ملک میں انقلاب لایا جائے۔ ان کے انقلاب کی کامیابی سے دوسرے انقلابیوں کو خود بخود تحریک ملے گی اور کسی حد تک مصر اور شام کے حوالے سے یہ بات

درست ثابت ہوئی۔ تاہم دوسری جانب مسئلہ یہ تھا کہ چونکہ ایرانی انقلاب شیعہ انقلاب تھا اس لیے اس سے سنی عقیدے سے تعلق رکھنے والے غیر ملکی جنگجوؤں کی تحریک کو زیادہ فائدہ ہونے کا کوئی سوال نہیں تھا۔

کچھ نامور دانشور دعویٰ کرتے ہیں غیر ملکی جنگجوؤں کی صورت حال اس لیے ابھری کیونکہ اسلام ازم زوال پذیر تھا۔[51] اس تناظر میں دیکھا جائے تو 1980 اور 1990 کی دہائیوں میں اسلام ازم کی کثیر القومیت مرکزی دھارے کی اسلامی پارٹیوں کی کمزوری یا اعتدال پسندی یا دونوں کا ردعمل تھا۔ تاہم یہ وضاحت بھی تسلی بخش نہیں۔ وہ مسئلہ جس کے ذریعے مرکزی دھارے کی اعتدال پسندی بنیاد پرستی کی وجہ بنتی ہے قابل فہم اور جانی مانی چیز ہے جیسا کہ یورپ میں 1960 کی بائیں بازو کی تحریکوں کے ساتھ ہوا۔[52] تاہم یہ بات بہت ہی کم واضح ہے کہ مرکزی دھارے کی اعتدال پسندی کے نتیجے میں بین الاقوامیت کس طرح پیدا ہو جاتی ہے۔ مصری اور شامی انقلابیوں کی افغانستان کو ہجرت، افغانستان کی طرف عربوں کی حرکت پذیری کا ایک نتیجہ ہے سبب نہیں کیونکہ یہ لوگ ان افراد میں شامل نہیں تھے جو پہلے وہاں آئے اور یہ لوگ بین الاقوامی ابھرتی میں اس قدر متحرک نہیں تھے (مرکزی انٹرپرینیور جوان اسلسٹوں جیسے عبداللہ عزام وغیرہ تھے)۔ اس کے علاوہ افغانستان میں انقلابی اس قدر بڑی تعداد میں نہیں تھے۔ 1980 کی دہائی میں افغانستان میں غیر ملکی جنگجوؤں کی کثرت غیر متحرک تھی۔[53] جیسا کہ میں نے پہلے دکھایا کہ مقامی اسلام پسندوں کو دبانے کے عمل نے غیر ملکی جنگجوؤں کے ابھرنے کی صورت حال کے وقت میں کردار ادا کیا اور یہ اس سے عدم دو وابستگی راستہ تھا جتنا پہلے سمجھا جاتا تھا

یوں دکھائی دیتا ہے کہ پانچوں وضاحتوں جن پر اب تک نظر ثانی کی گئی، ان میں سے کسی کو بھی انفرادی طور پر غیر ملکی جنگجوؤں کی حرکت پذیری میں تاریخ وار عروج کے سلسلے میں ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا حتمی امکان یہ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے دو یا اس سے زیادہ کا مجموعہ اس سلسلے میں ایک بھرپور سبب بنتا ہے۔ یہاں پر مسئلہ یہ ہے کہ ایک سے زیادہ متغیرات کے درمیان باہمی تعلق کے اثرات کا تجزیہ کرے، جس میں کئی قدریں موجود نہیں، میں مشکل کے علاوہ عوامل کا کوئی ایک بھی مجموعہ ایک خاص نوعیت کی قابل قبول وضاحت تشکیل نہیں دے پاتا۔ مثال کے طور پر اطلاعاتی ٹیکنالوجی کی بہتر شدہ شکل اور اس کے ساتھ مضبوط سرحدی تحریکوں کے ذریعے جنگی رضاکار پیدا نہیں ہوتے اور اس سے محض زیادہ متحرک انقلابی ہی جنم لے سکتے ہیں جن کو

بڑے بڑے بین الاقوامی سپورٹ نیٹ ورکس کی مدد حاصل ہو۔ اسی طرح کسی خاص ملک کے قبضے (جیسے افغانستان پر سوویت قبضہ) اور جنگی رضاکاروں کے حوالے سے حکومت کی جانب سے برداشت کا عارضی رویہ بھی مشکل اس بات کی وضاحت کرپاتا ہے کہ لوگ کیوں عشروں کے بعد خود کو اس قسم کے تنازعات میں شامل کرتے ہیں جو حکومتوں کی سخت بندشوں میں ہوتے ہیں۔ اوپر بیان کیے گئے کئی اسباب اس قسم کے حالات کو تشکیل دیتے ہیں جس میں حرکت پذیری پیدا ہونے کے امکانات جنم لیتے ہیں یا حرکت پذیری اپنی آخری حد تک پہنچ جاتی ہے۔ سماجی واسباب کی موجودگی اور سفر کے کم ہوچکے اخراجات بھی حرکت پذیری میں اضافہ کرتے ہیں جبکہ تنازعے کی قسم حکومتی پابندیاں اور سفری اخراجات شدت کو بھی متاثر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ تاہم یہ اسباب چاہے اکیلے ہوں یا مجموعے کی شکل میں، 1980ء کے بعد ابھرنے والی غیرملکی جنگجوؤں کی حرکت پذیری کے لیے تسلی بخش اسباب پیش نہیں کرتے۔

نئی نظریاتی تحریکیں

یہ حصہ غیرملکی جنگجوؤں کے حوالے سے ایک مختلف وضاحت پیش کرتا ہے۔ یہ ایک مختلف قسم کی محرکاتی تبدیلی کے بارے میں بتاتا ہے جو نئی نظریاتی تحریکوں کا ابھرنا یا اسلام ازم کی رہبری ہے جو کہ 1980ء سے پہلے موجود نہیں تھی۔ (54) مفروضے کے مطابق اس تحریک کے نمائندوں نے ہر قسم کی پابندیوں سے قطع نظر ان تنازعات میں شمولیت اختیار کی جن میں مسلمان شریک تھے۔ دو قابل تجربہ پیش گوئیاں ابھرتی ہیں۔ اول یہ کہ 1980ء کے بعد غیرملکی جنگجوؤں کے درمیان نظریاتی، سماجی اور تنظیمی تعلقات کو دیکھا جائے گا۔ دوسرے یہ کہ غیرملکی جنگجوؤں کے نظریات اور اسلامی نظریات کے درمیان اختلاف کو دیکھا جائے گا۔

پہلی پیش گوئی کی تصدیق کرنا مشکل نہیں کیونکہ 1980ء کے بعد غیرملکی جنگجوؤں کے لشکروں میں تعداد اور قسم کے تعلق ہیں۔ پہلے کے تنازعات کے بھرتی میں استعمال ہوچکے سٹرکچر بعد کے تنازعات میں استعمال کیا جاتا ہے اور نئے پروپیگنڈا نئی پرانے تنازعے کے بارے میں بھرپور طریقے سے حوالے موجود ہوتے ہیں۔ یہاں پر افراد کا خاص طور پر 1980ء کی افغان جنگ میں شریک تجربہ کار عربوں نے اس کے بعد کے لگ بھگ تمام جنگی واقعات میں لوگوں کو حرکت میں لانے والے اولین لوگوں کا کردار ادا کیا۔ (55) بڑی تعداد میں لوگوں نے ایک سے زیادہ جنگی تنازعات میں شرکت کی جبکہ بہت سے لوگ ایسے تھے جنہوں نے پانچ یا چھ چھ جنگوں میں

شرکت کی۔ (56)

آخرکار اسی قسم کے لاجسٹک مسئلوں اور فنڈنگ کے ذرائع، بالخصوص اسلامی خیراتی اداروں نے کئی مختلف حرکت پذیریوں میں کردار ادا کیا۔ (57)

دوسری پیش گوئی کی تصدیق کرنا زیادہ مشکل ہے۔ اس بات کو جانچنے کے لیے کہ آیا 1980ء کے بعد ایک مخصوص ذہنیت کے غیر ملکی جنگجوؤں کے نظریات ابھرے، اس کے لیے میں نے 1980ء کی دہائی کے افغانستان، بوسنیا اور عراق کے بھرتی پروپیگنڈا کا جائزہ لیا۔ دراصل کا موازنہ 1880ء سے پہلے اسی قسم کے سابقہ گروہوں اور 1980ء کے بعد دیگر اقسام کی قوم پرست حمایت پسندی میں ملوث گروہوں کے پروپیگنڈا سے کیا۔ میں نے افغانستان، بوسنیا اور عراق کا انتخاب اس لیے کیا کیونکہ یہ سب سے بڑی حرکت پذیری کی ماخذگی کرتے تھے اور دوسرا یہ کہ ان کا تاریخ وار تسلسل بہت اچھے طریقے سے منقسم ہے کیونکہ یہ تینوں واقعات مختلف عشروں کے درمیان پیش آئے۔

جان الحسن کی پیروی کرتے ہوئے میں نے بھرتی کے پیغامات کے حوالے سے اس کے تین پہلوؤں پر فوکس کیا۔ تشخیص (کیا خرابی ہے) علاج (کیا کرنے کی ضرورت ہے) اور منطق (یہ کام کس کو کرنا چاہیے اور کیوں)۔ (58) بڑی تعداد میں موجود دستاویزات کو دیکھتے ہوئے میں نے صرف ایسے مواد پر انحصار کیا جسے مبصرین اور شرکا کی جانب سے حرکت پذیری کے رجحانات میں بہت اہم اور بااثر قرار دیا جاتا تھا۔ 1980ء کی دہائی کے حوالے سے بات کی جائے تو عبداللہ عزام اور ان رسائل جنہیں پشاور میں موجود عرب تیار کرتے تھے سے پتہ چلتا ہے کہ عزام اس وقت افغانستان میں عربوں کے ملوث ہونے کے سب سے بڑے اور بااثر حامی تھے اور پشاور افغانوں عربوں کا اڈہ تھا۔ (59) بوسنیا کے حوالے سے میں نے ابو عبدالرحمان الدعامری (برعوس) کی بیانات اور بھرتی کی ترغیب کے لیے 1992-95 کی ویڈیوز کا جائزہ لیا۔ الدعامری اگرچہ نسبتاً غیر مقبول اور بااثر نہیں تھا جتنا 1980ء کی دہائی کا عزام تھا تاہم بوسنیا میں عربوں کے ملوث ہونے کے حوالے سے وہ واحد بہترین محرک اور اہم ترین ترجمان تھا۔ (60) عراق کے لیے میں نے ابو عمر السیف اور بھرتی کی ترغیب کے لیے 2003-2004ء کی انٹرنیٹ ویڈیوز کا جائزہ لیا۔ جبکہ میں مقیم السیف ذاتی طور پر عراق میں ملوث نہیں تھا لیکن عراق میں غیر ملکی جنگجوؤں کے جنگ میں حصہ لینے کا سب سے بااثر حامی تھا۔ (61)

غیر ملکی جنگجوؤں کے نظریات کے مندرجات

تمام تحریروں میں تشخیص یہ کی گئی تھی کہ مسلم قوم یعنی امہ کو بیرونی جانب سے خطرات درپیش ہیں۔ یہ کہ مسلمانوں کی زمین پر قبضہ کر کے ان کا قتل عام کیا جا رہا ہے جس سے انہیں نکالنے کے لیے جہادیوں کی انتہائی شدید ضرورت ہے۔ ان دستاویزات میں میدان جنگ میں معین طور پر ڈھائے جانے والے مظالم کی تصویر کشی کی جاتی کہ مسلمانوں کی سرزمین پر قبضہ کیا جا چکا ہے ان کی عورتوں سے بدسلوکی کی جا رہی ہے۔ بچوں اور بوڑھوں کو قتل کیا جا رہا ہے۔ مسجدوں کو شہید کیا جا رہا ہے اور مسلمانوں کے وسائل لوٹے جا رہے ہیں۔ دستاویزات میں دنیا بھر میں غیر مسلموں کے ہاتھوں پر مسلمانوں پر ظلم و تشدد کے دیگر واقعات کے بارے میں بھی بتایا جاتا ہے۔

اس کا علاج یہ تجویز کیا جاتا ہے کہ مسلمان بھی فوجی طریقے سے اس کی مزاحمت کریں۔ اس کے لیے دو قسم کی منطق بیان کی جاتی ہیں۔ ان میں سب سے اہم یہ کہ اسلامی قانون اس کی اجازت دیتا ہے۔ اس سلسلے میں مقدس آیات اور کلاسیکی ماہرین فقہ کی تحریروں کو پیش کرتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ جہاد کی شرائط پوری ہو چکی ہیں۔ دوسری تواتر سے پیش کی جانے والی منطق عملی نوعیت کی ہوتی ہے کہ حالات اس قدر خراب ہیں اور دشمن اس قدر شاطر ہے کہ کوئی سفارتی طریقہ کارگر نہیں ہو سکتا۔

منطقی دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ چونکہ اسلامی قانون اس کی ضرورت ظاہر کرتا ہے اس لیے دنیا بھر سے مسلمان جنگ کے لیے آ گئیں۔ مسلمانوں کے جن علاقوں پر قبضہ کیا گیا ان کا دفاع صرف ان علاقوں کے مسلمانوں پر نہیں بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں پر فرض ہو چکا ہے۔ اس بارے کی حمایت میں دو قسم کے دلائل پیش کیے جاتے ہیں۔ پہلے میں مسلمانوں کی یکجہتی پر زور دیا جاتا ہے۔ متاثرین کو با قاعدہ طریقے سے "ہمارے بھائی بہنیں، مائیں اور بچے" کہا جاتا ہے جیسے جن افراد کو جنگ کے لیے بلایا جا رہا ہے وہ ان کے خون کے رشتہ دار ہیں۔ دوسری دلیل میں اسلامی قانون کا استعمال کیا جاتا ہے کہ جہاد تمام مسلمانوں کے لیے مذہبی فریضہ ہے۔

دستیاب تمام دستاویزات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عبداللہ عزام غیر ملکی جنگجوؤں کے حوالے سے اب تک کا سب سے با اثر نظریہ ساز ہے۔ اہم عصر منتظمین تحریکی انداز میں اس کا ذکر کرتے ہیں اور اس کے بعد کی ویڈیوز میں اس کی تقریروں کی ریکارڈنگ پیش کی جاتی ہے۔ اس کے الفاظ غیر ملکی جنگجوؤں کے نظریات کے بنیادی حیثیت کے حامل ہیں اور اس طرح غیر ملکی

جنگجوؤں کے نظریات اور دیگر جہادی نظریات کے درمیان تقابل کے لیے بنیاد فراہم کرتے ہیں۔

غیر ملکی جنگجوؤں کے نظریات کی منفرد خصوصیات

1980ء میں اس کے تعارف کے وقت غیر ملکی جنگجوؤں کا نظریہ موجود جہادی نظریات سے دو معنوں میں مختلف تھا۔ اول یہ ایک مکالمے کی پیش کش کرتا تھا جس میں بیرونی دشمن پر فوکس کیا جاتا تھا جبکہ اسلامی انقلابیوں کے نظریات میں اندرونی دشمن پر فوکس کیا جاتا تھا۔ 1980ء سے پہلے مکمل طور پر تمام عسکری اسلامی گروہ اپنے اپنے ملکوں میں اپنی حکومتوں کی تبدیلی کے لیے لڑتے تھے۔(62) سید قطب اور محمد فرج جیسے اسلامی انقلابیوں کے مطابق جہاد کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ بدعنوان حکمرانوں کا خاتمہ کیا جائے اور سیکولر قوانین کو کالعدم کیا جائے۔ غیر ملکی جارحیت سے لڑائی اس میں شامل نہیں تھی۔(63)

دوسرے عزام کی ڈاکٹرائن یا نظریہ جہاد کے حوالے سے قدامت پسند اسلامی نظریات سے مختلف تھا جس میں نجی جنگ کے لیے منطق اور دلیل کی پیش کش کی گئی تھی مثال کے طور پر حکومت کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ افراد کو جنگ کے لیے بیرون ملک جانے سے روک سکتی ہے۔(64) بیسویں صدی کے مرکزی دھارے کے اکثر اسلامی علماء کے نزدیک جہاد کا اعلان اسی صورت میں کیا جا سکتا ہے جب کوئی غیر مسلم طاقت کسی مسلمان ملک کے خلاف کھلی جارحیت کا ارتکاب کرے اور اس میں بھی اس بات پر زور دیا جاتا تھا کہ اس جارحیت کے خلاف جہاد صرف مقامی آبادی کرے۔ غیر ملکیوں کے لیے اس جنگ میں شرکت کو اجتماعی فرض (فرض کفایہ) کہا جاتا ہے اور ایسا صرف اس وقت ہو سکتا ہے جب پوری مقامی آبادی اس میں شرکت کرے۔ افراد نہیں۔ غیر ملکیوں کو جنگ میں شرکت کی اجازت تب دی جاتی ہے جب ان کے والدین، ان کے سرپرست اور سیاسی مقتدرہ اس کی اجازت دے۔(65) اس میں آخری نکتے سے پتہ چلتا ہے کہ 1980ء سے پہلے یہاں بہت محدود تعداد میں غیر ملکی جنگجوؤں کی حرکت پذیری کے واقعات پیش آئے تھے۔ پان اسلامک یکجہتی کا رواج عزام سے بہت پہلے بھی موجود تھا لیکن نجی طور پر جنگ میں شرکت کو مذہبی قواعد کی رو سے مختلف شرائط سے منسلک کیا جا چکا تھا۔

اس امر پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ عبداللہ عزام کا نظریہ القاعدہ کے حالیہ عالمی جہاد کے نظریے سے مختلف تھا جس میں ایک مختلف حل پیش کیا جاتا ہے۔ عبداللہ عزام کے نظریے میں روایتی جنگی اقدامات کو میدان جنگ تک محدود رکھنے کی بات کی جاتی ہے جبکہ اسامہ بن لادن

کے 1998ء کے مشہور نظریے میں ہر مقام پر ہر جنگجو کے کی اجازت دی جاتی ہے۔(66)

ایک اچھا اشارہ جس کی غیر ملکی جنگجوؤں کا نظریہ نمائندگی کرتا تھا وہ 1980ء کی دہائی میں قابل ذکر حد تک نئی چیز تھا جو اس کے مخارف کے موقع پر اٹھنے والا تقاضہ تھا۔ جیسا کہ عزام نے بعد میں خود کہا تھا "کچھ لوگ ناراض تھے کچھ خوش تھے اور کچھ سرزنش کرتے تھے۔ ہمارے بھائی ہم سے حقارت کا مظاہرہ کرتے تھے اور ہمارے منہ پر کہتے تھے کہ ہم نوجوانوں کو ان کے خلاف بغاوت پر اکسا رہے ہیں۔"(67) متعدد ممتاز اسلامی سکالر جیسے سلمان العودہ، سفر الحوالی اور یوسف القرضاوی عزام کی طرف سے انفرادی فرض کے تصور سے اتفاق نہیں کرتے تھے اور کہتے تھے کہ غیر افغانوں کو افغانستان میں لڑنے کے لیے کہا جاتے بلکہ ان کی حوصلہ افزائی کی جانے لیکن انہیں ایسا کرنے پر مجبور نہ کیا جائے۔(68) اسی طرح 1980 اور 1990 کی دہائی میں بھی انقلابیوں اور غیر ملکی جنگجوؤں کے درمیان نظریاتی اختلاف دیکھنے میں آیا جو اس بات پر تھا کہ آیا کہ مسلمان حکومتوں سے جنگ کی جائے یا غیر ملکی قابضین سے لڑا جائے۔(69) 1990ء کی دہائی کے اواخر اور 2000ء کے اوائل میں غیر ملکی جنگجوؤں کی القاعدہ کے ساتھ اس بات پر بحث ہوئی کہ آیا کہ امریکہ کے خلاف عالمی دہشت گردی کا آغاز کیا جائے یا چیچنیا اور عراق میں روایتی طریقے سے جنگ کی جائے۔(70)

عزام کے پیغام کی گونج اس زمانے میں جزوی طور پر سنائی دے رہی تھی کیونکہ سیاست کے تمام اسلامی اظہاریے 1980ء کی دہائی میں ابھرتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ 1967ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد عرب قوم پرستی زوال پذیر تھی جبکہ 1979ء کے ایران انقلاب سے پتہ چلا تھا کہ اسلامی انقلاب بیلٹ پیپر سے بڑھ کر ہے۔ مزید یہ کہ اسلامی نظریاتی مارکیٹ میں غیر ملکی جنگجوؤں کے نظریے کو یہ فائدہ حاصل تھا کہ یہ جہاد کے بارے میں دیگر عسکری اسلامی نظریات کے مقابلے میں اسلام کی قانونی قدامت پرستی کے زیادہ قریب تھا۔ حقیقت میں عبداللہ عزام کا یہ فتویٰ کہ بیرونی جارحیت کے خلاف جہاد ایک انفرادی فرض ہے وہ بیسویں صدی کے قدامت پرست نظریات کے مقابلے میں دور وسطیٰ کے کلاسیکل جہادی تصور سے مطابق تھا جو ایک قومی ریاست کے سوال پر ثانوی حیثیت رکھتا تھا۔ اس طرح عزام کا نظریہ سید قطب کے انقلابی اسلام ازم سے کم متنازعہ تھا کیونکہ عزام جس جدوجہد کے لیے کہتا تھا وہ غیر ملکی جارحیت کے خلاف مسلم علاقے کے دفاع کے بارے میں تھی جو کہ وہی تھی جو جہاد کے قدامت پرست نظریے

میں ہے۔(71) اس کے برعکس، انقلابی، اسلام پرست مسلم حکمرانوں کے قتل کی بات کرتے تھے جو کہ نظریاتی طور پر ایک زیادہ مشکلات سے بھرپور منصوبہ تھا۔ علاوہ ازیں غیر ملکی جنگجوؤں کی جانب سے جن کو رینا جنگنڈوں کی بات کی جاتی تھی ان کی دہشت گردوں کے حقیقی دیگر اسلامی گروہوں کے منصوبوں کے مقابلے میں جہاد کے کلاسیکل اسلامی نظریات کے ساتھ آسانی سے مطابقت پیدا کی جا سکتی تھی۔(72)

پھر آخر عزام کا نظریہ زیادہ لوگوں کو حرکت میں کیوں نہیں لایا؟ اس کی ایک ظاہر وجہ یہ ہے کہ اس کا دیگر نظریات اور شناخت کی دیگر اشکال کے ساتھ بھی موازنہ قائم کرنا پڑتا تھا۔ مقامی، قومی اور علاقائی سیاسی تحفظات آج بھی اکثر عام لوگوں کے لیے بہت اہم ہوتے ہیں۔ مزید یہ کہ اس مسئلے کہ آیا غیر ملکی اسلامی جنگوں میں شرکت ہر مسلمان کے لیے انفرادی فریضہ ہے یا نہیں، پر عزام کے نظریے کو ایک بہت بااثر مذہبی تصور کے ساتھ بھی مقابلہ درپیش تھا۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا کہ سلفی علماء کی بڑی اکثریت دوسرے مسلمانوں کی جنگ میں شرکت کو ایک اجتماعی فریضہ سمجھتی ہے جس میں شرکت کرنے والوں کو اپنی حکومت، والدین اور سرپرستوں کی اجازت بھی درکار ہوتی ہے۔ اس نکتہ نظر سے دیکھا جائے تو بغیر اجازت کے جہاد پر جانا گناہ ہے۔ گرچہ نظریات کے رکاوٹی تصورات کے حوالے سے شکوک و شبہات میں گرفتار ہونے کی کئی وجوہات ہیں، اس نظریاتی نکتے کے بھرتی پر بہت سے اثرات مرتب ہوتے ہیں جس کا پاکستان میں لڑائی کے لیے والدین کی اجازت کے حوالے سے حالیہ مطالعے کی صورت میں دستاویزی ریکارڈ موجود ہے۔(73) اجتماعی فریضے کی بات تحریک پیدا کرنے میں ایک رکاوٹ پیش کرتی ہے اور تحریک پیدا نہ کرنے کے لیے ایک اہم جواز فراہم کرتی ہے۔ اجتماعی فریضے کی بات اس سے بھی غالب ہو جاتی ہے کیونکہ یہ حکومتوں اور مذہبی مقتدرہ کی جانب سے فروغ کیا جاتا ہے جو اپنے حکومتی اور مذہبی اختیارات سے محروم نہیں ہونا چاہتے۔ بعد عزام کا نظریہ غیر متنازعہ نہیں تاہم یہ بطور غیر ملکی جنگجو حرکت میں آنے والوں کے لیے ایک منطقی جواز پیش کرتا ہے۔

درج بالا پیش کیے گئے مواد کی بنیاد پر میں نتیجہ اخذ کرتا ہوں کہ غیر ملکی جنگجوؤں کے حوالے سے ایک مشہور نظریہ موجود ہے جو خاص طور پر صرف 1980 کی دہائی میں تیار کیا گیا۔ 1980 کی دہائی کے بعد غیر ملکی جنگجوؤں کے پھیلاؤ کی وجہ ممکنہ طور پر عالمی تحریکوں کا ابھرنا ہے جس نے اولین حرکت انداز اور اس کے بعد مزید حرکت پذیری کے لیے نظریات فراہم کیے۔ تاہم اولین

حرکت انداز اور ان کے نظریات کہاں سے آئے؟

غیر ملکی جنگجوؤں کی تحریک کا ماخذ

اولین حرکت اندازوں اور ان کی ترجیحات کا ماخذ ایک ایسا سوال ہے جسے خانہ جنگی پر کام کرنے والے سکالرز نے عام طور پر نظر انداز کیا۔[74] زیادہ تر مطالعات میں اولین حرکت اندازوں کے بجائے ان کے بعد آنے والوں پر فوکس کیا گیا۔ اول، نظریات کے ماخذ پر تحقیق کرنے میں آئیڈیا کی ایک ذیلی شاخ ہے جس میں قابل مشاہدہ اعداد و شمار کی کمی ہے اور پیچیدہ جبہاتی تحفظات بہت زیادہ ہیں جس سے ان دلائل کی تصدیق کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ دوئم، وسیع پیمانے کے تنازعات کی وضاحت کرنے کے لیے بعد میں آنے والوں کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ سوئم، اکثر خانہ جنگیوں میں ایک ہی قسم کے نظریاتی محرکات ابھرتے رہتے ہیں جس سے اولین حرکت اندازوں کے لیے تحریک مقابلتاً غیر دلچسپ ہو جاتی ہے۔ تاہم غیر ملکی جنگجوؤں کے لیے اولین حرکت اندازوں کا کردار اور ان کے نظریات اس قدر بڑے ہوتے ہیں کہ انہیں تحقیق کے بغیر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ نقصان کا اندازہ لگانے میں مشکلات کی وجہ سے ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ سکالر حضرات بہترین مفروضے پیش کرنے سے خود کو روک دیں۔

اس حصے میں، میں اولین حرکت اندازوں اور ان کے تصورات کے ماخذ کے بارے میں وضاحت کروں گا۔ اگرچہ یہ مکمل طور پر نظریاتی نہیں تاہم میری وضاحت میں سماجی تحریکوں اور قوم پرستی کے لٹریچر کے ذریعے مدد لی گئی ہے جو کہ دو مرکزی علمی روایات ہیں جو کہ کسی تحریک کی تشکیل کے حوالے سے معلومات فراہم کرتی ہیں۔ میں اپنے مفروضات کو کئی دیگر سماجی تحریکی سکالرز کے ساتھ شریک کرتا ہوں کہ تحریک کے آغاز کے لیے سیاسی مواقع، واضح تنظیم اور ثقافتی خاکوں کے ایک مجموعے کی ضرورت ہوتی ہے۔[75] تاہم میرا بنیادی مسئلہ آرگنائزنگ سٹرکچر اور ثقافتی خاکوں کے مخصوص ماخذ کے بارے میں ہے جو کہ ایسے موضوعات ہیں جن پر سماجی تحریکوں کے لٹریچر میں تفصیل کے ساتھ کام نہیں کیا گیا۔[76] اولین حرکت اندازوں کی تحریک اور ان کے مخصوص نظریاتی مکالمے کے چناؤ کی وضاحت کرنے کے لیے میں قوم پرستی کے لٹریچر کی طرف توجہ کرتا ہوں۔[77]

اس مرکز کو دیکھنا اہم ہے کہ اس حصے کا مقصد صرف افغانستان میں غیر ملکی جنگجوؤں کے وقوع کی وضاحت کرنا نہیں بلکہ اس تحریک کے ابھرنے کو دیکھنا ہے جو اس قدر بڑی ہے کہ جنگ کو

بھی پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔ میں حرکت پذیری کے تمام مراحل کی وضاحت کرنے کا ارادہ بھی نہیں رکھتا۔ میری اصل دلچسپی ہتھان تشکیل (جو 985-1979 کے درمیان ہوئی) کے حوالے سے ہے۔ پشاور میں جب غیر ملکیوں کا اجتماع وجود میں آ گیا اور بھرتی کے ذریعے سے مکالمہ تیار کر لیا گیا تو اس کے بعد حجازی تحریک کے علاوہ بھی اور اسباب بھی تھے جنہوں نے حرکت پذیری کے نمونے اور حجم کو تشکیل دیا۔

مفروضہ

میرے مفروضے کی بنیاد تین مشاہدات پر ہے۔ اول میں غیر ملکی جنگجوؤں کے نظریات اور ان سے پہلے کے اسلاف کے نظریات، جیسے قطب ازم اور وہاب ازم کے درمیان عدم تعلق کو دیکھتا ہوں۔ مصری نظریہ ساز سید قطب (1906-66) مسلم ریاستوں کے اندر انقلاب کی حمایت کرتا ہے۔ وہ سوائے فلسطین کے دیگر غیر مسلموں کے ساتھ تنازعے کی شاذ و نادر بات کرتا ہے اور نہ ہی کسی موقع پر مسلمانوں کو دوسرے مسلمانوں کی آزادی کی جنگ میں شرکت کے لیے کہتا ہے۔[78] اسی طرح محمد بن عبدالوہاب (92-703) اور بیسویں صدی میں اس کے پیروکار جو کہ سعودی حکومت کی مذہبی اسٹیبلشمنٹ کا حصہ تھے وہ بھی بین الاقوامی سیاست کے بجائے پہلے مسلمانوں میں نظریاتی اور اخلاقی پاکیزگی کی بات کرتی ہے۔[79] 1950 تک تو یہ صورت حال تھی کہ وہابی علما غیر وہابیوں کو مسلمان ہی نہیں سمجھتے تھے، ان کو بھائی سمجھنا تو بہت دور کی بات ہے۔[80] وسیع پیمانے پر پائے جانے والے تاثر کے برعکس سرکاری سعودی علماء نے کبھی بھی 1980 کی افغان جنگ یا اس سے پہلے کسی تنازعے میں شرکت کو انفرادی فریضہ قرار نہیں دیا۔
دوئم میں 970 اور 980 کے رسائل میں دینی تحریروں کے مجموعے کو دیکھتا ہوں جس کا مواد غیر ملکی جنگجوؤں کے مکالمے، مواد سے ملتا ہے۔ اس عرصے کے دوران ایسا لٹریچر بڑے پیمانے پر شائع ہوا جس میں دنیا بھر میں مسلمانوں کی حالت زار کی طرف دوسرے مسلمانوں کی توجہ مرکوز کرائی گئی۔ ان رسائل اور جرائد میں مالی امداد کے لیے بھی اسی طرح درخواست کی گئی جس طرح کہ غیر ملکی جنگجوؤں کے لٹریچر میں جہادیوں کی بھرتی کے لیے کی جاتی تھی۔
سوئم، یہی لوگ جو اس قسم کے رسائل اور جرائد چھاپ رہے تھے انہوں نے دنیا بھر میں جنگ اور دیگر سانحات سے تباہ ہونے والے مسلمانوں کی بھرپور طریقے سے مدد کی۔ غیر ملکی جنگجوؤں کے بڑی تعداد میں آنے سے بہت پہلے مسلم ورلڈ لیگ کے نمائندوں اور ان سے منسلک

جیراتی اداروں نے 1980ء میں افغانستان پر حملے کے بعد دربدر ہو کر پاکستان آنے والے افغان پناہ گزینوں کی ہر طریقے سے مدد کی۔ اس کے برعکس اس دور میں وہابی مذہبی اسٹیبلشمنٹ سے تعلق رکھنے والے مجاہدوں کا 1980ء کی دہائی کے تحریک افغانستان یا پاکستان میں کوئی نشان نہیں تھا۔ چنانچہ اب میں پان اسلامی تحریک کا کردار کا جو کہ 1970ء کی دہائی میں معتدل انداز میں ابھر چکی تھی اور 1980ء کی دہائی میں اس نے قطعہ وار آف شوٹ پیدا کر لیے تھے۔ [81] میں واقعات کے تسلسل کا سادہ ترین انداز میں معروضہ پیش کروں گا جس کے نتیجے میں عرب افغان اتحاد اور ان کے نظریے نے جنم لیا۔ ذیل میں واقعات کے اس تسلسل کی وضاحت کروں گا اور اس میکنزم کے بارے میں بتاؤں گا جو اس سلسلے کی ہر کڑی میں موجود ہے۔

پان اسلامی تحریک کا ابھرنا

یہ تصور کے تمام مسلمان ایک ہیں، اتنا ہی پرانا ہے جتنا کے اسلام، اور انیسویں صدی سے سیاسی کارکنوں نے مختلف مقاصد کے لیے امہ کے تصور کی آبیاری کی۔ [82] یہاں پر جس پان اسلامی تحریک کو بیان کیا گیا ہے وہ اس سے پہلے کی پان اسلامی تحریک سے مختلف ہے جو کہ بیسویں صدی کے اوائل میں ظاہر ہوئی تھی جس کے ذریعے اسلام پسندوں نے خلافت کو اور سعودی عرب کے شاہ فیصل کے خارجہ پالیسی ڈاکٹرائن کو بحال کرنے کی کوشش کی تھی۔ خلافت کے ذریعے تمام اسلامی ملکوں کی ایک یونین قائم کی جانی تھی جبکہ شاہ فیصل کی خارجہ پالیسی کا مقصد مسلم حکومتوں کے درمیان کوآرڈی نیشن قائم کرنا تھا۔ 1970ء کی پان اسلامی تحریکوں کا ان میں سے کوئی مقصد نہیں تھا۔ اس کا مقصد دنیا میں مسلمانوں کے مقام کے بارے میں عوام میں آگاہی پیدا کرنا اور عالمی سطح پر مسلمانوں کے درمیان تعاون کو فروغ دینا تھا۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ شاہ فیصل کی خارجہ پالیسی کا نظریہ اور حجازی پان اسلامی نظریات کا آپس میں اس قدر تعلق کا تھا کہ اول الذکر نے موثر لنگر کی ادارہ جاتی نوعیت کی بنیاد ڈالی تھی۔

یہ تحریک 1960ء کی دہائی کے اواخر میں مذہبی اداروں کے ایک مجموعے کی صورت میں ابھری تھی جس کی بنیاد سعودی عرب کے مغربی حجازی خطے میں تھی۔ یہ ادارے 1960ء کی دہائی میں مختلف وجوہات کے باعث قائم ہوئے تھے۔ مسلم ورلڈ لیگ کا قیام 1962ء میں مکہ مکرمہ میں عمل میں آیا تھا اور اس کے پیچھے خلافت تحریک کی باقیات تھیں۔ [83] 1969ء میں شاہ فیصل کی ناصری مخالف سفارتی کوششوں کے نتیجے میں تنظیم اسلامی کانفرنس کی بنیاد رکھی گئی جس کا صدر دفتر

جدہ میں تھا۔[84] اسی شام میں سعودی عرب میں تیزی سے وسعت اختیار کرتے تعلیمی شعبے کی کوششوں سے خطے میں بڑی یونیورسٹیاں قائم کی گئیں جس میں انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی مدینہ قابل ذکر ہے جو 1961ء میں قائم کی گئی۔ 1967ء میں جدہ میں شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا اور پھر مکہ میں کالج آف شریعت قائم کیا گیا جو بعد ازاں ام القریٰ یونیورسٹی بن گیا۔ 1970ء تک مکہ، مدینہ اور جدہ پر مشتمل تکون اسلامی مذہبی اداروں کا دنیا میں سب سے بڑا گڑھ بن گئی۔ ان کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ ان کے لیے سعودی عرب میں افرادی قوت کم پڑ گئی۔

سعودی عرب کی خوش قسمتی سے حجازی مذہبی شعبے کی توسیع کے کچھ عرصے بعد ہی عرب ملکوں میں اخوان المسلمون کو کچل دیا گیا جس کے نتیجے میں ہزاروں کی تعداد میں اسلام پسندوں کو سعودی عرب میں پناہ مل گئی۔[85] مہاجرین کی پہلی لہر اواخر 1950ء کی دہائی اور اوائل 1960ء کی دہائی میں دیکھنے میں آئی جس کے بعد مصر، عراق اور شام میں اخوان المسلمون کے کارکنوں کے خلاف کریک ڈاؤن ہونے لگا۔ 1960ء کی دہائی تک مہاجرین کی آمد جاری رہی حتیٰ کہ 1970ء کی دہائی میں مصری مہاجرین کی دوسری بڑی لہر سعودی عرب میں پہنچی حالانکہ مصر کے نئے صدر انورالسادات نے اسلام پسندوں کو جیل سے رہا کرنا شروع کر دیا تھا۔ مصر کے ان تعلیم یافتہ مہاجرین نے سعودی عرب میں سکولوں اور یونیورسٹیوں میں ملازمت اختیار کی اور سعودی عرب میں شعبہ تعلیم کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت اختیار کر لی۔ اخوان المسلمون کے جلاوطن لوگ شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی جدہ اور مکہ کے اہم عہدوں پر متمکن ہو گئے جبکہ انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی مدینہ میں بھی ان کی قابل ذکر تعداد اہم عہدوں پر تھی۔[86] دیگر بین الاقوامی اسلامی اداروں میں بھی ان کی کثیر تعداد تھی۔ حجاز کا خطہ سالانہ حج اور بحری تجارت کے نتیجے میں پہلے ہی ایک کاسموپولیٹن شہر بن چکا تھا جس کی وجہ سے یہ علاقہ عالمی اسلام پسندوں کے اکٹھے ہونے ہب کی شکل اختیار کر گیا۔

اعلیٰ تعلیم یافتہ ان جلاوطن کارکنوں کے لیے سعودی عرب کی مقامی سیاست میں اثر و رسوخ پیدا کرنے کے امکانات بہت محدود تھے۔ ان جلاوطن لوگوں کو ان کے اپنے ملک میں بھی خوش آمدید نہیں کہا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ وہ سعودی باشندے جو بین الاقوامی اسلامی اداروں اور حجاز کی یونیورسٹیوں میں کام کرتے تھے وہ بھی کسی حد تک ایک ایسے نظام کے حق میں نہیں تھے جس کے

نتیجے میں اہم حصوں کے تعلقات سعودی شاہی خاندان کے ہاتھ سے نکل جائیں جہاں پر اعلیٰ ترین مذہبی اختیارات وہابی شرفاء کے ہاتھ میں تھے جس کا مرکز نجد کا خطہ تھا۔ چنانچہ حجاز سے تعلق رکھنے والے اسلام پسند ایک معتدل قسم کی اشرافیہ کا درجہ رکھتے تھے۔ تاہم انہیں بین الاقوامی سطح پر کام کرنے کے مواقع حاصل تھا۔ عالمی اسلامی ادارے نظریات اور افراد کی آمد کے لیے انہیں پلیٹ فارم مہیا کرتے تھے جبکہ سعودی حکومت کی جانب سے ملنے والی چھوٹ کی وجہ سے وہ بیرون ملک سے آنے والے افراد کو بھی خوش آمدید کہہ سکتے تھے۔

اس قسم کے دوہرے مواقع کے نتیجے میں پان اسلامی سماجی تحریک سامنے آئی جو دو قسم کے ادارے جاتی اجزا پر مشتمل تھی۔ عالمی اسلامی ادارے اور مسلم ورلڈ لیگ اور اس کے لاتعداد ذیلی ادارے ان میں سب سے اہم اور ادارہ جاتی حیثیت رکھتے تھے۔ مسلم ورلڈ لیگ کا بنیادی مقصد انہیں عالمی سطح پر مسلم یک جہتی کا فروغ تھا اور اس مقصد کے حصول کے لئے بہت بڑی رقم بھی مختص کی گئی خاص طور پر 1973ء کے تیل کے بحران کے بعد۔(87) دوسرا مرکز اخوان المسلمون کا نام نہاد انٹرنیشنل آرگنائزیشن (التنظیم الدولی) کے نام سے قائم کیا گیا ادارہ تھا جس کی شکل صورت 1970ء کے اواخر میں حجاز میں واضح ہوئی تھی اور 1982ء میں اس کا باقاعدہ قیام عمل میں آیا تھا۔(88) اور اس کا مقصد اخوان المسلمون کی مختلف شاخوں کے درمیان تعلق قائم کرنا اور اس کے عالمی اثر و رسوخ میں اضافہ کرنا تھا۔

رین ہارڈ شلز کے علاوہ چند ہی سکالرز نے حجازی پان اسلامی گروہوں پر توجہ دی اور اس سے بھی کم سکالرز نے اسے سعودی حکومت یا وہابی مذہبی اسٹیبلشمنٹ سے جدا کر کے دیکھا۔(89)

عملی طور پر ہم جو بھی مواد پڑھتے ہیں اس میں افغان جہاد کے لیے ایک ہی اصطلاح "سعودی امداد" استعمال کی گئی جیسے افغانستان میں جہاد کے لیے جتنا پیسہ اور لوگ بھیجے جاتے تھے وہ سعودی حکومت یا وہابی انتظامیہ کی طرف سے بھیجے جاتے تھے اور اس غلط فہمی کی وجہ شاید یہ ہو سکتی ہے کہ 2002ء تک غیر ملکی سماجی سائنسدانوں کو سعودی عرب تک رسائی حاصل نہیں تھی۔ اس کے بعد فیلڈ ریسرچ سے پتہ چلا کہ سعودی عرب کا مذہبی سیکٹر قابل ذکر حد تک اس سے زیادہ [illegible] اور حکومتی بیوروکریسی اس سے زیادہ منقسم ہے جتنا پہلے سمجھا جاتا تھا۔(90) گرچہ عالمی اسلامی ادارے سعودی عرب میں تھے اور انہیں سعودی عرب سے ہی فنڈ ملتے تھے لیکن وہ بڑی حد تک خود مختار تھے تاوقتیکہ ان کی کارکردگی بین الاقوامی رہے۔ درمیانی اور نچلی سطح کے ملازمین کے لیے تو

یہ بات بہت حد تک سچ ہے لیکن کم از کم بیرون ملک میں نہیں۔ اوائل 1980ء کی دہائی کے پشاور میں مسلم ورلڈ لیگ کے بارے میں لکھے گئے مواد کے مطابق افغانستان کے ماہر جاکٹر ڈوروسورو کہتے ہیں کہ اہم ترین ڈونر میں شامل سعودی عرب اپنی طرف سے فراہم کردہ فنڈز کے استعمال کو ترجیحی طور پر کنٹرول نہیں کرتا اور مقامی ملازمین کو عام طور پر اخوان المسلمون کے کارکنوں کے طور پر شناخت کیا جاتا ہے۔ مزید براں، سعودی ریڈ کراس کی فنڈنگ براہ راست سعودی حکومت کی جانب سے ہوتی ہے لیکن یہاں بھی کارکنوں کے رجحانات اخوان المسلمون سے تعلق رکھتے ہیں۔(91)

حجازی کارکن عالمی اسلامی معاملات کے حوالے سے آگاہی بڑھانے میں بے حد دلچسپی رکھتے ہیں۔ عوام اور منتخب اشرافیہ کی جانب سے پان اسلامی معاملات کی اہمیت کو جتنا بڑھا چڑھا کر بیان کیا جائے گا عالمی اسلامی اداروں کے لیے بجٹ اور سیاسی کردار میں اتنا ہی اضافہ ہوگا۔ اس کے علاوہ اخوان المسلمون کے کارکن پان اسلامی لہر کے ذریعے بیرون ملک میں سیاسی مفادات حاصل کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں کیونکہ موجودہ حکومتوں کی پالیسیاں سیاسی حالات کی وجہ سے محدود ہوتی ہیں۔ تاہم کم از کم مصر میں یہ معاملہ نہیں تھا جہاں سادات کی حکومت نے 1978ء میں اسرائیل کے ساتھ ایک غیر مقبول امن معاہدہ شروع کیا تھا۔

مسلمانوں کے عالمی معاملات کے حوالے سے آگاہی پیدا کرنے کے لیے یہ کارکن پان اسلامی شناخت پر مبنی ایک مکالمہ کھڑا کرتے ہیں جس میں مسلم یکجہتی پر زور دیا جاتا ہے اور بیرونی خطرات کو اجاگر کیا جاتا ہے۔(92) شناخت یا تشخص کے حوالے سے دیگر مکالموں کی طرح یہ بھی اس قسم کے ہوتے ہیں جس میں کسی خطرے کے حوالے سے تعلق بنائی جاتی ہے، خود کو مظلوم بنا کر پیش کیا جاتا ہے اور اپنے خلاف سازشوں اور خطرات کی بات کی جاتی ہے۔ اس میں خود کو مظلوم بتاتے ہوئے دنیا بھر میں مسلمانوں کی حالت زار کا رونا رویا جاتا ہے اور اسکی وجوہات کی طرف توجہ دی جاتی ہے جیسے سیموئیل ہنٹنگٹن "کلاش آف سولائزیشنز" قرار دیتا ہے۔(93) پان اسلامی نظریات اور اسلام کو درپیش خطرات کی باتیں کرنے والے کٹر لوگوں کی تقریروں میں سابق پان اسلامی تحریکوں اور سامراج کے خلاف جدوجہد کے حوالے ہوتے ہیں تاہم حجازی پان اسلامک مکالمہ اور شعور زیادہ الارمسٹ اور زیادہ دفاعی ہوتا ہے۔ مسلم ورلڈ لیگ کے سیکرٹری محمد علی حراکن کی 1980ء کی ایک تقریر کے اقتباس سے اس کی عکاسی ہوتی ہے۔

"جہاد مسلمانوں کی کامیابی کی کنجی ہے۔ خاص طور پر ایک ایسے وقت میں جب فلسطین میں ان کا مقدس ترین قبلہ اول یہودیوں کے قبضے میں ہے۔ جب لاکھوں مسلمان پوری دنیا میں ظلم و تشدد اور جبر کا شکار ہیں۔ انہیں برما، فلپائن، نیپال، روس، کمبوڈیا، ویت نام، قبرص، افغانستان اور دیگر مقامات پر ناانصافی ظلم اور تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے حتیٰ کہ انہیں موت اور نسل کشی کا سامنا ہے۔ ہماری ذمہ داری اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہودیوں، کمیونسٹوں، دہریوں، صیہونیوں، قادیانیوں، بہائیوں اور عیسائیوں کی جانب سے اسلام اور مسلمان کے خلاف مذموم مہم چلائی جا رہی ہے۔" (94)

اس قسم کے پیغامات کو وسیع پیمانے پر پروپیگنڈے کے ذریعے پھیلایا جاتا ہے اور رسائل و جرائد میں شائع کر کے دنیا بھر میں بھیجا جاتا ہے۔ ان میں اہم ترین رسائل میں مسلم ورلڈ لیگ کا ہفت روزہ نیوز آف دی مسلم ورلڈ اور ماہنامہ جرنل آف دی مسلم ورلڈ لیگ شامل ہیں جو عربی اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر عالمی اسلامی اداروں کے اپنے اپنے رسالے ہیں۔ بجٹ میں اضافے اور نئی ٹیکنالوجی کے آنے کے بعد ان رسائل و جرائد کا معیار اور ڈسٹری بیوشن بہت بہتر ہو چکی ہیں۔ 1980ء کی دہائی میں ایسے رسائل مہنگے کاغذ پر شائع کیے جا رہے تھے جن کے صفحات پر زخمی مسلمان عورتوں اور بچوں کی کلوز اپ میں تصویریں شائع ہوتی تھیں کیونکہ اس طرح ان کا تاثر بڑھ جاتا ہے۔ ہر میگزین میں عطیات اور خیرات کی اپیل کی جاتی تاکہ مسلمانوں کی مدد کی جا سکے۔ 1970ء کی دہائی میں اخوان المسلمون نے اپنا رسالہ المجتمع کے نام سے نکالا ہوا تھا جو 1969ء کویت سے شائع ہوتا تھا جبکہ الدعوۃ نامی رسالہ 1976ء سے مصر میں چھپتا تھا۔ فاسٹ لائن جنگیں اور مسلم یکجہتی کی اپیلیں تو اس دور کے رسالوں میں بڑے پیمانے پر شائع کیا جاتا تھا تاہم عالمی اسلامی اداروں کے برعکس ان اشاعتوں بالخصوص المجتمع جیسے کم مشہور والے رسائل میں مسلمانوں کی اندرونی سیاست کو بھی جگہ دی جاتی تھی۔

حکومتوں کی جانب سے اس قسم کے پان اسلامی پروپیگنڈے کو برداشت کیا جاتا تھا کیونکہ اس میں مسلم حکومتوں کے بجائے صرف غیر اسلامی طاقتوں کو دشمن بنا کر پیش کیا جاتا تھا۔ مسلم سیاست دانوں کے لیے مقبول عام پان اسلامی پروپیگنڈے کی مخالفت میں فائدہ کم اور نقصان زیادہ تھا۔ اس کے بجائے اگر وہ اس کی حمایت کرتے تو اس سے ملک کے اندرونی مسائل

سے لوگوں کی توجہ ہٹانے میں کامیاب رہی تھی۔ اس کا نتیجہ ہے کہ مختلف حکومتیں بالخصوص سعودی عرب کی حکومت پان اسلامی اداروں کے ساتھ مسلم قوموں کی فلاح و بہبود کے بہانے کھیل میں مصروف رہتی تھی۔ (95)

اس بات کو تسلیم کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ 1970 اور 1980ء میں ہونے والی بین الاقوامی سیاسی پیش رفتوں سے پان اسلامی پیغام کو سہارا ملا اور یوں اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ اس عرصے کے دوران لبنان اور افغانستان کے واقعات پیش آئے جس کے دوران مسلمانوں کی اموات کو مجموعی طور پر مسلمانوں کی تکلیف سمجھا گیا۔ اسی عرصے کے دوران عربوں اور اسرائیل کے درمیان کشیدگی میں اضافہ ہوا جب 1978 اور 982ء میں اسرائیل کی جانب سے لبنان پر حملے کیے گئے۔ اگرچہ اس بارے میں پختہ اعداد و شمار پیش کرنا بہت مشکل ہے تاہم اس امر کا کافی حد تک اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس عرصے کے دوران اوپر بیان کیے گئے پروپیگنڈے کی وجہ سے عرب اور دیگر مسلم دنیا میں پان اسلامی جذبات کو بڑھانے میں بہت مدد ملی۔ مثال کے طور پر صرف سعودی عرب میں غیر ملکی مسلمانوں کی امداد میں ڈرامائی طور پر اضافہ دیکھنے میں آیا جو اکثر اوقات جی ڈی پی سے بھی بڑھ گیا۔ (96)

پان اسلام ازم کے علم برداروں نے دنیا بھر میں مسلمانوں کی امداد کے ذریعے بھی پان اسلامی یکجہتی قائم کرنے کی کوشش کی۔ 1970 اور 1980ء کے عشروں کے دوران اسلامی خیراتی اداروں کے نیٹ ورک میں اضافہ ہوا جس میں سے زیادہ تر کو عالمی اسلامی اداروں کی جانب سے چلایا گیا۔ (97) کافی حد تک یہ مذکورہ مغربی خیراتی اداروں کی طرح یہ اسلامی ادارے دنیا بھر میں مسلمانوں پر نظر رکھتے اور جہاں بھی ان کو مدد چاہیے ہوتی فوری طور پر ان کی مدد کے لیے تیار رہتے۔ اسی قسم کا بحران جس میں مسلمانوں کی مدد کی فوری ضرورت پیش آئی وہ 1978ء میں افغانستان میں کمیونسٹ بغاوت اور اس کے بعد 1979ء میں سوویت یونین کی طرف سے افغانستان پر حملہ تھا۔

پہلی عرب افغان حرکت پذیری

1980ء میں افغانستان میں عربوں کے ملوث ہونے کے حوالے سے جو کہانی عام بیان کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ سوویت یونین کی کھلی جارحیت کے نتیجے میں پوری دنیا میں مسلمان اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ (98) تاہم تاریخی شواہد کچھ اور کہانی سناتے ہیں۔ غیر ملکی جنگجوؤں کی

حرکت پذیری 1980ء کی دہائی کے دوسرے نصف میں دیکھنے میں آئی جبکہ پہلے نصف میں بہت تھوڑی تعداد میں عرب لڑنے کے لیے افغانستان آئے۔[99]

ویسے عرب افغان جنگجو نہیں بلکہ انسانی ہمدردی پر کام کرنے والے کارکن تھے جنہیں حجاز سے تعلق رکھنے والے حجرانی اداروں کی جانب سے بھیجا گیا تھا۔ 1980 سے 1984 کے درمیان افغان مہاجرین کی مدد کے لیے چند سو عرب لوگ پشاور پہنچے۔ مسلم ورلڈ لیگ کے کچھ وفود اور انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی مدینہ کے کچھ گروپ بھی صورتحال میں مدد دینے کے آئے۔[100] دیگر کچھ ملکوں کے ادارے بھی اس عمل میں شریک تھے تاہم پہلے چار سال کے دوران آنے والے کارکنوں میں سے اکثریت کا تعلق حجاز کی پان اسلامی برادری سے تھا۔[101] اس طرح 1987ء سے پہلے جتنے سعودی جنگجو افغانستان گئے ان میں سے اکثریت کو حجازیوں کی طرف سے بھیجا گیا۔[102]

بنیادی طور پر غیر ملکی جنگجوؤں کی حرکت پذیری کے اولین محرک ہر صورت میں پہلے بیان کیے گئے عبداللہ عزام سے تعلق رکھتے تھے۔[103] فلسطینی مبلغین جو 198 ء میں پاکستان آئے وہ اولین عرب تھے جنہوں نے افغان جہاد کے فوجی پہلو میں شرکت کی تھی تاہم اس عمل کے ابتدائی عرصے کے سب سے موثر ترین انٹرپرینیور کی حیثیت رکھتے تھے۔[104] اسلامی برادری میں عبداللہ عزام کو عرب افغان حرکت پذیریوں کا روحانی باپ قرار دیا جاتا ہے اور اس وقت کی تاریخی شہادتوں سے اس کو بھرپور حمایت حاصل تھی۔ وہ 198 ء میں پاکستان آیا اور اس کے بعد 1982ء کے بعد سے بھرتی کی ترغیب کے لیے لٹریچر شائع کرتا رہا اور اس کے بعد حقائق کے مطابق لوگوں میں ریکروٹ لایا اور 1984ء میں اس نے پشاور میں غیر ملکی جنگجوؤں کے لیے لاجسٹک آفس قائم کیے جس کا نام سروسز بیورو تھا۔ اس قسم کے اقدامات کو اہمیت اس لیے بھی ہے کہ اس بات کے شواہد ملتے ہیں کہ 1986ء سے پہلے جتنے بھی غیر ملکی جنگجو افغانستان آئے ان میں زیادہ تر عزام کی تحریروں سے متاثر تھے جبکہ مالی مدد انہیں سروسز بیورو کی طرف سے حاصل ہوئی۔[105]

اگرچہ غیر ملکی جنگجوؤں کی حرکت پذیری کے لیے کچھ دیگر گروہوں کی جانب سے بھی کوشش کی گئی لیکن طویل فاصلے کی حرکت پذیری کے سلسلے میں جو کامیابی عزام کے نیٹ ورک کے حصے میں آئی وہ 1985ء سے پہلے اور کسی کے حصے میں نہیں آئی۔[106] عزام کے اثر و رسوخ میں وہ

اسباب کی وجہ سے اضافہ ہوا۔ اول یہ کہ وہ ایک مذہبی عالم تھا اور دوئم یہ کہ اسکے پاس اسلامی برادری سے تعلقات تھے۔ اس کے پہلے مقام کی وجہ سے اس کی تحریروں کی اہمیت بڑھ گئی جبکہ دوسرے مقام کی وجہ سے وسائل اور بھرتی کے سلسلے میں اس کی اہمیت میں اضافہ ہوتا تھا۔

عزام کی فعال کار میں پنی شرکت سے ابتدائی حرکت پذیری میں اخوان المسلمون اور مسلم ورلڈ لیگ کے کردار کی عکاسی ہوتی تھی۔ عبداللہ عزام کا تعلق فلسطین کے مغربی کنارے کے علاقے سے تھا جو 1967ء کی جنگ کے دوران فرار ہو کر اردن چلا گیا تھا۔ گرچہ عزام نے 1970ء کے عشرے کا زیادہ تر حصہ عمان میں گزارا لیکن اس کے پاس اسدی کارکنوں کے ساتھ گہرے تعلقات تھے۔ اس نے 1968ء میں سعودی عرب میں استاد کے طور پر بھی مختصر وقت گزارا۔ 1970-72ء میں قاہرہ میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران اس نے مصری اخوان المسلمون کے ساتھ گہرے روابط قائم کر لیے۔[107] اور 1970ء کے عشرے کے اواخر میں عالمی اخوان المسلمون کے اجلاسوں میں بھی شرکت کرتا رہا۔ 198 کے اوائل میں اسے اردن یونیورسٹی سے مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا گیا اور اس کی سیاسی حمایت پر سے اردن سے بھی نکلنے کے لیے کہا گیا۔ وہ سعودی عرب ہجرت کر گیا جہاں اخوان المسلمون کے ساتھ اس کے تعلقات کے نتیجے میں اسے شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی جدہ میں ملازمت مل گئی۔ عزام کے بقول پاکستان جانے کے لیے اسے تحریک مصری اخوان المسلمون کے سیکرٹری کمال السنانیری کے ساتھ 1981ء میں مکہ میں ہونے والی ملاقات کے بعد ملی جو اخوان المسلمون کے زیر اہتمام پاکستان کے ایک دورے سے حال ہی میں واپس لوٹا تھا۔[108] السنانیری چند ماہ بعد پاکستان میں منتقل ہونے کا ارادہ رکھتا تھا اور اس نے عزام جس سے اس کی اخوان المسلمون کے اجلاسوں میں ملاقات ہوتی رہی تھی، کو قائل کیا کہ وہ بھی پاکستان چلے۔ السنانیری پاکستان نہ جا سکا کیونکہ مصری پولیس کی جانب سے اس وقت گرفتار اور ہلاک کر دیا گیا جب وہ قاہرہ میں اپنے خاندان کو ملنے جا رہا تھا۔[109] عزام نے تب پاکستان جانے کا پکا ارادہ کر لیا جہاں اسے نو قائم شدہ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں ملازمت مل گئی جس کی میزبانی کر رہی اور راست مسلم ورلڈ لیگ کی جانب سے تنخواہیں دی جاتی تھیں۔[110] چنانچہ 1981ء میں اس کی اسلام آباد آمد سے لے کر 1986ء میں اس کی مستقل پشاور منتقلی تک اسے مسلم ورلڈ لیگ کی جانب سے تنخواہ ادا کی جاتی رہی۔

تاہم یہ بات ابھی تک غیر واضح ہے کہ اسے کس چیز نے قائل کیا کہ وہ افغانستان کی مالی امداد کے بجائے غیر ملکی جنگجوؤں کے جہاد میں شریک ہونے کا مطالبہ کرے۔ شاید وہ یہ یقین رکھتا تھا کہ جہاد کے حوالے سے بیسویں صدی کا اسلامی قانونی نظریہ غلط تھا جو کہ قومی ریاستوں کو یہ اختیار دیتا تھا کہ وہ اپنے شہریوں کو غیر ملکی جنگ میں شرکت کرنے کی اجازت دیں یا نہ دیں۔ دوسری جانب جہاد کے حوالے سے کلاسیکی روایات میں قومی ریاستوں کا کوئی ذکر نہیں۔ مزید براں یہ کہ ایک غیر ریاستی باشندے کے طور پر وہ دربدر ہوا اور جو خود ایک مقبوضہ ملک کا باشندہ تھا جسے اس کے ہمسایہ ممالک آزاد کرانے میں ناکام رہے تھے اس کے پاس قومی ریاست پر اعتماد کے لیے جواز بہت کم تھے۔ اس کے علاوہ غیر ملکی جنگجوؤں کے حوالے سے اس کے اور بھی کئی مقاصد تھے مثال کے طور پر غیر ملکی جنگجوؤں کی متعدد پارٹیز کی حوصلہ افزائی کرنا تاکہ آئندہ کسی بھی مقبوضہ اسلامی ملک کی مدد کی راہ کھل سکے جیسے کہ خود اس کا وطن فلسطین تھا۔ عزام نے 1969ء میں اردن اسرائیل بارڈر پر فلسطینی مجاہدین کے درمیان ایک سال گزارا اور وہ اسرائیل کے خلاف مسلح جدوجہد کے لیے بہت پرعزم تھا۔ حقیقت میں وہ فلسطین کو افغانستان سے زیادہ اہم میدان جنگ تصور کرتا تھا۔ (112)

1980ء کی دہائی میں عزام کی جانب سے مجاہدین کی بھرتی پیغام اس لیے بھی گونجتا ہوا سنائی دے رہا تھا کیونکہ اس سے پان اسلام ازم کا مکالمہ بھی جنم لے رہا تھا جس سے کہ لوگوں کی بڑی تعداد کو عشروں سے واسطہ پڑ رہا تھا۔ جب کوئی یہ سمجھتا تھا کہ مسلمان خطرے میں ہیں اور ان کی مدد کی جانی چاہیے تو اس میں سب سے پہلے ان کی فوجی مدد کی طرف ہی خیال جاتا تھا۔ اور یہ ایک ایسا کام تھا جو مسلم ممالک رضاکار مجاہدوں کو اربوں ڈالر کے تھیلوں کی رسائی کی صورت میں کر رہے تھے۔

عزام اور حجازی پان اسلامسٹوں کی اہمیت کا جائزہ دینے کے لیے ایک فرضی منظرنامے کے بارے میں غور کیا جائے جس میں وہ غیر موجود ہوں۔ (113) افغانستان کی ریاستی حمایت اتنی ہی رہی ہوگی لیکن غیر ملکی جنگجوؤں کی حمایت بہت کم ہوگی اور غیر ملکی جنگجوؤں کا نظریہ بہت کم بااثر ہوگا۔ مصری اور شامی انقلابی محفوظ جنت کی تلاش میں آتے ہوں گے لیکن ان کی ریاستیں انہیں سفر سے روکنے کے علاوہ ان کی طرف سے بین الاقوامی حیران کن رقوم اکٹھی کرنے سے بھی روک پاتی ہوں گی جیسا کہ عزام کرتا تھا۔ کوئی عالم جیسے نظریہ بھی تیار کر لیتا ہے تاہم یہ کوئی عام شخص

ہوتا ہے جیسے محدود مذہبی اختیار حاصل ہوتا ہے (عزام واحد عرب ملا تھا جو حالی طریقے سے افغانستان کے جہادیوں کی بھرتی کر رہا تھا۔) قصہ مختصر غیر ملکی جنگجوؤں کی کیٹیگری بنیادی طور پر حرکت پذیری سے پہلے کے نظریوں اور چند مہم جوئی کے شوقین افراد پر مشتمل ہوتی۔ غیر ملکی جنگجوؤں میں سے بہت کم جنگ کے بعد زندہ بچے لیکن زیادہ امکان یہ ہوگا کہ اس کی تحریک اس قدر وسیع نہیں ہوتی جتنی کہ آج ہے۔

غیر ملکی جنگجوؤں کی تحریک کا ابھرنا کیسے ناگزیر تھا؟ ایک جواب تو غیر ملکی جنگجوؤں کا نظریہ پان اسلام ازم کی فطری توسیع تھا جس کے ابھرنے کی مختلف وجوہات کے ایک بڑے مجموعے پر تھی جن میں سے کئی سٹرکچرل تھے۔ پان اسلام ازم کے پھیلاؤ کو حقیقی طور پر جس بیرونی واقعے نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ 973ء کا تیل کا بحران تھا جس کے نتیجے میں حجازی عالمی اسلامی اداروں کو مالی وسائل پر وسیع پیمانے پر رسائی حاصل ہوئی۔ دوسری جانب دیکھا جائے تو افغانستان پر سوویت حملے کے بغیر اور عبداللہ عزام کی غیر موجودگی کی صورت میں غیر ملکی جنگجوؤں کی تحریک وہ شکل شاید اختیار کرتی جو اس نے کی۔ قصہ مختصر یہ کہ غیر ملکی جنگجوؤں کے نقاشا کے ابھرنے پر تو بہت زیادہ زور دیا گیا لیکن اس کی سطح پر نہیں۔

حاصل مطالعہ

یہ مضمون بین الاقوامی جہاد کے نظریے کے بارے میں ایک نئی داستان کو دہراتا ہے۔ ماضی کے مطالعات میں جہاد کے حوالے سے سید قطب، وہابی ازم اور افغان جہاد کے بیچ دیاتی مساوات پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے تاہم اس سلسلے میں وضاحتیں جیسا کہ میں آپ کو دکھا چکا ہوں ناکافی ہیں۔ اسکے بجائے میں غیر ملکی جنگجوؤں کی صورت حال کے حوالے سے اس کے ماخذ کا سراغ پان اسلامی تشخص کی تحریک تک لے جاتا ہوں جو 1970ء کی دہائی میں ایک قدرتی عمل کے ذریعے حجاز کے علاقے میں ابھری۔

میرے نتائج بلاشبہ بین الاقوامی اسلامی عسکریت پسندوں کے بارے میں سکالرز کی سوجھ بوجھ ہے اس کو متاثر کرتی ہے۔ یہ ہمیں قابل ذکر حد تک اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ ہم جہاد کو چند مختلف اہم کرنے کے حوالے سے مذہب اور سیاست کی اہمیت کی بحث سے اوپر جا کر سوچیں جو کہ ایک سی بحث ہے جو ان لوگوں کی مخالفت کرتی ہے جو القاعدہ کو ایک ایسی تنظیم سمجھتے ہیں جو تشدد کا راستہ بن چکی ہے اور جو اس کو اسلامی دنیا کے بارے میں مغرب کی پالیسیوں کے رد عمل کے

طور پر دیکھتے ہیں۔ بین الاقوامی اسلامی عسکریت کے پیچھے بلاشبہ ایک نظریہ ہے لیکن اس وقت ہم جس نظریے کی بات کر رہے ہیں یعنی انتہا پسند پان اسلام ازم وہ ایک مذہبی حیاتی تعبیرات سے زیادہ قوم پرستی سے زیادہ تعلق رکھتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ 1991ء سے 2006ء کی دہائی کے دوران مغرب کی پالیسیوں نے بین الاقوامی عسکریت کو بڑھاوا دیا لیکن اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ان پالیسیوں کے حوالے سے بہت شدید نوعیت کی حساسیت پہلے ہی موجود تھی۔ اس کے علاوہ غیر مغربی اور غیر مسلم ممالک کے اعمال جیسے روس کی افغانستان اور چیچنیا کے خلاف جارحیت، اسرائیل کا فلسطین پر حملہ اور سربیا کی بوسنیا پر جارحیت وغیرہ بھی پان اسلامی مظلومیت کے بیانیے کو اتنی ہی طاقت دے چکے ہیں جتنی کہ امریکی خارجہ پالیسی دیتی ہے۔

غیر ملکی جنگجوؤں اور بین الاقوامی دہشت گردوں کے درمیان جو فرق ہے وہ اسکالروں کو اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ وہ یہ دکھا سکیں کہ اگرچہ غیر ملکی جنگجو اور القاعدہ ایک ہی پان اسلامی تحریک سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ان کی سیاسی ترجیحات بالکل ایک جیسی نہیں ہیں۔ اہم ترین بات یہ ہے کہ یہ دونوں محدود وسائل کے حصول کے لیے ایک دوسرے سے مسابقت کرتے ہیں۔[114] یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ غیر ملکی جنگجوؤں کو مسلم دنیا میں مسلسل بہت اونچے درجے کی عوامی مقبولیت حاصل رہی ہے اور ان کے لیے فنڈ جمع کرنا اور بھرتی کرنا القاعدہ سے زیادہ آسان ہے۔[115] ان دونوں کے درمیان افراد کے تعلق اور تحریک کی موجودگی سے تجزیاتی فرق کی قدر میں کمی نہیں ہوتی اور اگر کوئی سمجھوتہ اس تناظر میں دونوں کے درمیان تعلق کی صورت کے بارے میں مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔

ان نتائج سے کم سے کم دو اہم پالیسی مضمرات سامنے آتے ہیں۔ اول یہ کہ جو لوگ غیر ملکی جنگجوؤں کی بھرتی کو روکنا چاہتے ہیں ان کو یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ بھرتی کے پیغامات کا انحصار نہ صرف پیچیدہ اطلاعاتی وسائل پر ہوتا ہے بلکہ سادہ طریقے سے اس بات پر بھی ہوتا ہے کہ لوگوں میں یکجہتی کے احساس کے لیے ایک اپیل پیدا کی جائے۔ چنانچہ مغربی حکومتوں کو شدید نوعیت کے مسلکی نظریوں کے پھیلاؤ سے کم فکرمند ہونا چاہیے بمقابلہ ان مضامین، عام مغرب مخالف رپورٹنگ کے جو کہ الجزیرہ جیسے ٹی وی چینل کرتے ہیں اور اس پروپیگنڈے کے پھیلنے سے جو انٹرنیٹ پر بڑھ رہا ہے۔ مزید برآں غیر ملکی جنگجوؤں کی بھرتی پر قابو پانے کے لیے ایک طویل المیعاد پالیسی میں وہ حکمت عملیاں بھی شامل ہونی چاہئیں جس سے پان اسلام ازم کو کمزور کیا جا

سکے جیسے کہ اس بارے میں آگاہی پیدا کی جائے کہ پان اسلام ازم کے علم بردار جس قسم کا پروپیگنڈا کرتے ہیں اس میں حقائق کس قدر مسخ ہوتے ہیں اور یہ کہ ریاستی قوم پرستی اور شناخت کی دیگر مقامی صورتوں کو فروغ دیا جائے۔ دوم یہ کہ مغربی پالیسی سازوں کو اس بارے میں اچھے طریقے سے مشاورت دی جانی چاہیے کہ وہ اس حقیقت کے بارے میں اپنی عوامی سفارت کاری میں شامل کریں کہ مسلمانوں کی اکثریت غیرملکی جنگجوؤں اور بین الاقوامی دہشت گردوں کو مختلف نظر سے دیکھتی ہے۔ مغرب میں ان دونوں کو آپس میں ملانے کا رجحان گیارہ ستمبر کے حملوں کے بعد مغرب اور مسلمانوں کے درمیان رابطے حوالے ایک بڑے مسئلے کا منبع ہے۔ سوم اسی وقت مغرب اور اسلامی حکومتوں دونوں کو غیرملکی جنگجوؤں کی حمایت پسندی کی روک تھام کی کوششوں کو جاری رکھنا چاہیے کیونکہ القاعدہ کے ارکان کی اکثریت اپنے کیریئر کا آغاز جنگی رضاکاروں کے طور پر ہی کرتی ہے۔

بڑے پیمانے پر غیرملکی جنگجوؤں کی عالمی تحریک کے ابھرنے کے ضمن میں دو نکات بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ اول، ایک ایسا نظریہ جو ایک تصوراتی بین الاقوامی حلقوں کے درمیان یکجہتی پیدا کرتا ہے۔ دوم، بین الاقوامی کارکنوں کے درمیان ایک طاقتور کیڈر۔ ان میں پہلا تجزیاتی نکتہ مقابلتاً عام ہے جبکہ دوسرا عام نہیں ہے کیونکہ ریاست اس قسم کے کیڈر کی تشکیل کی عام طور پر اجازت نہیں دیتی۔ بیسویں صدی میں بڑے پیمانے پر غیر مسلم غیرملکی جنگجوؤں اور حتیٰ غیرملکی جنگجوؤں کی حرکت پذیری کے صرف دو واقعات موجود ہیں۔ ان میں ایک ہسپانوی خانہ جنگی 1930ء کے زمانے میں کام کرنے والا انٹرنیشنل بریگیڈ اور دوسرا عرب اسرائیل جنگ 1948ء میں تشکیل پانے والا یہودی رضاکاروں کا واقعہ تھا۔ ان دونوں واقعات میں حرکت پذیری بین الاقوامی کارکنوں کے طاقتور کیڈر کی جانب سے ہوئی جو کہ بالترتیب کومنٹرن اور جیوش ایجنسی کی صورت میں تھی۔ ہماری پان اسلام پسندوں کی طرح ان تنظیموں کو ریاستوں کی جانب سے جزوی خودمختاری حاصل تھی جبکہ انہیں ریاستوں جیسے وسائل اور مراعات حاصل تھیں۔ یہ تنظیمیں غیرمعمولی حالات میں سامنے آئے۔ کومنٹرن روسی انقلاب کے فوری بعد 1919ء میں کی جبکہ نازیوں کی جانب سے اختیاری سلوک کے نتیجے میں 1930ء میں جیوش ایجنسی سامنے آئی جبکہ ہماری پان اسلامی تحریک 1970ء کی دہائی میں ایک وہ خیز اور تیزی سے پھیلتی ہوئی سعودی ریاست میں بنائی گئی۔ دیگر جن بین الاقوامی شناختوں کی جانب سے مستقبل میں غیرملکی جنگجوؤں کی نئی تحریکوں کا جنم ہو سکتا ہے ان کو اسی طرح

اچھی طرح منظم، خطرات سے لاابالی اور خود مختار کیڈرز کی ضرورت ہوگی۔

اس تناظر میں غیر ملکی جنگجوؤں کی مسلم تحریکوں کو نئے چیلنج امکانات کا سامنا ہے۔ ایک جانب سے تو حکومتوں کی جانب سے بڑھتا ہوا دباؤ جس کی وجہ سے بڑے پیمانے پر مستقبل میں کسی تحریک کے ابھرنے کا امکان بہت کم ہوگا۔ دوسری جانب تربیت کی وجہ سے غیر ملکی جنگجوؤں کے حوالے سے پروپیگنڈا بڑے پیمانے پر دستیاب ہوگا اور سفری اخراجات بھی کم ہوں گے۔ چنانچہ اگر مسلم دنیا میں کوئی بڑا تنازعہ سامنے آیا تو امید ہے کہ غیر ملکی جنگجو دوبارہ ابھریں گے۔

☆☆☆☆☆

حواشی

(1) انتھونی کارڈس مین "Iraq's Evolving Insurgency" ورکنگ ڈرافٹ (واشنگٹن ڈی سی سنٹر فار سٹریٹجک اینڈ انٹرنیشنل سٹڈیز، دسمبر 2005) صفحہ نمبر 129

(2) دیکھیے مثال محمد ایم حافظ

"Jihad After Iraq: Lessons from the Arab Afghans"

سٹڈیز ان کانفلکٹ اینڈ ٹیررازم، والیوم 32 نمبر 2 (فروری 2009)

(3) 1948 کی عرب اسرائیل جنگ میں مسلم غیر ملکی جنگجو شریک تھے تاہم ان میں سے زیادہ تر عرب لیگ کی سپریم آرمی آف سالویشن کے تنخواہ دار تھے اور یوں اس طرح پرائیویٹ نہیں تھے جس طرح بعد میں سامنے آئے۔

(4) افغانستان کے بارے میں دیکھیے انتھونی ڈیوس کی کتاب

""Foreign Combatants in Afghanistan

(5) ڈیوڈ میلیٹ کی کتاب

"Foreign Fighters, Transnational Identity in Civil

"Conflicts

(6) جلاوطن باغیوں کے حوالے سے دیکھیے ٹرین اے بیپٹ کی کتاب

"The Internationalization of Terrorist Campaigns"

(7) دیکھیے مثال کے طور پر ڈوناٹیلا ڈیلا پورٹا اور سڈنی ٹارو کے ایڈیٹ کردہ
"Transnational Protest and Global Campaign: People, Power and Passions"

(8) دیکھیے حنا ڈرکی "Unholy Terror"

(9) انسر جنسی کی تعریف کے لیے دیکھیے جیمز ڈی فیرون اور ڈیوڈ ڈی لائٹن کی
"Ethnicity, Insurgency, and Civil War"

(10) دیکھیے تھامس ہیگ ہیمر کی
"Jihadi Salafis or Revolutionaries? On Religion and Politics in the Study of Militant Islamism"

(11) عصری اسلامی ریوائیول کے لیے دیکھیے ووئن حداد، جان ال ووس اور جین ایل اسپوسیٹو کی
"The Contemporary Islamic Revival: A Critical Survey and Bibliography"

(12) ملاحظہ 'Foreign Fighters' صفحہ نمبر ۵

(13) ادریان سالیہان
"Rebels without Borders: Transnational Insurgencies in World Politics"

(14) دیکھیے تھامس ہیگ ہیمر کی "Classical and Global Jihadism in Saudi Arabia"

(15) لیمن یگ، "The Military Preparations of the Arab Community in Palestine" صفحہ نمبر 190

(16) دیکھیے آر ڈین رچرڈسن
"Comintern Army: The International Brigades and the Spanish Civil War"

(17) اسے جیرف ہیکل میں
"American Volunteers and Israel's War of Independence"

(18) میں اسلامی دنیا کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہوں: "ایسے تمام ممالک اور ایسے تمام نیم قومی صوبے جہاں مسلمانوں کی آبادی کم از کم پچاس فیصد ہے۔"

(19) فیرون اینڈ لاکین کی "Ethnicity, Insurgency, and Civil War"

(20) ریکارڈ کے لیے میں غیر ملکی جنگجوؤں کی بھرتی کے ان واقعات کو شامل نہیں کرتا جو بڑی بڑی مقامی بغاوتوں میں شریک نہیں تھے جیسے اقتصادی طرف سے سوڈان اور یمن میں برپا کی گئیں۔

(21) اس میں ایک ممکنہ استثنیٰ اوائل 1970ء کی اومان کی ظفار بغاوت ہو سکتی ہے جس میں خلیج کے بائیں بازو کے لوگوں نے شرکت کی تھی گرچہ زیادہ تر یمن کے بارڈر پر قیام کیا تھا اور لڑائی میں شریک نہیں ہوئے تھے۔

(22) اعداد و شمار میرے اپنے ہیں جن کی بنیاد دستیاب بنیادی اور ثانوی ذرائع ہیں جن کی تفصیل نیچے پڑھیے۔

(23) کارڈز میں "Iraq's Evolving Insurgency" صفحہ نمبر 129 اور حافظ کی "Suicide Bombers in Iraq" صفحہ نمبر 71

(24) رینوس پانڈ "Middle East Islamism in the European Arena" مڈل ایسٹ ریویو آف انٹرنیشنل افیئرز صفحہ نمبر 70

(25) مثال کے لیے دیکھیے، جان کے کولی کی
"Unholy Wars: Afghanistan, America, and International Terrorism"

(26) مثال کے طور پر دیکھیے، ڈیل ایف ایکل مین "Trans-State Islam and Security" اسکے علاوہ سوزن رڈولف اور جیمز پسکاٹوری کے ایڈیٹوریل

(27) سٹیو کول، "Ghost Wars: The Secret History of the CIA, Afghanistan, and Bin Laden, from the Soviet Invasion to September 10, 2001"

(28) پیٹر ایل برگن، "The Osama bin Laden I know: An Oral History of al Qaeda's Leader"

(29) مارک ہوبرجر: "Warriors of the Prophet: The Struggle for Islam" مسلح نصرتیں

(30) احمد زیدان کے اعداد وشمار کے مطابق وسط 1989 تک 242 عرب ہلاک ہوئے۔ دیکھیے جوناتھن رینڈل کی "Osama: The Making of a Terrorist"

(31) مثال کے لیے دیکھیے مصطفیٰ حامد "Cracks in the Foundation: Leadership Schisms in al-Qa'ida, 1989-2006"

(32) قابل بھروسہ اعداد وشمار کا کوئی وجود نہیں لیکن پال ٹملٹی کے مطابق چیچنیا کی جنگ میں شریک عرب گرفتاری یا ہلاکت کا آسان شکار تھے اور چیچنیا میں لڑنے والے بہت کم عرب اس مصنف کے ذرائع میں ظاہر کیے گئے۔

(33) مثال کے لیے دیکھیے، فلٹر اینڈ فش مین "Al-Qaeda's Foreign Fighters in Iraq" اور ہیگ ہیمر کی "Jihad in Saudi Arabia"

(34) القاعدہ پاکستان، سوڈان اور افغانستان میں اپنے کچھ عرب ساتھیوں کو دو سو سے اڑھائی سو ڈالر معاوضہ دیتی تھی۔ یہ لوگ غیر ملکی جنگجو نہیں تھے کیونکہ وہ لڑائی میں شریک نہیں تھے۔ 1990ء کے اواخر میں افغانستان میں معاوضہ ان کو دیا جا رہا تھا جو القاعدہ کی تنظیموں کو چلا رہے تھے، ان عرب لڑاکوں کو نہیں جو طالبان کے ساتھ مل کر شمالی اتحاد سے نبرد آزما تھے۔

(35) دیکھیے [illegible] مارٹن کی "Ideology and Politics"

(36) دیکھیے، ماسبق Foreign Fighters

(37) مستثنیٰ میں چیچنیا اور تاجکستان شامل ہیں جہاں مقامی لوگ غیر ملکی جنگجوؤں کو مدد کے لیے بلاتے تھے۔ دیکھیے، پال ٹملٹی کی "The Rise and Fall of Arab Fighters in Chechnya"

(38) بیثانی لاسینا اور ڈاکٹر نیلز پیٹر گلیڈش کی "Monitoring Trends in Global Combat: A New Dataset of Battle Deaths"

(39) خانہ جنگی میں مذہب کے بڑھتے ہوئے کردار کے بارے میں دیکھیے، جوناتھن فوکس The Rise of Religious Nationalism and Conflict: Ethnic Conflict and Revolutionary Wars جرنل آف پیس ریسرچ، والیم اکتالیس، نمبر چھ

(40) دیکھیے، ولیم کن "When Seperatists Become Islamists"

(41) اولیور رائے، "Islam and Resistance in Afghanistan"

(42) مورو اسلامک لبریشن فرنٹ کے اور یہ دیگر تعلقات کے بارے میں دیکھیے تھامس ایم مکینا کی، "Muslim Rulers and Rebels: Everyday Politics and Armed Seperatism in the Southern Philippines"

(43) فرانسس کیرن کراس کے مطابق 940-50 کے درمیان کیتھولک چرچ کے احتجاجات میں بڑے پیمانے پر کمی ہوئی اس کے بعد 1950-.980 کے درمیان مزید کمی ہوئی جس کے بعد احتجاجات منظم ہو گئے۔

(44) رابرٹ آر بیانچی کے مطابق کسی بھی دس سالہ عرصے کے دوران جس عرصے میں حاجیوں کی تعداد میں سب سے زیادہ اضافہ ہوا وہ 1965-75 کے درمیان تھا جب حاجیوں کی تعداد ڈھائی لاکھ سے بڑھ کر دو لاکھ تک پہنچ گئی جبکہ فضائی ذریعے سے آنے والوں کی تعداد میں پہلے سے بڑھ کر سو فیصد ہوگئی۔

(45) مائیکل بونر، Jihad in Islamic History: Doctrines and Practice

(46) مثال کے طور پر سعودی عرب میں اخبارات کی اشاعت 1975 میں دس فی ہزار سے 1984 میں 47 فی ہزار ہوگئی۔ اس طرح ٹی وی دیکھنے والوں کی تعداد میں بھی بڑے پیمانے پر اضافہ دیکھنے میں آیا۔

(47) ڈیٹا سیٹ Foreign Fighters Observation Set Data

(48) فضل رحمان، Pioneers of Islamic Revival

(49) رچرڈ پی مچل The Society of the Muslim Brothers

(50) اسلام ازم کی تعریف کے جائزے کے لیے دیکھیے مہدی مظفری "What Is Islamism? History and Definition of a Concept"

(51) اولیویر رائے "The Falure of Political Islam"

(52) مثال کے لیے دیکھیے ڈونا ڈیلا پورٹا، Socia Movements, Political Violence, and the State: A Comparative Analysis of Italy and Germany

(53) ان کی ایک بڑی تعداد سعودی عرب سے تعلق رکھتی ہے اور ان میں سے کوئی انقلاب پسند تنظیم کا حصہ تھے۔ دیکھیے ہیگہیمر کی "Jihad in Saudi Arabia"۔

(54) دیکھیے کیپل کی "جہاد" (صفحہ نمبر 219-222) اور ہیگہیمر کی "Jihad in Afghanistan and the emergence of Salafi jihadism"

(55) دیکھیے ہیگہیمر کی کتاب "Jihad in Saudi Arabia"

(56) اوپر والی کتاب دیکھیے

(57) دیکھیے ایوین ایف کوہلمین کی کتاب "The Role of Islamic Charities in International Terrorist Recruitment and Financing"

(58) دیکھیے جان ولسن کی کتاب "Introduction to Social Movements"

(59) دیکھیے احمد موفق کی کتاب "The Afghan Arab Media at Jihad"

(60) دیکھیے کوہلمین کی کتاب "Al-Qaeda's Jihad in Europe"

(61) دیکھیے عمر اسیف کی کتاب "Objectives and Types of Jihad"

(62) دیکھیے فواز اے گرجیز کی کتاب "The Far Enemy Why Jihad Went Global"

(63) دیکھیے جے جانس جانس کی کتاب "The Neglected Duty The Creed of Sadat's Assassins and Islamic Resurgence in the Middle East"

(64) میں راسخ الاعتقادی کی تعریف اس طرح کرتا ہوں: "بیسویں صدی کے تربیت یافتہ اسلامی سکالروں کی اکثریتی رائے۔"

(65) رنجل سکاٹ کی رپورٹ "An Official Islamic Response to the Egyptian al-Jihad Movement" جرنل آف پولیٹیکل آئیڈیالوجیز (فروری 2003)

(66) دیکھیے بروس لارنس کی "Messages to the World: The Statements of Osama bin Laden"

(67) دیکھیے الانصار العرب فی افغانستان" صفحہ نمبر 89

(68) دیکھیے ہیگ ہیمر کی "Jihad in Saudi Arabia"

(69) اردن سے تعلق رکھنے والے مشہور انقلاب پسند محمد المقدسی نے اپنے پیروکاروں کو خودکشیاں اور چھپ جانے سے روک دیا تھا اور کہا تھا کہ ایسا کرنے سے ان کے علاقے خالی ہو جائیں گے

(70) دیکھیے الشرق الاوسط کی کتاب "The Story of Arab Afghans from their entry into Afghanistan to their departure with the Taliban"

(71) ڈیوڈ کک کی کتاب "Understanding Jihad" دیکھیے

(72) دیکھیے جان کیلسے کی کتاب "Arguing the Just War in Islam"

(73) دیکھیے ولز اسل، کرسٹین فیئر اور سلیمان شیخ کی رپورٹ "Consenting to a Child's Decision to Join a Jihad: Insights from a Survey of Militant Families in Pakistan" سٹڈیز ان کنفلکٹ اینڈ ٹیررازم (نومبر 2008)

(74) دیکھیے ڈیوڈ لاکن کی "National Revivals and Violence"

(75) دیکھیے ڈوگ مک ایڈم، جان ڈی مک کارتھی اور میئر این زالڈ کی "Comparative Perspectives on Social Movements: Political Opportunities, Mobilizing Structures, and Cultural Framings"

(76) سماجی تحریک کا بہت زیادہ منتشر ہونا تحریکوں کے ابھرنے کی وضاحت پیش کرتا ہے کہ ان تحریکوں کے جنم لینے کی۔ دیکھئے ڈاگ مک ایڈم کی "Initiator and 'Spin-off' Movements: Diffusion Processes in Protest Cycles"

(77) دیکھئے پال آر برس کی کتاب "Language, Religion, and Politics in North India" اور جیک سائنڈر کی کتاب "From Voting to Violence: Democratization and Nationalist Conflict"

(78) دیکھئے برجسن کی "The Syed Qutb Reader" اور سید خاطب کی "The Power of Sovereignty: The Political and Ideological Philosophy of Sayyid Qutb"

(79) دیوڈ کامنز کی کتاب "The Wahabi Mission and Saudi Arabia"

(80) دیکھئے ڈیمن وانز شیلڈ کی کتاب "Islamic internationalism in the 20th century"

(81) دیکھئے سامسن لینگ ووکس کی "Identity Movements"

(82) دیکھئے قرآن کی سورۃ 3 میں آیت نمبر 110 اور کیمر لینک کی "Pan-Islamism in the Modern World: Solidarity and Conflict among Muslim Countries"

(83) دیکھئے شلڈ کی "Islamic internationalism in the 20th century"

(84) دیکھئے نوید اے ایس شیخ کی کتاب "The New Politics of Islam: Pan-Islamic Foreign Policy in a World of States"

(85) دیکھئے سٹیفن لاکروئکس کی کتاب "Fields of discord: A political sociology of Islamism in Saudi Arabia"

(86) دیکھئے عوپ روائی کی کتاب۔

(87) دیکھئے کیپل کی کتاب "Jihad"

(88) دیکھئے حسام تمام کی کتاب "The Brotherhood's International Organization...the promise, the course, and the result"

(89) دیکھئے شوزی کی کتاب "Islamic Internationalism in 20th Century"

(90) دیکھئے ہارٹوگس کی کتاب "Princes, Brokers, and Bureaucrats. Oil and the State in Saudi Arabia"

(91) ڈاکٹر ڈورونسورو کی کتاب "Revolution Unending: Afghanistan, 1979 to the Present"

(92) دیکھئے ولیم آکشوالڈ کی کتاب "Saudi Arabia and the Islamic Revival"

(93) دیکھئے سیموئل ہنٹنگٹن کی کتاب "The Clash of Civilizations and the Remaking of World Order"

(94) دیکھئے محمد علی حراکی کی "Duty of Implementing the Resolutions" جرنل آف مسلم ورلڈ لیگ (نمبر 6) 1980۔

(95) دیکھئے ہیگہیمر کی "Jihad in Saudi Arabia"

(96) دیکھئے عبدالرحیم محمود جمیس کی "The popular committees for the support of Palestine's mujahideen in the Kingdom of Saudi Arabia"

(97) دیکھئے عبدالرحمن گھندور کی "Humanitarian jihad: Inquiry into the Islamic ONG"

(98) مصنف نے سعودی عرب میں ریاض میں انٹرویو لیے۔

(99) عبداللہ عزام کی "Signs of the Merciful in the Afghan jihad"

(100) مثال کے طور پر دیکھئے محمد المجذوب کی "The Birth of Afghan Arab"

(101) دیکھئے عامر، ناور، ہشام قاری کی "Arabs in Afghan Jihad"

(102) دیکھئے ہیگہیمر کی "Jihad in Saudi Arabia"

(103) دیکھئے جان کی ایم کالورٹ کی "The Striving Sheykh Abdullah Azzam and the Revival of Jihad"

(104) دیکھیے واحد بروان کی "Abdul Wahid Al-Masri: A Biographical Sketch"

(105) دیکھیے مصری کی "الانصار العرب فی افغانستان"۔

(106) دیکھیے ریسا کی "Seeds of Terror: An Eyewitness Account of Al-Qaeda's Newest Center of Operations in Southeast Asia"

(107) دیکھیے ابو روس اور سعید کی "Al-Alim wal-mujahid wal-shahid al-Shaykh Abdallah Azzam"

(108) مصنف نے عزام کے گھر والوں کے انٹرویو لیے۔ (عمان 2006)

(109) دیکھیے ایمن الظواہری کی "The knights under the Prophet's banner"

(110) دیکھیے روس اور سعید کی "Al-Alim wal-mujahid wal-shahid al-Shaykh Abdallah Azzam" (صفحہ نمبر 137)

(111) دیکھیے "Abdallah Azzam, Hamas: Historical roots and charter"

(112) افغانستان کے سب سے مشہور فتوی میں بھی کہا گیا ہے کہ "جو شخص فلسطین میں لڑ سکتا ہے وہ وہیں لڑے"

(113) دیکھیے جیمز ڈی فیرون کی "Counterfactuals and Hypothesis Testing in Political Islam"

(114) دیکھیے ہیگھمر کی "'Classical' and 'Global' Jihadism in Saudi Arabia"۔

(115) دیکھیے ہیگھمر کی "Jihad in Saudi Arabia"

طالبان کے مالی وسائل

کیتھرین کولنز اور اشرف علی

اپریل 2010ء

خلاصہ

افغانستان اور پاکستان میں موجود جنگجو قوتیں صرف نظریات پر زندہ نہیں رہ سکتیں بلکہ انہیں دو انتہائی لازمی وسائل کی ضرورت ہوتی ہے جن میں ایک پیسہ اور دوسرا افرادی قوت ہے۔ جب تک امریکہ اور اس کے اتحادی طالبان اور اس کے جنگجوؤں کو ملنے والے مالی امداد میں قابل ذکر حد تک کمی نہیں کرتے اس وقت عسکریت پسندی کو شکست دینا اور افغانستان کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنا اور پاکستان میں جمہوریت کے لیے ضروری سیاسی استحکام حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس بات کو سمجھا جائے کہ آخر عسکریت پسندوں کو سرحد کے دونوں اطراف سے مالی مدد کیسے ملتی ہے تاکہ ان پوائنٹس کو شناخت کیا جائے جس پر دباؤ ڈال کر طالبان کے لیے مالی امداد کو کم کیا جا سکے اور طالبان اور ان کے ساتھیوں کو ان فنڈز سے محروم کر دیا جائے جن کی ان کو لڑائی کے لیے ضرورت ہے۔

تاحال دہشت گردی کے خلاف جنگ کے حوالے سے معاشی محاذ پر ریکارڈ کچھ حوصلہ افزا نہیں ہے۔ امریکی انٹیلی جنس افسروں، امریکی ڈرگ انفورسمنٹ ایڈمنسٹریشن حکام، عالمی

دیگر ذرائع، بیرونی ماہرین اور مقامی حکام سے کیے جانے والے انٹرویوز سے یہ اتفاق رائے سامنے آیا ہے کہ اس بارے میں حتمی طور پر یہ کوئی نہیں جانتا کہ دہشت گردوں کے پاس کتنی رقم آ رہی ہے اور خاص طور پر یہ کہاں سے آ رہی ہے۔ منشیات کی تجارت اور دیگر جرائم جیسے کہ پوست کی پیداوار کی حفاظت اور ان سے حاصل ہونے والا پیسہ سرمایہ کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھا جاتا ہے تاہم ان سرگرمیوں سے حاصل ہونے والے پیسے کے حوالے سے اعداد و شمار میں اختلاف ہے جس کے مطابق اس کام سے ستر ملین ڈالر سے کر پانچ سو ملین ڈالر تک رقم حاصل ہوتی ہے۔ اس طرح بیرونی ممالک سے ملنے والی امداد کے حوالے سے اعداد و شمار بھی مشکوک ہیں۔ سی آئی اے کے مطابق گزشتہ سال غیر ملکی گروہوں اور افراد سے ایک سو چھ ملین ڈالر ملے۔ تاہم کچھ وفاقی تحقیقاتی حکام ان اعداد و شمار پر حقارت کی نگاہ ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس حوالے سے حقیقی اعداد و شمار کا تعین کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ پیسے کے بہاؤ کے حوالے سے جو نگرانی سسٹم ہے وہ اس قدر کمزور ہے کہ کسی قسم کے حتمی اعداد و شمار تک پہنچنا مشکل ہے۔

دہشت گردوں کی مالی امداد کے حوالے سے جس چیز پر وسیع پیمانے پر اتفاق رائے پایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ان جنگجوؤں کے خلاف مہم کا بنیادی پہلو یہ ہے کہ ان کو ملنے والی مالی امداد کو ختم کیا جائے۔ عسکریت پسندی کا محض ایک پہلو نہیں بلکہ مختلف پہلوؤں پر مشتمل ہے جس میں سب کی اپنی ترجیحات، مقاصد اور مالی امداد کے ذرائع ہیں۔ عسکریت پسندوں میں وہ فرق ان کے مالی امداد کے ذرائع سے ظاہر ہوتا ہے۔ طالبان اور القاعدہ کے حوالے سے امریکی مانیٹرنگ ٹیم کے ڈائریکٹر رچرڈ بیرٹ کا کہنا ہے کہ جب مالی ذرائع کی بات کی جاتی ہے کہ طالبان اور اس کے متعلقہ گروہوں کو موقع پرست کے طور پر دیکھنا چاہیے۔ وہ پیسہ اکٹھا کرنے کے لیے مقامی سطح پر ہر سرگرمی میں ملوث ہوتے ہیں۔ وہ صرف منشیات کے ذریعے پیسہ اکٹھا نہیں کرتے بلکہ وہ کوئی بھی طریقہ اختیار کر سکتے ہیں۔

منشیات کی تجارت علاقائی سطح پر طالبان کی جانب سے پیسہ اکٹھا کرنے کا بنیادی طریقہ ہے۔ یہ گروپ جنوبی افغانستان میں سب سے زیادہ طاقتور ہے جو کہ اس کا روحانی گڑھ اور ملک کا وہ حصہ ہے جہاں سب سے زیادہ افیون پیدا کی جاتی ہے جو کہ دنیا کی کل پیداوار کا نوے فیصد فراہم کرتی ہے۔ حالیہ سالوں کے دوران طالبان اور اسمگلروں کے درمیان تعلقات میں اضافہ ہوا ہے جس کا مطلب ہے کہ جنگجوؤں کے پاس رقم کی سپلائی میں کمی کے بجائے ان اسمگلروں کو

ظاہر کرنا بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ ملک کے مشرقی حصے میں مالی تصویر کچھ مختلف ہے جہاں پوست کی پیداوار بہت کم ہے۔ حقانی نیٹ ورک جس کا طالبان اور القاعدہ دونوں سے تعلق ہے وہ جرائم سے حاصل ہونے والے پیسے پر بڑے پیمانے پر انحصار کرتا ہے جس میں بھتہ حاصل کرنے اور اغوا برائے تاوان کا طریقہ شامل ہے۔ مغربی پاکستان کی سرحدوں کے پار جو پاکستانی طالبان کا گڑھ اور حقانی نیٹ ورک کی بیرونی چوکی ہے وہاں پر اغوا اور سمگلنگ طالبان کے مالی ذرائع میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ القاعدہ جس کی مرکزی قیادت کے بارے میں یقین کیا جاتا ہے کہ وہ پاکستان کے قبائلی علاقے میں ہے اس کو منشیات کی تجارت سے بہت کم پیسہ ملتا ہے اور اس کا زیادہ تر انحصار خلیجی ریاستوں کے ڈونرز پر ہوتا ہے۔

امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے صرف حال ہی میں عسکریت پسندوں کے خلاف کامیابی حاصل کرنے کے لیے ان کی مالی معاونت کو روکنے کی حکمت عملی بنائی ہے۔ اس سلسلے میں افغان تھریٹ فنانس سیل قائم کیا گیا ہے جس کا بنیادی کام یہ معلوم کرنا ہے کہ عسکریت پسندوں کو مالی معاونت کس طرح حاصل ہوتی ہے اور ان کی مالی امداد کے سلسلے کو کس طرح بند کیا جا سکتا ہے۔ جنگجوؤں کو پیسے کی سپلائی کے معاملے کو اب جس طرح اہمیت دی جا رہی ہے اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ امریکی فوج نے گذشتہ سال اس بات کی اجازت حاصل کر لی تھی کہ منشیات کے ایسے سمگلروں کو بھی پکڑے جن کے جنگجوؤں سے گہرے اور ثابت شدہ تعلقات ہیں جو کہ پینٹاگون کی اس پالیسی میں ایک بڑی تبدیلی ہے جس کے تحت افغانستان میں منشیات کی تجارت پر بالائی سطح پر بہت کم توجہ دی جاتی تھی۔

افیم کی تجارت کی تاریخ

افغانستان کی حالیہ اور مشکل بھری تاریخ کو منشیات کی تجارت کے عروج، زوال اور دوبارہ عروج کے ذریعے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک ملک جو کبھی پھل اور اناج برآمد کرتا تھا وہاں اب پوست کی کاشت جو کبھی مقامی سطح پر بہت چھوٹے پیمانے پر ہوتی تھی اب عالمی تجارت کی شکل اختیار کر چکی ہے جس سے اقوام متحدہ کے منشیات اور جرائم کے حوالے سے آفس کے مطابق صرف 2009 میں تین ارب ڈالر کمائے گئے۔ اس تبدیلی کا آغاز افغانستان میں 1979ء میں سوویت یونین کے حملے کے بعد ہوا۔ جنگ کے اس عشرے کے باعث افغانستان اس قابل نہ رہا کہ پہ

ضروریات خود سے پوری کر سکے۔ شہری نظام تباہ ہو گیا۔ مویشی مارے گئے۔ سڑکیں بھی برباد ہو گئیں۔ روایتی فصلوں کی جگہ افغان کسانوں نے پوست کی فصل اگانا شروع کر دی تاکہ مہنگی خوراک باہر سے منگوانے کے لیے پیسہ کما سکیں۔ پوست کی فصل بہت سخت جان ہوتی ہے اور اسے بہت کم پانی کی ضرورت ہوتی ہے اور اس سے نکلنے والی افیم کو آسانی کے ساتھ ٹرانسپورٹ کیا جا سکتا ہے اور مارکیٹ میں پہنچنے سے پہلے اس کے خراب ہونے کا بھی خطرہ نہیں ہوتا۔

سوویت یونین کی افغانستان سے واپسی کے باوجود پوست پر انحصار مکمل طور پر ختم نہ ہوا۔ جنگی سرداروں نے خلاء کو پر کرتے ہوئے منشیات کی تجارت کو بھی اپنے کنٹرول میں لے لیا۔ نوے کی دہائی کے وسط میں طالبان کے آنے کے باوجود منشیات کی تجارت پھلتی پھولتی رہی۔ 1999ء تک افغانستان اس مقدار سے چودہ گنا زیادہ افیم پیدا کر رہا تھا جو وہ تین سال پہلے پیدا کر رہا تھا۔ اس کے نتیجے میں یورپ، روس اور دیگر ممالک کو سستی اور بے بہا ہیروئن ملنے لگی۔ طالبان نے بین الاقوامی دباؤ کے پیش نظر اور عالمی تنہائی سے نکلنے کے لیے 2000ء میں پوست کی کاشت پر پابندی عائد کر دی۔ اس سے ہیروئن کی پیداوار میں ڈرامائی کمی ہوئی اور اس کی پیداوار دو سال پہلے تک ساڑھے چار ہزار ٹن سے کم ہو کر ایک سو پچاسی ٹن رہ گئی۔

تاہم یہ کمی بہت کم عرصہ رہی۔ 2001ء میں امریکی قیادت میں ہونے والے حملے کے نتیجے میں طالبان حکومت ختم ہو گئی جس کے بعد منشیات کی تجارت میں دوبارہ تیزی آ گئی۔ جن کسانوں کو طالبان کی پابندی کی وجہ سے نقصان ہوا تھا وہ اپنے قرضے اتارنے کے لیے دوبارہ بڑے پیمانے پر پوست کاشت کرنے لگے۔ نیو یارک یونیورسٹی کے سکالر اور جریدہ بابروک کے سینیئر فیلو بارنٹ آر روبن کے مطابق جو جنگی سردار طالبان کی حکومت کے خاتمے میں امریکہ کے ساتھ تھے انہوں نے اپنے اختیارات کے تحت پوست کی کاشت پر محصول لینا شروع کر دیا اور افیم کے سمگلروں کا تحفظ کرنے لگے۔

طالبان اور اس سے متعلقہ گروہوں کا دوبارہ ابھار بنیادی طور پر منشیات کی سمگلنگ سے اکٹھا ہونے والے پیسے اور دیگر جرائم کا مرہون منت تھا۔ جنگی سرداروں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے علاقائی اور مقامی طالبان کمانڈروں نے اپنے اپنے علاقوں میں پوست کی کاشت پر محصول لینا شروع کر دیا اور منشیات کے سمگلروں کی حفاظت کے بدلے بھی رقم کا مطالبہ کرنے لگے۔ ان عسکریت پسندوں نے جب ملک کے بڑے حصے پر قبضہ کر لیا تو محصول بڑھ گیا بالخصوص ان

علاقوں میں جو پشتون بیلٹ میں آتے تھے جو مشرقی افغانستان سے لیکر جنوب میں پوست کی کاشت کے بڑے صوبے ہلمند پر مشتمل ہے۔

منشیات کی تجارت اور طالبان کئی مختلف صوبوں میں افغانستان میں اہم کردار ادا کرتے رہے۔ وینڈا فلباب براؤن اپنی کتاب "شوٹنگ اپ" میں لکھتی ہیں کہ ہلمند کی معیشت سیاسی دارالحکومت کے لیے ایک اہم ذریعہ ہے کیونکہ یہ آبادی کے ایک بڑے حصے کو قابل بھروسہ اور پرکشش روزگار فراہم کرتا ہے۔ سابق امریکی نائب صدر جوزف بائیڈن سے لیکر جنرل پیٹریاس تک کئی امریکی حکام کا کہنا ہے کہ ستر فیصد یا اس سے بھی زیادہ طالبان جنگجو اس لیے ہتھیار اٹھاتے ہیں کیونکہ ان کے پاس روزگار کا اس کے علاوہ کوئی ذریعہ موجود نہیں۔ ان لڑکوں کو ماہانہ لگ بھگ سو سے لیکر تین سو ڈالر تک معاوضہ ملتا ہے اور اس طرح یہ دس ڈالر دیہاڑی کے جنگجو ہوتے ہیں۔ ایک امریکی امدادی کارکن سارہ چائس کا کہنا ہے کہ ان جنگجوؤں کے نزدیک یہ کام فائدے کے لیے نہیں کیا جاتا بلکہ یہ صرف گزارے کے لیے ہوتا ہے۔ ہر کوئی اس کی حمایت کرے گا۔

گزر بسر کے لیے پیسوں کے حوالے سے افغان حکومت کو طالبان کے ساتھ مسابقت کا سامنا ہے۔ افغان حکومت نے جب 2009ء میں انفنٹری سپاہیوں اور عام ریکروٹوں کے لیے معاوضے میں اضافہ کیا تو ان ملازمتوں کے لیے درخواستوں کی بھرمار ہو گئی۔ اس طرح اب لڑائی کے علاقوں میں کام کرنے والے افغان فوجی اور پولیس اہلکار ماہانہ ڈھائی سو ڈالر معاوضہ حاصل کر سکتے ہیں۔ اتحادی افواج کے ڈپٹی کمانڈر امریکی جنرل ڈیوڈ روڈریگز کا کہنا ہے کہ یہ معاوضہ طالبان کی جانب سے دیے جانے والے معاوضے سے اب بھی کم ہے تاہم فوج اور پولیس میں شمولیت سے تنخواہوں میں اضافے اور استحکام کا موقع میسر آتا ہے۔ تاہم اس کے باوجود انہی سے تعلق رکھنے والے نیٹو جنرل انچارج برائے پولیس تربیت بریگیڈیئر جنرل کارمیلو برجیو کا طنز بھرے لہجے میں کہنا تھا کہ طالبان میں بھرتی ہونا زیادہ فائدہ مند ہے کیونکہ وہ زیادہ معاوضہ دیتے ہیں۔

امریکہ اور برطانیہ کی جانب سے افغانستان سے پوست کی فصل کے خاتمے کو کئی اطراف سے تنقید کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ ان ناقدوں میں ایک صحافی گریچن پیٹرز بھی شامل ہیں جن کا کہنا ہے کہ اس عمل سے کسانوں کا نقصان ہوتا ہے جو کہ منشیات کے اس کام میں سب سے نچلی سطح پر ہوتے ہیں اور اسی کی وجہ سے جب ان کا ذریعہ آمدنی ختم ہوتا ہے تو وہ طالبان میں شامل

ہو کر حصے وصول لیتے ہیں۔ ایسے ہی طالبان جنگجوؤں سے کیے جانے والے انٹرویوز کے ایک سلسلے میں کینیڈین صحافی گریم سمتھ نے یہ پایا کہ ان لڑاکوں میں سے اسی فیصد نے اعتراف کیا کہ ان کا افیم کی انڈسٹری سے ذاتی تعلق ہے جبکہ پچاس فیصد نے، کہ پوست کے خاتمے کی کوششوں میں نقصان اٹھایا گیا۔

اگرچہ طالبان کے جنگجو تو زندہ رہنے کے لیے کچھ کمانے کی تگ و دو میں ہیں جبکہ دوسری جانب وہ ہیں جو منشیات کی اس تجارت سے بے پناہ منافع کما رہے ہیں اور ساتھ ہی طالبان کی مالی مدد بھی کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کو ”مجرم سرمایہ دار“ کا نام دیا گیا ہے۔ ان میں ایک بنیادی مثال حاجی جمعہ خان کی ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ افغانستان میں منشیات کی تجارت کا ایک بڑا رنگ چلا رہا تھا جو کہ افیم خرید کر کے لیبارٹری میں اس سے ہیروئن تیار کرتا اور اس قابل تھا کہ وہ دو سال تک امریکی مارکیٹ کو ہیروئن سپلائی کر سکے۔ یہ لیبارٹریوں اور منشیات کی سمگلنگ کے راستوں کی حفاظت کے لیے وہ طالبان کو بھاری معاوضہ دیتا تھا۔ جمعہ خان کے بارے میں مشہور تھا کہ اس کی پاکستان اور افغانستان میں وسیع جائیدادیں ہیں اور وہ اپنی سلطنت پاکستان کے جنوب مغربی شہر کوئٹہ سے چلاتا ہے۔ اکتوبر 2008ء میں امریکی اور برطانوی ایجنٹوں نے دھوکے سے انڈونیشیا بلا کر گرفتار کر لیا۔ اسے اگلے ہی روز امریکہ کے حوالے کر دیا گیا جہاں اس کے خلاف منشیات کی سمگلنگ اور ایک دہشت گرد تنظیم کی مالی امداد کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا۔ اس پر کئی اور سنگین واقعات میں فرد جرم بھی عائد کی گئی جن میں خودکش حملے میں گورنر ہیرو ور کے بیٹے اور چھ دیگر افراد کی ہلاکت کا واقعہ اور کابل کے سرینا ہوٹل میں حملہ شامل تھا۔ جمعہ خان دوسرا بڑا منشیات کا سمگلر تھا جسے مقدمے کے لیے امریکہ لایا گیا۔ 2007ء میں باز محمد نامی سمگلر کو منشیات کی سمگلنگ اور لاکھوں ڈالر کی ہیروئن امریکہ لانے اور طالبان کی مالی امداد کے جرم میں پندرہ سال قید کی سزا سنائی گئی۔ منشیات کے اس بڑے سمگلر کا عجیب و غریب جواز یہ تھا کہ وہ امریکیوں کو ہیروئن کی لت میں مبتلا کر کے ان کے خلاف جہاد کر رہا ہے۔ امریکی اہلکار کیرن ٹینڈی کے مطابق اس کا مقصد غیر روایتی تھا اور منشیات کی تجارت سے حاصل ہونے والے بھاری منافع سے طالبان اور دیگر انتہا پسند گروپس کی مالی مدد کی جاتی تھی۔

اگرچہ جمعہ خان اور باز محمد جیسے منشیات کے سمگلر اپنے تحفظ کے لیے طالبان کو بھاری معاوضہ دیتے تھے تاہم طالبان نے منشیات سے اپنی آمدنی کو بڑھانے کے لیے پوست کی کاشت

کاروں کے لئے ایک مہم شروع کی۔ مقامی طالبان کی فلڈ کسانوں کو بیج کی خریداری کے لیے قرضہ دیتے اور جب پوست کی فصل کاشت کے بعد کاٹ لی جاتی تو یہ قرضہ انہیں واپس کر دیا جاتا۔ انہوں نے پوست کے کاشت کاروں سے دس فیصد محصول بھی لینا شروع کر دیا جو عشر کہلاتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ منشیات کے سمگلروں سے اپنے علاقوں میں منشیات کی تجارت اور ان کی لیبارٹریوں جہاں کہ افیم سے ہیروئن بنائی جاتی تھی کے تحفظ کے لیے بھی معاوضہ لیتے۔ اس بات کے بھی اشارے ملے کہ طالبان منشیات کی تجارت کے حوالے سے "ویلیو ایڈڈ" پالیسی کے مرحلے کی طرف بڑھ رہے تھے جس کے تحت لیبارٹریاں چلانے اور پروسیسنگ کے لیے درکار کیمیکلز کی سمگلنگ کا کام شامل تھا۔

منشیات کی تجارت کے خفیہ ہونے کی وجہ سے اس سے حاصل ہونے والے پیسے کے بارے میں صحیح تخمینہ لگانا بہت مشکل ہے۔ یہ مشکلات افغانستان میں اور بھی زیادہ ہو جاتی ہیں جہاں معیشت لین دین پر چلتی ہے اور بینکوں کا باقاعدہ نظام چند بڑے شہروں کے علاوہ کہیں موجود نہیں۔ قانونی اور غیر قانونی ہر قسم کا لین دین حوالے کے نظام کے ذریعے کیا جاتا ہے جو کہ بینکنگ کا ایک غیر رسمی طریقہ ہے جس میں سارا انحصار ذاتی تعلقات اور لائسنس رجسٹریشن پر ہوتا ہے جو کہ جنوبی ایشیا میں صدیوں سے رائج ہے۔ افغانستان کی اسی سے نوے فیصد سے زائد کاروبار بے قاعدہ ہے اور حوالے کے نظام کے تحت چلتی ہے۔ اقوام متحدہ کے خصوصی مشیر برائے نارکوٹکس کنٹرول ژان لک یما ہو کے مطابق حوالے کے نظام جرائم پیشہ عناصر کا پیسہ کسی خوف وخطر کے بغیر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جا سکتا ہے۔ لگ بھگ ساٹھ فیصد اس قسم کی رقوم کا تعلق منشیات کے پیسے سے متعلق ہوتا ہے اور افغانستان کے منشیات پیدا کرنے والے بڑے صوبوں ہلمند اور قندھار میں تمام حوالہ ڈیلرز اس قسم کے لین دین میں ملوث ہیں۔

اگرچہ حوالہ کا نظام سستا ہے اور اس میں زیادہ تر انحصار اعتماد اور استحقاق پر کیا جاتا ہے تاہم یہ کوئی غیر دستاویزی نظام نہیں۔ اس میں ریکارڈ کا اندراج نہیں ہوتا لیکن بہت سے حوالہ ڈیلر لین دین کا کوڈ سسٹم کے ساتھ اندراج کرتے ہیں جو کہ سلطنت پارسی کا حصہ ہوتا ہے۔ امریکی اور افغان مالی تحقیقات کاروں نے غیر قانونی حوالہ ڈیلروں کے خلاف کریک ڈاؤن شروع کر دیا جس کے دوران ان کے ریکارڈ کو قبضے میں لیکر اس کی بنیاد پر مالی لین دین پتہ چلایا جاتا ہے۔ حالیہ کامیابیوں کے باوجود جس میں مغربی بینک کے ذریعے افغانستان میں بڑی تعداد

میں حوالہ ڈیلروں کی رجسٹریشن کی گئی ہے تاہم امریکی اور افغان حکام منشیات کے پیسے کے لین دین کے حوالے سے حقیقی اعداد و شمار تک پہنچنے سے قاصر ہیں کہ یہ کہا جا سکے کہ اس میں سے کتنا پیسہ جنگجوؤں کے پاس جا رہا ہے۔ تاہم اس کے باوجود یہ حکام اعداد و شمار کا تخمینہ لگانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

امریکی ڈائریکٹر آف نیشنل انٹیلی جنس ڈینس بلیئر کے مطابق افغان طالبان نے 2008ء میں منشیات کے ذریعے دس کروڑ ڈالر کمائے۔ وہ بتاتے ہیں کہ طالبان کی لڑائی کے لیے افغانستان کے اندر پیسے کی فراہمی کا سب سے اہم ذریعہ منشیات کی تجارت ہے۔ سی آئی اے اور پنٹاگون کے دفاعی حکام کا تخمینہ ہے کہ طالبان منشیات کی تجارت سے سالانہ سات کروڑ ڈالر کماتے ہیں جس کے بارے میں افغانستان اور افغانستان سے باہر بہت سے حلقوں کا کہنا ہے کہ یہ اعداد و شمار بہت کم ہیں۔ ایک امریکی اہلکار [illegible] کے مطابق سات کروڑ ڈالر کا عدد بہت کم ہے جبکہ ان اعداد و شمار کے بارے میں وہ سنتے رہے ہیں وہ تیس کروڑ ڈالر کے لگ بھگ ہے۔

پیٹرز ان اعداد و شمار میں مزید وضاحت کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ طالبان منشیات کی تجارت جیسے جرم سے پچاس کروڑ ڈالر کے لگ بھگ کماتے ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ سی آئی اے کے اعداد و شمار میں وہ رقم شامل نہیں جو منشیات کے سمگلر اپنے دھندے کے تحفظ کے لیے طالبان کو دیتے ہیں اور یہ کہ بعض جنگجو اس کام میں براہ راست ملوث ہو کر جو کماتے ہیں جیسے ہیروئن کی پراسسنگ اور مارکیٹنگ کا کام ہے جس سے ان کے حصے میں ڈرامائی حد تک اضافہ ہو جاتا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ ایک ڈرگ مارکیٹ جس کی مالیت تین ارب ڈالر ہے اس میں طالبان کے بارے میں یہ کہنا ہے کہ وہ صرف سات کروڑ ڈالر کما رہے ہیں ایک غیر حقیقی بات ہے۔

منشیات کی تجارت کے تحفظ کے حوالے سے دنیا بھر کے بارے میں رپورٹیں تیار کرنے والے ادارے یو این ڈی او سی کے اعداد و شمار میں غیر یقینی پائی جاتی ہے۔ اس ادارے کا کہنا ہے کہ جنگجوؤں کو منشیات کی تجارت سے سالانہ چالیس کروڑ ڈالر حاصل ہو رہے ہیں تاہم گذشتہ سال ایجنسی نے اپنے اعداد و شمار میں بہت تیزی سے کمی کرتے ہوئے ساڑھے بارہ کروڑ ڈالر کر دیا اور اس کمی کی وجہ یہ بتائی کہ اس میں صرف پوست کاشت کرنے والے کسانوں سے لیا جانے والا محصول اور وہ رقم شامل کی گئی ہے جو طالبان کو منشیات کی تجارت کے تحفظ سے حاصل ہوتا ہے کم کیے گئے اعداد و شمار میں وہ رقم شامل نہیں کی گئی جو بیوپاریوں میں پراسسنگ اور اس

کام کے لیے مطلوب کیمکلز کی سمگلنگ کے بدلے طالبان کو حاصل ہوتی ہے یا طالبان سے منسلک جنگجوؤں کو جو رقم حاصل ہوتی ہے۔ اقوام متحدہ کے ایک سینئر اہلکار تھامس پیچان کے مطابق اگر ان تمام چیزوں کو بھی شامل کیا جائے تو اعداد و شمار ایک بار پھر گزشتہ سال والے چالیس کروڑ ڈالر تک پہنچ جاتے ہیں۔

تاہم تحقیق اور درست ترین اعداد و شمار کے حوالے سے پیچان بدستور شکوک و شبہات کا شکار ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ایسا کوئی اکاؤنٹنٹ موجود نہیں جو ان کا باقاعدہ حساب کتاب رکھ رہا ہو۔ اس کے بجائے ان کے اعداد و شمار کی بنیاد اس بات پر ہوتی ہے کہ کتنے رقبے پر پوست کاشت کی جا رہی ہے، کتنی افیم پیدا کی جا رہی ہے اور فلاں سال میں ہیروئن کی قیمت کیا رہی ہے۔ یہ بھی ہماری سائنسی اپروچ ہے۔ لیکن جب طالبان کی بات کی جاتی ہے تو اس بارے میں ایجنٹوں کی اطلاعات پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے جن میں ہر کوئی مختلف اطلاع دیتا ہے۔ تاہم اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اعداد و شمار کو سو ملین رہنے دیا جائے کروڑ ڈالر کہا جائے یا چالیس کروڑ ڈالر۔ ان اعداد و شمار سے آپ کو ان کی قوت خرید کا پتہ چلتا ہے۔ اس رقم سے آپ بوئنگ یا جدید طیارے نہیں خرید سکتے بلکہ صرف ایسے ہتھیار حاصل کر سکتے ہیں جو ان کے لیے موثر جنگ کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔

کچھ ماہرین منشیات کے سمگلروں اور طالبان کے درمیان رابطوں کے مثبت پہلوؤں کی جانب دیکھتے ہیں۔ ڈیمنگل جو افغانستان اور لاطینی امریکہ دونوں جگہوں پر کام کر چکے ہیں وہ افغان بغاوت کے ایک مجرمانہ سنڈیکیٹ سے ریوولوشنری آرمڈ فورسز آف کولمبیا (ایف اے آر سی کے فارک) میں تبدیل ہونے سے مارکسسٹ لیننسٹ گوریلا تحریک سے جنوبی امریکی مافیا میں تبدیل ہونے کا موازنہ کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ فارک کی طرف دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ ابتداء میں ایک انتہائی نظریاتی، اینٹی اسٹیبلشمنٹ اور اینٹی گورنمنٹ تحریک تھی لیکن جب وہ اس میں آگے بڑھتے رہے تو ان کا پھیلاؤ بھی بڑھتا گیا اور انہیں مجرمانہ عناصر کی طرف سے زیادہ پیسہ ملنے لگا۔ یہ چیز انہیں نظریے سے دور لے گئی اور پھر یہی چیز فارک کا کمزور پہلو بنتا چلا گیا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہی چیز اب آپ کو یہاں پر بھی دکھائی دیتی ہے۔ آپ بہت سے طالبان کو دیکھ سکتے ہیں خصوصاً جنوب میں جو منشیات کے سمگلروں کے ساتھ ملوث ہو چکے ہیں۔

منشیات کی سمگلنگ سے آگے

حالیہ سالوں کے دوران طالبان، حقانی نیٹ ورک اور اسی طرح کے گروپ منشیات کے علاوہ مختلف اقسام کے جرائم میں ملوث ہو چکے ہیں۔ کئی واقعات میں سرحد کے دونوں اطراف میں اس قسم کی سرگرمیاں جدید قسم کی مجرمانہ کارروائیوں میں بدل چکی ہیں جن سے ان گروپوں کو اتنا ہی پیسہ حاصل ہوتا ہے جتنا کہ منشیات کی تجارت سے حاصل ہوتا ہے۔ آرمی سپیشل فورسز کے کمانڈر میجر ہنیک سیوان کا کہنا ہے کہ طالبان اور مجرمانہ عناصر کے درمیان محض ایک لکیر ہے جو ختم ہو رہی ہے۔ میجر سیوان افغانستان میں طالبان کے خلاف منشیات کے حوالے سے آپریشن کرتے رہے ہیں۔ طالبان اور ان کے حامی عناصر جس قسم کے جرائم میں ملوث ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

اغوا:

نومبر دو ہزار آٹھ میں نیویارک ٹائمز سے تعلق رکھنے والے ایک رپورٹر ڈیوڈ روہڈ کو اس کے افغان ڈرائیور اور ترجمان سمیت اغوا کر لیا گیا جب وہ کابل سے باہر ایک طالبان کمانڈر کا انٹرویو کرنے جا رہے تھے۔ مغویوں نے صرف ایک ہفتہ افغانستان میں گزارا اور اس کے بعد انہیں سرحد پار پاکستان بھیج دیا گیا اور حقانی نیٹ ورک کے لیڈر اور اس کے بانی جلال الدین حقانی کے بیٹے سراج الدین حقانی کے حوالے کر دیا گیا۔ اگلے سات ماہ تک روہڈ اور اس کے ساتھیوں کو پاکستان کے دشوار گزار مغربی علاقے میں رکھا گیا اور ان کی رہائی کے لیے دو کروڑ ڈالر کے لگ بھگ تاوان طلب کیا گیا۔ آخرکار روہڈ اور اس کا مترجم ساتھی وہاں سے خود ہی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے جبکہ بعد میں تیسرا بھی فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ تاہم یہ بات اب واضح طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ سرحد کے دونوں طرف کے جنگجوؤں کے لیے لوگوں کو تاوان کے لیے اغوا کرنا معمول بن چکا ہے۔

بعض تجزیہ نگار اغوا برائے تاوان کے واقعات میں طالبان کے بڑے پیمانے پر ملوث ہونے کی کڑیاں گروپ کے اس سابقہ اعلان سے جوڑتے ہیں جس میں اغوا برائے تاوان کے واقعات کو جائز قرار دیتے ہوئے اعلان کیا گیا تھا کہ اگر مقدس جنگجو کسی غیر ملکی فوجی، صحافی یا امدادی کارکن کو اغوا کر کے اس کے بدلے تاوان طلب کرتے ہیں تو وہ اس میں حق بجانب ہیں۔ پاکستانی طالبان کی تنظیم تحریک طالبان پاکستان کے ترجمان مولوی عمر نے اس فتوے یا فیصلے کی حمایت کرتے ہوئے کہا کہ اگرچہ وہ خود اغوا برائے تاوان کے واقعات کی مذمت کرتے ہیں لیکن اگر ایسا کسی اسلامی کاز کو بڑھانے کے لیے کیا جائے تو یہ بالکل ٹھیک ہوگا۔

پاکستانی پولیس کے مطابق پاکستان میں موجود طالبان کے لیے اغوا برائے تاوان آمدنی کا واحد سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ پولیس کی جانب سے اگرچہ اغوا برائے تاوان کے دس میں سے صرف ایک واقعے کا الزام پاکستانی طالبان پر عائد کیا جاتا ہے لیکن اس کے بدلے جو تاوان لیا جاتا ہے وہ ساٹھ ہزار ڈالر سے لیکر ڈھائی لاکھ ڈالر تک ہوتا ہے۔ پولیس کا کہنا ہے کہ پاکستانی طالبان نے گزشتہ سال سو سے زائد افراد کو اغوا کیا جن میں سے کچھ مقامی پاکستانی تھے جیسے ٹی وی اینکر ارشد حسین وغیرہ جس کی فیملی نے کوئی سوا دو ماہ بعد گیارہ ہزار ڈالر کے مساوی تاوان ادا کر کے اس کی رہائی ممکن بنائی۔ امریکی حکام کے مطابق افغانستان میں بھی اسی طرح اغوا برائے تاوان کے واقعات میں اضافہ دیکھنے میں آ رہا ہے۔

عام طور پر اغوا برائے تاوان کے واقعات میں امیر تاجروں، امدادی کارکنوں اور صحافیوں کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔ چند واقعات کے جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ ان واقعات میں کس قدر تیزی سے اضافہ ہو سکتا ہے۔ اغوا برائے تاوان طالبان کی حکمت عملی میں کس قدر تیزی سے بڑھ رہے ہیں اس کی حالیہ ترین مثال ایک اطالوی صحافی گیبریل ٹوریسیلو کا اغوا ہے جسے اکتوبر دو ہزار چھ میں افغان صوبے ہلمند سے اغوا کیا گیا تھا جہاں وہ بائیس روز تک طالبان کی حراست میں رہا تھا۔ اپنی رہائی کے بعد صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے اس نے بتایا کہ طالبان خاص طور پر اس کی تلاش میں تھے اور جب انہوں نے اس بس کو روکا جس میں وہ سوار تھا تو گرچہ اس نے افغانوں جیسا روپ دھار رکھا تھا داڑھی اور پگڑی کا استعمال کیا تھا لیکن طالبان نے اسے تمام مسافروں میں سے آسانی سے شناخت کر لیا اور تاڑ گئے۔ اطالوی حکومت نے اس بات کی تصدیق کرنے سے انکار کر دیا کہ اس نے ٹوریسیلو کی رہائی کے لیے اغوا کاروں کو دو لاکھ ڈالر کا تاوان دیا ہے... کچھ عرصے بعد جنگجوؤں نے ایک اور اطالوی صحافی ڈینیل ماسٹروگیاکومو کو اغوا کیا اور وہ بھی بعد ازاں رہا کر دیا گیا اور مبینہ طور پر اس کی رہائی کے بدلے بیس لاکھ ڈالر ادا کیے گئے جس کی تصدیق نہیں کی گئی۔ طالبان کے ترجمان عبدالحق حنیف نے تسلیم کیا ہے کہ اغوا برائے تاوان کے ذریعے طالبان خاصی آمدنی حاصل کر رہے ہیں۔

دیگر طالبان کمانڈروں نے بھی اغوا برائے تاوان کے واقعات میں کشش محسوس کی۔ جولائی دو ہزار سات میں طالبان کمانڈر عبداللہ منصور نے جنوبی کوریائی مشنریوں سے بھری ہوئی ایک پوری بس کو اغوا کر لیا جن میں سے دو مشنریوں کو تو انہوں نے فوری طور پر قتل کر دیا تھا

جاتا ہے کہ جنوبی کوریا نے مغویوں کی رہائی کے لیے ان کی حکومت سے بیس لاکھ ڈالر کا تاوان ادا کیا تاہم جنوبی کوریا کی جانب سے تاوان کی ادائیگی کا انکار کیا جاتا رہا۔ اغوا کے واقعات سے سرکاری حکام بھی محفوظ نہیں۔ مثال کے طور پر افغانستان میں پاکستان کے سفیر طارق عزیز الدین کو اغوا کیا گیا اور اس کی رہائی کے لیے غیر مصدقہ طور پر پاکستانی حکومت نے پچیس لاکھ ڈالر کی رقم بطور تاوان ادا کی۔

اغوا برائے تاوان کا دھندہ گزشتہ چند سالوں کے درمیان خاصا بڑھا ہے۔ افغان صحافی عبدالسمیع یوسف زئی کے مطابق طالبان نے اغوا کے واقعات کا ٹھیکہ چھوٹے جرائم پیشہ گروہوں کو دے دیا ہے کہ وہ مالدار اور بااثر لوگوں کو اغوا کرتے اور پھر مقررہ قیمت کے عوض کے طالبان کو فروخت کر دیتے جو ان کے عوض ان کے خاندانوں سے بھاری تاوان وصول کر کے ان کو رہا کرتے۔

سمگلنگ

افغانستان اور عسکریت پسندوں کے زیر قبضہ علاقہ نہایت غریب علاقہ ہے تاہم ان علاقوں میں قیمتی معدنی وسائل کی بھرمار ہے۔ ان وسائل میں قیمتی پتھر، لکڑی اور سنگ مرمر شامل ہے جنہیں لاہور اور اسلام آباد کے مہنگے گھروں میں چھتوں اور دیواروں پر لگایا جاتا ہے اور یہ معدنی دولت دونوں طرف کے طالبان کے لیے پیسہ کمانے کا اہم ذریعہ بن چکا ہے۔

لکڑی کا کام کرنے والی کمپنیاں حکومت کو دور رکھنے کے لیے انتہا پسند عناصر سے قریبی تعلقات رکھتی ہیں۔ پاکستان کی سرسبز وادی سوات کسی زمانے میں پائن کے جنگلوں سے بھری ہوئی تھی تاہم اب آریانہ انسٹی ٹیوٹ فار ریجنل ریسرچ اینڈ ایڈووکیسی نامی گروپ کے سروے کے مطابق اس علاقے سے پاکستانی طالبان کے دو سالہ قبضے کے دوران اب تک دس کروڑ ڈالر کی لکڑی کاٹی جا چکی ہے۔ سرحد کے پار افغانستان میں کنڑ صوبے میں بھی یہی کیا گیا جہاں کے گھنے جنگلات کا صفایا کر دیا گیا۔ لکڑی کی سب سے مارکیٹ پاکستانی صوبے خیبر پختونخواہ کے صدر مقام پشاور میں ہے جہاں ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مارکیٹ غیر قانونی پائن، چلغوزہ اور جنگلی زیتون کی لکڑی سے بھری ہوئی ہے۔

قیمتی پتھر اور نوادرات بھی طالبان کے خزانے کو بھرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان جنگجوؤں نے پاکستان کے صوبے خیبر پختونخواہ کے دور دراز علاقوں اور ان سے ملحقہ علاقوں میں ایمرالڈ کی کانوں پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اگرچہ اس تجارت کی مالیت کا کوئی بھی اندازہ نہیں لگا سکتا لیکن تاہم

مقامی حکام کا کہنا ہے کہ اس میں سے خاصا بڑا حصہ براہ راست طالبان کو ملتا۔ ایک واقعے میں بتایا جاتا ہے کہ دو سو کے قریب مزدوروں سے ایمرالڈ کی کانوں کی کھدائی کرائی گئی اور ان سے وعدہ کیا گیا کہ اس میں دو تہائی حصہ ان کو دیا جائے گا جبکہ باقی طالبان کمانڈروں کا ہوگا تا کہ انہیں اس علاقے میں لڑائی کے لیے ادا ہو سکے۔

بھتہ خوری۔

افغان خود یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ ان کے ملک کو جس سب سے بڑے چیلنج کا سامنا ہے وہ کرپشن ہے۔ پتہ چلا ہے کہ محصولات کا ایک اور پرکشش ذریعہ یہ ہے کہ افغان کمپنیوں کو ملنے والے ٹھیکوں میں سے بھتہ وصول کیا جائے۔ گذشتہ سالوں کے دوران ملک کی تیزی سے خراب ہوتی صورت حال کے باعث قانونی طور پر کاروبار کرنے والے تاجروں کے لیے بھی اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ وہ جنگجوؤں اور جرائم پیشہ عناصر کی جانب سے حملوں سے تحفظ کے لیے ایک مخصوص حصہ طالبان کو دیں۔

امریکی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن نے دسمبر دو ہزار دس میں امریکی سینیٹ کی آرمڈ سروسز کمیٹی کو بتایا کہ اس بات کے واضح شواہد موجود ہیں کہ طالبان خلیجی ممالک سے ملنے والی امداد اور منشیات سے حاصل ہونے والی آمدنی کے لیے غیر ملکی ٹھیکوں میں سے بھی ایک بڑا حصہ وصول کر رہے ہیں۔

کانگرس کے تحقیقات کاروں کا شبہ ہے کہ باغی جنگجو افغانستان بھر میں پھیلے ہوئے دو سو سے زائد امریکی اڈوں کو سپلائی کے سلسلے میں دیے جانے والے بڑے بڑے فوجی ٹھیکوں میں سے پیسہ کما رہے ہیں۔ 2.16 ارب ڈالر مالیت کے ایک دو سالہ ٹھیکے جسے ہوسٹ نیشن ٹرکنگ کنٹریکٹ ' کا نام دیا گیا کے تحت چھ ٹھیکیداروں کو فی کس تین سو ساٹھ ملین ڈالر کا ٹھیکہ دیا گیا جن کا کام تھا کہ وہ افغانستان میں امریکی فوجی اڈوں پر ضرورت کی ہر چیز سپلائی کریں جیسے خوراک، پانی، ٹوائلٹ پیپر اور ہتھیار وغیرہ۔ ان میں سے زیادہ تر ٹھیکیداروں کے پاس تو ٹرک تک موجود نہیں اور وہ آگے ٹھیکے دار رکھ کر کام چلاتے ہیں جو مال کی سپلائی بھی کرتے ہیں اور ان کی حفاظت کا بندوبست بھی ان کے ذمے ہوتا ہے۔ کانگرس کی تحقیقات کے مطابق ٹرکوں کے ذریعے سپلائی کے اس کام میں ٹھیکے ہی ٹھیکے ہیں۔ ٹھیکہ در ٹھیکہ در ٹھیکہ در ٹھیکے کی تہیں ہیں جن میں شفافیت کا امکان بہت کم اور فراڈ کا بہت زیادہ ہے۔ اس سلسلے میں فوج کا رویہ ایسے ہی ہے جیسے جان بوجھ کر آنکھیں بند کر لی گئی ہوں۔

کوئی بھی اس بارے میں یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ اس عمل کے دوران کتنا پیسہ طالبان اور دیگر جنگجوؤں کی جیب میں جا رہا ہے۔ ایک تخمینے کے مطابق یہ مالیت سینکڑوں ملین ڈالر میں ہے۔ میساچوسٹس سے امریکی ایوان نمائندگان کے ایک ڈیموکریٹ رکن جان ٹیرنی جو کہ ہاؤس سب کمیٹی آن نیشنل سیکیورٹی اینڈ فارن افیئرز کے چیئرمین ہیں اور جو اربوں ڈالر کے ٹھیکوں کی تحقیقات پر مامور ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ گرچہ امریکی حکومت کی توجہ تمام تر اس بات پر ہے کہ منشیات کی سمگلنگ اور خلیجی ریاستوں سے طالبان کو کتنا پیسہ مل رہا ہے لیکن اسے اس بات کا بہت کم علم ہے کہ خود اتحادیوں کی موجودگی کی وجہ سے وہاں پر کس قدر کرپشن ہو رہی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ امریکی پالیسی سازوں کو اس بات کا گہرائی سے جائزہ لینا چاہیے کہ افغانستان میں امریکہ کی اربوں ڈالر کی امداد اور ٹھیکوں کی مد میں دیے جانے والے اربوں ڈالر کا نتیجہ نکل رہا ہے۔ اس صورت حال کے حوالے سے امریکہ میں اور بھی کئی سطحوں پر تحقیقات ہو رہی ہیں۔

کچھ ماہرین اس امداد پر امدادی ایجنسیوں پر تنقید کرتے ہیں کہ وہ اس بات پر نظر رکھنے میں ناکام ہیں کہ ان کا پیسہ کس طرح خرچ کیا جا رہا ہے اور جس سے افغان عوام مایوسی کا شکار ہیں کیونکہ انہیں اپنے ملک میں ہونے والے ترقیاتی کام بہت کم دکھائی دے رہے ہیں۔ ایک ترقیاتی ورکر سارہ مال کا کہنا ہے کہ افغانستان میں بیرونی حکومتوں کی جانب سے بہت سا پیسہ آ رہا ہے لیکن زیادہ تر ڈونرز کو اس بات کی کوئی پروا نہیں کہ ان کا پیسہ اس کام کے لیے خرچ بھی ہو رہا ہے جس کے لیے بھیجا جا رہا ہے۔ وہ بس اس کو خرچ کرنا چاہتے ہیں۔

بھتہ خوری کی ایک اور مثال طالبان کی جانب سے اپنے زیر قبضہ علاقوں میں قانونی طور پر کاروبار کرنے والوں سے ٹیکس وصول کرنے کا عمل ہے۔ اقوام متحدہ کی مالی واچ ڈاگ ٹیم کا کہنا ہے کہ ان کاروباروں کی فہرست خاصی طویل ہے کہ جن سے طالبان ٹیکس وصول کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر مختلف سہولیات جیسے پانی اور بجلی کی فراہمی اور ٹرانسپورٹ کمپنیوں سے سڑکوں کے استعمال پر ٹیکس کی وصولی۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ بات کسی قدر عجیب ہے کہ یہ سہولتیں طالبان فراہم نہیں کرتے۔ وہ ان کو پیدا کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ اپنی حتی بعض مدتی ان پر ٹیکس عائد کر کے کماتے ہیں۔ پاکستان کے قبائلی علاقوں میں بھی یہی صورت حال ہے جہاں مرکزی حکومت نے کبھی بھی اپنا حقیقی اختیار استعمال نہیں کیا۔ ان علاقوں میں طالبان مختلف ذیل میں لوگوں سے ٹیکس وصول کرتے ہیں جس میں ٹرکوں اور مسافر بسوں سے لیا جانے والا ٹیکس، پٹرول

پمپوں سے پٹرول کی مفت وصولی اور گھروں سے لیے جانے والا ٹیکس شامل ہے۔ قبائلی علاقوں کے علاوہ بعض صورتوں میں لاہور، کراچی اور کوئٹہ جیسے شہروں میں بھی بزنس مینوں، سرکاری حکام اور تاجروں سے طالبان کے مقامی نمائندوں کی جانب سے ٹیکس لیا جاتا ہے۔

عطیات:

افغانستان اور پاکستان کے لیے اوباما ایڈمنسٹریشن کے سرکردہ نمائندے رچرڈ ہالبروک نے اس بات کا عزم ظاہر کیا کہ طالبان اور ان سے متعلق گروپوں کے لیے مالی مدد فراہم کرنے والے عناصر کا پتہ چلایا جائے گا۔ متعدد بار اس سینئر سفارت کار نے یہ کہا کہ صرف منشیات ہی طالبان کی آمدنی کا واحد ذریعہ نہیں ہیں۔ سینیٹ کی خارجہ امور کی کمیٹی میں انہوں نے بیان دیا کہ طالبان کو سب سے زیادہ پیسہ خلیجی ممالک اور دیگر علاقوں میں موجود ان کے ہمدردوں کی جانب سے مل رہا ہے۔

دیگر ماہرین کا ماننا ہے کہ افغانستان کے باہر اور اندر سے ملنے والے عطیات طالبان کی مالی مدد کا اہم ترین ذریعہ ہیں تاہم وہ اس مالی امداد کی حقیقی مالیت تک پہنچنے سے قاصر ہیں۔ اقوام متحدہ سے تعلق رکھنے والے بیرنٹ کا کہنا ہے کہ اعداد و شمار کا تعین کرنا مشکل ہے۔ تاہم اس نے تخمینہ لگایا کہ طالبان کی پندرہ فیصد مدد بیرونی ذرائع کی جانب سے ہو رہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ پتہ چلایا جا سکتا ہے کہ پیسہ آ رہا ہے اور خلیجی ممالک سے آ رہا ہے لیکن ذریعے کے بارے میں معلوم کرنا بہت ہی مشکل ہے۔

پاکستان اور افغانستان کی بڑی بڑی دکانوں جیسے جیولر شاپس، میڈیکل سٹور اور دیگر بڑے سٹورز میں ایک شیشے کا بکس رکھا ہوتا ہے جس میں طالبان کے حامی لوگ ان کے لیے چندہ ڈالتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ مساجد، مدارس اور انفرادی طور پر بھی پیسہ جمع کیا جاتا ہے۔ بعض عورتیں اپنے زیورات دے دیتی ہیں جبکہ مالدار مرد بڑی بڑی رقمیں دے ڈالتے ہیں۔ پاکستان کے ایک سیاسی کارکن ڈاکٹر سعید عالم محسود کا کہنا ہے کہ کچھ امیر پشتون تاجر چندہ مہم کے نتیجے میں جمع ہونے والے ایک لاکھ ڈالر تک طالبان کو عطیے میں دے چکے ہیں تاکہ ان کی اور پابندی کا شکار لشکر طیبہ کی مدد ہو سکے۔ وہی لشکر طیبہ جس نے مبینہ طور پر ممبئی میں حملے کیے اور اس کے نتیجے میں ایک سو ساٹھ لوگوں کی جانیں چلی گئیں۔

سعودی عرب اور دیگر عرب حکومتوں کی جانب سے کنٹرول سخت کیے جانے کے باوجود

خلیجی ممالک میں موجود طالبان کے حامیوں اور ہمدردوں کی جانب سے بھی بہت سا پیسہ آتا ہے۔ یہ عسکریت پسند عناصر متحدہ عرب امارات اور دیگر امیر ممالک میں خود فنڈ ریزنگ کرتے ہیں۔ طالبان کی کمان ملا عمر کی قیادت میں پاکستان کے شہر کوئٹہ میں ہوتی ہے تاہم وہ اپنے نمائندے خلیج میں بھیج کر عطیات وصول کرتے ہیں۔ پیرٹ اور ایک امریکی اہلکار کے مطابق بعض مرتبہ یہ فنڈ ریزر پاکستانی پاسپورٹ پر سفر کرتے ہیں۔ پیرٹ کا کہنا ہے کہ حقانی نیٹ ورک کے خلیجی ریاستوں میں اپنے نمائندے موجود ہیں۔ دیگر ماہرین کا کہنا ہے کہ محسود قبیلہ جس کی پاکستان کی وزیرستان ایجنسی میں غالب اکثریت ہے، اپنے قبیلے کے ان لوگوں سے چندہ اکٹھا کرتا ہے جو خلیجی ریاستوں میں کام کرتے ہیں۔ عبداللہ محسود کی تقاریر کی ویڈیو میں وہ کہتا ہے کہ یہ آپ لوگوں کا مذہبی فریضہ ہے کہ کافروں کے خلاف اور ان غاصبوں کے خلاف جنہوں نے مسلمانوں کی زمین پر قبضہ کر لیا ہے ان کے خلاف جہاد کریں لیکن اگر آپ ایسا نہیں کر سکتے تو اپنے مال کے ذریعے اس میں شرکت کریں۔ چنانچہ اسکے بعد ایک غیر ہنرمند کارکن جیسے ڈرائیور بھی سالانہ ایک سو پچیس ڈالر تک چندہ کرتا ہے جبکہ ہنرمند کارکن جیسے الیکٹریشن وغیرہ سالانہ چار سو ڈالر تک چندہ مہیا کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں تقاضا کافی ہوتا ہے کہ طالبان کے ہیڈ کوارٹر پر یہ [illegible] کر دی جاتی ہے۔

اب یہ پیسہ جہاد کے لیے چندہ ہوتا ہے یا نہیں۔ اس کا انحصار دینے والے کی نیت پر ہوتا ہے۔ صحافی گریچن پیٹرز بتاتی ہیں کہ انہوں نے کئی لوگوں کا انٹرویو کیا کہ جنہوں نے زکوٰۃ کے طور پر طالبان کو پیسہ دینے کا اعتراف کیا لیکن ان کا کہنا تھا کہ انہوں نے ایسا صرف افغانستان میں موجود اپنے خاندانوں کے تحفظ کے لیے کیا۔ گریچن پیٹرز کے مطابق طالبان کہتے ہیں کہ لوگ جہاد کے لیے پیسہ دیتے ہیں لیکن وہ سمجھتی ہیں کہ وہ یہ پیسہ بھتے کے طور پر دیتے ہیں

طالبان کیلئے پیسے کے خلاف کریک ڈاؤن

نیویارک میں گیارہ ستمبر کے حملوں کے نتیجے میں امریکی حکومت یہ جان چکی ہے کہ دہشت گردوں کے پیسے کے حوالے سے ابھی ایسی [illegible] جس کے نتیجے میں دہشت گردوں کے نیٹ ورک اور یہ کہ ان کی کارروائیوں کو کس طرح روکا جا سکتا ہے۔ اس بارے میں جاننے میں مدد ملتی ہے۔ اس معاملے میں ابتدائی ترین توجہ القاعدہ پر ہوتی ہے جنہیں خلیجی اور عرب ممالک سے مختلف

مالی اداروں، کاروباروں اور دولت مند افراد سے مدد ملتی ہے۔ اس سلسلے میں پہلی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان کے کل پرزوں کو شناخت کیا جائے اور اثاثوں کو منجمد کیا جائے۔ اس سلسلے میں عملدرآمد کا نظام کمزور ہوتا ہے اور فنانسروں کے لیے اپنے سرمایے کو منجمد ہونے سے بچانا بہت آسان ہوتا ہے۔ نائن الیون کمیشن نے اس ناکامی کے بارے میں ان الفاظ میں لکھا کہ دہشت گردوں کو سرمایے سے محروم کرنے کی کوشش کرنا ایسے ہی ہے جیسے سمندر میں سے جال نکال کر کسی خاص قسم کی مچھلی کو پکڑنا۔

بدقسمتی سے امریکی حکومت اور افغانستان میں اس کے اتحادی طالبان اور دیگر انتہا پسندوں کو سرمایے کی فراہمی کے حوالے سے کوئی واضح تصویر بنانے میں بہت سست رفتار رہے ہیں۔ ابتداء میں سی آئی اے اور دیگر ایجنسیوں کی اس طرف یا تو توجہ بہت کم رہی ہے یا پھر وہ وسائل کی کمی کی وجہ سے اس پیچیدہ مسئلے کی طرف خود کو مرکوز نہیں کر سکے۔ سی آئی اے افغانستان میں سات سو آفیسر اور ٹھیکیداروں کے ذریعے خاصا کام کرتی رہی ہے تاہم اس کی زیادہ تر توجہ باغیوں کے خلاف نیم فوجی آپریشنوں پر رہی اور یہ سب بظور روایتی انٹیلی جنس جمع بندی کی قیمت پر کیا گیا۔ کابل میں امریکی سفارت خانے کے ایک سینئر اہلکار نے سی آئی اے کی شکایت کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں ان کی گردن دبا کر سب کچھ نکالنا ہوگا اور اگر ہم نے پیسے کے حوالے سے کنٹرول حاصل نہ کیا تو ہم یہ جنگ کرپشن کے آگے ہار جائیں گے۔

یہ بات کہ پینٹاگون اور دیگر ایجنسیوں نے پیسے کی فراہمی کے مسئلے پر اتنی توجہ نہیں دی، اس کو متعدد سر کردہ امریکی سینیٹروں بشمول اکثریتی لیڈر ہیری ریڈ اور ڈیان فینسٹین، بیری راک فیلر، کٹ بونڈ اور ایوان بے، نے نیشنل سکیورٹی ایڈوائزر جنرل جیمز جونز کو لکھے گئے ایک خط کی صورت میں اٹھایا جس میں کہا گیا کہ ہمارے قاتل دشمنوں کو جس طرح پیسہ مل رہا ہے وہی ان کی زندگی ہے اور اس کی عدم موجودگی یا بہت کم موجودگی کی صورت میں طالبان اور القاعدہ جیسے دشمن ایک قابل ذکر وجود کے طور پر باقی نہیں رہیں گے۔ ان سینیٹروں نے جنرل جونز پر زور دیا کہ وہ دشمنوں کے پیسے کے نیٹ ورک کو پتہ چلایا جائے اور اسے نشانہ بنایا جائے۔

تاہم حالیہ مہینوں کے دوران امریکی حکومت نے ان وسائل میں اضافہ کر دیا جن کے ذریعے باغیوں کو پیسے کی فراہمی کے ذرائع کو نشانہ بنانا مقصود تھا۔ اس سلسلے میں مختلف مشن اور حکمت عملیاں ترتیب دی گئیں۔ ابتدائی مشن یہ تھا کہ باغیوں کو پیسے کی رسائی کے بارے میں انٹیلی

جس کو اکٹھا جائے اور ان کا جائزہ لیا جائے تاہم اس کے بعد اس ہدف کو پھیلا دیا گیا۔

زیادہ تر معلومات ٹیلی فون ٹیپ کرنے کے نظام کے تحت لی گئیں جس کے لیے افغانستان کی خصوصی عدالت سے منظوری لی گئی۔ ایجنٹوں نے اس سلسلے میں خصوصی منظور شدہ افغان پولیس کی یونٹوں کے ساتھ کام کیا جس کے لیے مختلف حوالہ ڈیلروں کے ٹیپ شدہ فون گفتگو کی بنیاد پر سرچ وارنٹ لیے گئے۔ حوالے ڈیلروں پر چھاپے مارے گئے اور ان کے قبضے سے ایسا ریکارڈ حاصل کیا گیا جس سے منشیات کے سمگلروں اور جنگجوؤں کے آپسی تعلقات کی ایک واضح تصویر سامنے آئی تھی۔ ایک واقعے میں کابل کے حوالہ ڈیلر سے شمار تیں قبضے میں لی گئیں جن کو آگے قانون نافذ کرنے والے اداروں کے حوالے کیا گیا جن کے ذریعے آسٹریلیا، برطانیہ اور نیدرلینڈ میں فوجداری مقدمات قائم کیے گئے۔

مختلف کیسوں میں پیش رفت کے ساتھ ساتھ جو شواہد اور واقعات سامنے آتے رہے ہیں ان سے جنگجوؤں کی مالی امداد کے بارے میں بہت سے نئے قسم کے ذرائع اور طریقوں کا پتہ چلا۔ منشیات کے علاوہ ایسے بے شمار ذرائع سامنے آرہے تھے جن کے ذریعے طالبان اور دیگر عسکریت پسند گروپ اپنے لیے پیسہ حاصل کر رہے تھے۔ اس میں سمگلنگ بھی شامل ہے، اغوا بھی شامل ہیں۔ اس میں مختلف کاروباری افراد سے لیا جانے والا بھتہ بھی ہے اور قیمتی پتھروں کی سمگلنگ بھی اس میں ہے۔ اس میں چھوٹے جرائم سے لیکر بڑے جرائم سب شامل ہیں۔ ان تمام کامیابیوں میں افغان تھریٹ فنانس سیل (ATFC) اور DEA کا اہم کردار رہا ہے۔

بعض واقعات میں ATFC کی جانب سے اکٹھے کیے جانے والے شواہد کی مدد سے کئی فوجداری مقدمات قائم کیے گئے۔ بعض واقعات میں انٹیلی جنس امریکی فوج کے حوالے کی گئیں اور ان کے ذمے جنگجوؤں کی مالی مدد کرنے والے منشیات کے سمگلروں کا پتہ چلانے اور ان کے قلع قمع کی ڈیوٹی لگائی گئی۔ اگست 2009 کی ایک رپورٹ کے مطابق سینٹ کی خارجہ امور کی کمیٹی نے انکشاف کیا کہ فوج کوئی پچاس کے قریب ایسے منشیات کے سمگلروں کی فہرست بنا چکی ہے جو جنگجوؤں کو سرمایہ فراہم کرتے ہیں اور جن کو گرفتار یا ہلاک کرنے کا ہدف بنایا گیا ہے۔

منشیات کی تجارت کی طرف کئی سالوں تک توجہ نہ دینے کے بعد اب امریکی فوج اس مسئلے کو سنجیدگی سے لے رہی ہے کیونکہ کمانڈر اس بات کو جان چکے ہیں کہ جنگجوؤں کو شکست دینے کے لیے پہلے ان کو سرمایہ کی فراہمی روکنا ضروری ہے۔ اے ٹی ایف سی کے سربراہ وائز کا کہنا ہے کہ

پہلے طالبان کو سرمایہ کی فراہمی کے حوالے سے زیادہ نہیں سوچا گیا لیکن اب ایسا کرنا ضروری ہے۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ یہ نہ پوچھا جائے کہ "تم نے یہ رائفل کہاں سے لی؟" بلکہ یہ پوچھنا چاہیے کہ "تم نے اس رائفل کے لیے پیسے کس طرح ادا کیے اور یہ پیسے کہاں سے آئے؟"

منشیات اور باغیوں کے درمیان تعلق کی اس سے بہتر تصویر کشی اور کوئی نہیں ہو سکتی جو مئی 2009ء میں پوست کی کاشت کے سب سے بڑے صوبے ہلمند کے دارالحکومت لشکر گاہ سے پندرہ میل دور مرجاہ ضلع میں ہوئی۔ کیپٹن مائیکل امیدان کا کہنا ہے کہ مرجاہ ضلع کے واقعے سے یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ اگر آپ باغیوں کو کمزور کرنا چاہتے ہیں تو ان کو اس وقت نشانہ بنائیں جب پوست کی فصل کاٹنے کا موسم ہوتا ہے تاکہ آپ کسانوں کو الگ تھلگ نہ کریں۔ اس کا کہنا تھا کہ کسان تو صرف اپنے خاندان کی روزی روٹی کے لیے یہ فصل اگاتے ہیں اور انہیں کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ اس فصل سے یورپ میں بچے ہلاک ہوتے ہیں۔ اگر آپ کو ان کو کوئی متبادل نہیں دیں گے تو آپ اپنے مشن میں کامیاب نہیں ہوں گے اور کسان پوست اگانے پر مجبور ہوں گے۔ اب آپ کو مرجاہ کے واقعے کے بارے میں بتاتے ہیں جہاں امریکی، افغان اور اتحادی کمانڈروں کی 216 رکنی فوج نے ساٹھ کے قریب جنگجوؤں کو ہلاک کر کے سوختہ ہیروئن، افیم پیسٹ اور پوست کے بیج برآمد کر لیے جن کی مالیت چالیس لاکھ ڈالر کے لگ بھگ تھی۔ فوجیوں نے کیمیکلز کے پچپن ڈرم بھی برآمد کیے جو منشیات کی مالیت کے تھے۔ منشیات کے تاجروں اور باغیوں کے تعلق کا واضح ثبوت اس شکل میں سامنے آیا کہ وہاں سے ہتھیار، خودکش جیکٹیں، دھماکہ خیز مواد اور ایک غیر رکی کلینک بھی ملا جہاں طالبان اپنے زخمیوں کا علاج کرتے تھے۔ میجر سلیمان کے مطابق چالیس لاکھ ڈالر کی اس منشیات کی برآمدگی سے یقینی طور پر طالبان کو دھچکا پہنچا ہوگا کیونکہ اس میں سے بڑا حصہ ان کو ملتا تھا۔

اگرچہ طالبان کو پیسے کی فراہمی روکنا مسئلے کے حل میں سے ایک ہے لیکن امریکی اور افغان حکام کا کہنا ہے کہ اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ افغانستان اور پاکستان میں مالی لین دین کے قاعدوں کو ٹھیک کیا جائے اور خلیجی ملکوں سے کہا جائے کہ وہ بھی باغیوں کو پیسے کی فراہمی روکنے کے لیے اپنی کوششوں کو مضبوط بنائیں۔ اقوام متحدہ کے حکام کا کہنا ہے کہ افغانستان کے مرکزی بینک کے ذریعے کچھ پیش رفت ہوئی ہے جس نے ملک کے اکثر حوالہ ڈیلروں کو رجسٹر کر لیا

ہے اور امریکی تربیت یافتہ مالی تحقیقات کاروں کی ایک ٹیم بنائی ہے تاکہ منشیات کے سمگلروں اور ان سے ملے ہوئے دیگر کرپٹ حکام کے خلاف فوجداری مقدمات قائم کیے جائیں۔

کچھ حلقوں کا کہنا ہے کہ طالبان اور ان کے بھائی بندوں نے اپنی مالی معاونت پر اس حملے کے خلاف ردعمل ظاہر کیا ہے۔ اٹھارہ جنوری کو سات جنگجوؤں نے کابل کے وسط میں صدارتی محل اور وزارت انصاف اور مرکزی بینک سے پچاس قدم کے فاصلے پر ایک شدید حملہ کیا۔ یہ حملہ اصل میں باغیوں کی جانب سے پیغام تھا کہ ان کی مالی امداد کو روکنے کی کوئی بھی قسم کی کوشش کی گئی تو وہ کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ دہشت گردوں کو سرمایے کی فراہمی کی روک تھام کے حوالے سے امریکی اہلکار ڈیوڈ کوہن کے مطابق جنگجوؤں کا ہدف افغان سنٹرل بینک تھا جو کہ ملک کے مالیاتی قواعد تشکیل دیتا ہے۔

MashalBooks.org